اپنے اللہ سے باتیں

(ازواحدی)

یا اللہ! انسان کی طینت تونے قرآن پاک میں یہ بیان کی ہے کہ جب تو انسان کو عزت بخش کر اور نعمت دے کر آزماتا ہے تو انسان کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے بڑا بنادیا۔ یعنی ایک قسم کی اترا ہٹ انسان میں پیدا ہو جاتی ہے اور انسان ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ اللہ کے اور اس کے درمیان کچھ خصوصیت ہے۔

اے اللہ! میں اس اترا ہٹ سے بچنے کا متمنی ہوں۔ اور تجھ سے دعا مانگتا ہوں کہ مجھ کمزور بندہ کو اس اترا ہٹ سے محفوظ رکھ۔ اور اے اللہ تونے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب انسان کو تنگی ترشی میں مبتلا کیا جاتا ہے تو انسان اسے اپنی توہین متصور کرتا ہے۔ تیرے کسی عمل اور تیرے کسی فیصلہ کو میں اپنی توہین سمجھوں۔ اے اللہ اس جذبہ سے بھی میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔

الٰہی! مجھے وہ بصیرت دے جس سے میں تجھے اور اپنے آپ کو پہچانوں۔ تجھ سی جو مجھے نسبت ہے وہ جانوں۔ کیا تیرے مقابلہ میں موری کے کیڑے سے میں کچھ زیادہ ہوں۔ یہ تیرا کرم تھا کہ تونے موری کا کیڑا بنانے کی بجائے مجھے انسان بنادیا۔

موری کا کیڑا تجھ سے کسی بات کی شکایت نہ کرے اور میں شکایت کروں۔ یا اللہ مجھ سے کبھی ایسی غلطی نہ ہونے دیجیو۔

یہ خیال کرنا کہ اللہ نے میری توہین کی ہے اس سے بھی برا ہے کہ انسان اترائے کہ اللہ اس سے خصوصیت برتتا ہے۔

ایک شیر خوار بچہ کو اپنے ماں باپ کی نسبت یہ خیال کرنے کا شاید حق ہو کہ ماں باپ نے مجھے دائیں کروٹ لٹا کر میری توہین کر دی ہے۔ لیکن کسی مخلوق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی بات پر اپنے خالق کے متعلق کہے کہ خالق میری توہین کر رہا ہے۔

یا اللہ! میں جبتک زندہ رہوں تیرا شکر گزار بن کر زندہ رہوں اور جب مروں تو تیرا شکر گزار مروں۔

یا اللہ میرا دل اور دماغ تیرے ہی قبضہ میں ہے میں اپنے تمام اعضائے جسمانی سے زیادہ دل اور دماغ کی صحت کا طالب ہوں۔ میرے دل اور دماغ ہمیشہ تیری مرضی کے مطابق کام کریں۔ اور تیری شان اور اپنی حیثیت کو کسی لمحہ نہ بھولیں۔

تیری عنایتیں اور رحمتیں مجھ پر کیا کچھ نہیں ہیں جن کا تصور کرتا ہوں۔ اس کے مقابلہ میں راحتیں بے شمار پاتا ہوں۔ ہزاروں راحتیں ایسی ہیں جنھیں تونے مجھ سے ایک دفعہ بھی دور نہیں کیا۔ اور ہزاروں تکلیفیں ایسی ہیں جن سے مجھے کبھی سابقہ نہ پڑنے دیا۔

جو راحت کبھی عارضی طور پر چھینی ہے تو اسی لئے کہ جس راحت کا احساس نہ تھا اس کا احساس ہو جائے اور جو تکلیف کبھی پہنچی ہے تو اسی واسطے کہ تکلیف و راحت کا فرق معلوم رہے۔ انسان راحت ہی راحت میں ساری عمر گذارنے لگے تو راحتیں مصیبت بن جائیں۔ آسانیاں زندگی کو دشوار کر دیتی ہیں۔

آنسو

(ازواحدی)

جس طرح انسان کے اندرونی جذبات چہرے کے تغیر سے پہچانے جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض کیفیات آنسوؤں سے بھی ہویدا ہوتی ہیں لیکن آنسوؤں سے کسی حالت کا اندازہ کرنا چہرے کے مقابلہ میں مشکل ہے۔ کیونکہ رنج وخوشی۔ تکلیف وراحت کی حالت میں بشرے پر ایسی غمگینی وشادابی اداسی اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے کہ معمولی سی سمجھ کا آدمی بھی معلوم کر لیتا ہے کہ یہ شخص کس حال میں ہے۔ بخلاف آنسوؤں کے کہ وہ غم اور خوشی خوف واطمینان سب میں یکساں صورت سے پیدا ہوتے ہیں۔

تم نے اس آنسوؤں سے لبریز آنکھ کو دیکھا۔ جاری کھاری دریا کے بوجھ سے تھرتھرا رہی ہے۔ پانی کسی غیبی چشمے سے ابل ابل کر حوض بینائی پر آبی چادر بنا ہوا چھا رہا ہے۔ پلکوں کی جڑیں بھیگ جائیں گی تو آنسوؤں کا دریا رخسار پر بہنے کے لئے راستہ نکال لیگا لیکن یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ چشم پرآب ہے کیوں کسی کے مرنے کے غم سے۔ فرق کی تکلیف سے۔ جابر کے جبر سے۔ خوف وہراس سے۔ بے بسی و بیچارگی سے۔ یا قطع امید سے۔ غرض کوئی ٹھیک بات نہیں معلوم ہو سکتی۔ اصل یہ ہے کہ آنسو بھی بشرے اور چہرے کا محتاج ہے۔ اگر آنسوؤں سے قلبی حالت کا پتہ چلانا مقصود ہو تو فوراً سارے چہرے پر نظر جمادو۔ وہاں لکھا ہوگا کہ آنکھ کیوں روتی ہے۔ موت کی غمگینی روتی ہوئی آنکھ کے نیچے رخساروں اور ہونٹوں پر ایک افسردگی سے پہچانی جاتی ہے۔ خوف کے وقت بشرہ اس قدر زرد اور بے قرار ہوتا ہے کہ آنسو پورے طور سے بہنے نہیں پاتا جو پونچھ لیا جاتا ہے۔ جدائی جو الفت کامل کے بعد نصیب ہو چہرے کے رخسار کو اداس اور زرد کر دیتی ہے۔ ہونٹ خشک نظر آتے ہیں۔ چہرے پر مستانہ بیخودی کا سماں ہوتا ہے۔ آنسو بہا کرتے ہیں اور آنکھ کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ دوست کے تصور میں محو ہوتی ہے۔ عاشق کی آنکھ ہمیشہ تروتازہ رہتی ہے۔ اور سب حالتوں میں تو چہرے اور بدن کے ساتھ آنکھ پر بھی اس تکلیف کا اثر پڑتا ہے اور وہ کمزور ہو جاتی ہے۔ مگر محبت کی آنکھ ہمیشہ قوی رہتی ہے۔ وہی خمار۔ وہی چمک۔ وہی دمک۔ کسی بات میں فرق نہیں آتا۔ محبت کی آنکھ میں ایک وصف اور ہے کہ دیکھنے والے کو بجائے تکلیف دینے کے ایک قسم کا لطف عطا کرتی ہے۔ شراب عشق سے مخمور آنکھیں جب آنسوؤں کے پانی سے غسل کر چکتی ہیں اس کے بعد ان کی تابناکیاں اسرار ربانی جھلکتے نظر آئیںگے بھیگی ہوئی پلکوں کی نوکیں طلسماتی انداز سے جنبش کر رہی ہوں گی۔ اور ہر جھپک جو آناً فاناً ختم ہو جاتی ہے عشق کی چنگاریاں اڑا رہی ہوگی۔ روتی ہوئی صورت تو بدشگونی میں داخل ہے۔ پر روتی ہوئی آنکھ بڑی قدر سے دیکھی جاتی ہے۔ کوئی شخص کیسا ہی سنگدل ہو کیسی ہی بے رحم کرنا اس کی عادت کے کتنا ہی خلاف ہو لیکن آنسو اس کے

از فصیح الدین احمد ایم۔اے

(۱) بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ "کسمت" کے بعد اس کمپنی کا دوسرا فلم "قسمت" جوبلی ٹاکیز دہلی میں نمائش کیلئے پیش کردیا گیا ہے۔ روزانہ چار شو ہو رہے ہیں۔ اور ہر شو میں ہال بھرا رہتا ہے۔ بلکہ بہت سے آدمی ٹکٹ نہ ملنے پر مایوس لوٹ جاتے ہیں۔ آمدنی کے اعتبار سے یہ فلم بہت زیادہ کامیاب ہوگا۔ اشوک کمار اور ممتاز شانتی نے اس فلم میں کام کیا ہے۔

(۲) فضلی برادر لمیٹڈ ڈائرکٹر حسنین نیشن بنانے میں مصروف ہیں۔ جس میں سردار اختر، اور چندر موہن نے کام کیا ہے۔ اپریل کے آخر میں سنا ہے کہ مسٹر ایس فضلی اپنے دوسرے فلم بھائی بہن کی شوٹنگ شروع کرنے والے ہیں۔

(۳) پنچولی آرٹ پکچرز خزانچی اور زمیندار جیسے فلم تیار کرنے والے ڈائرکٹر گدوانی اب ایک کوسٹیوم پکچر کی کاغذی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ جسکے لئے عظیم الشان ماحول۔ پرشکوہ مناظر۔ اور لباس فاخرہ منتخب کئے گئے ہیں۔ نیز اداکاروں کا انتخاب بھی ہو چکا ہے۔ اس فلم کا نام پتا ہے راجپوتی خاندان کی روایات کا خاکہ ہوگی۔ انکا دوسرا فلم پنچایت ہے جو گورنمنٹ پنجاب کیلئے تیار ہو رہی ہے۔ انکا تیسرا فلم شیریں فرہاد ہے جو پردھان پکچرز سٹوڈیو میں تیار ہو رہا ہے۔

ان کا فلم پونجی تیار ہے۔ نمائش کیلئے عنقریب دہلی آنیوالا ہے۔ فلم غیر معمولی طور پر دلچسپ اور دلکش ہے۔ مزاحیہ اداکاری قابل دید ہے۔

(۴) شری شنو سینے ٹون گذشتہ تین سال میں اس کمپنی کے تین فلم پیار چندن اور شاہی فقیر پیش کر چکی ہے۔ جو پبلک میں بہت مقبول ہو چکے ہیں۔ انکے نئے فلم کا نام خنجر والی ہے۔ جسے مسٹر اے، ایم خان نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ انکے دوسرے فلم کا نام مایا نگری ہے۔ جس میں جادو کے کرشمے اور نیم مذہبی پس منظر کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ اسکی موسیقی۔ سین جادو کے کرشمے۔ حیرت انگیز کہانی۔ آپ سے خراج تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس سال یہ فلم کمپنی اپنی چوتھی سالگرہ منا رہی ہے۔ ہم اسکو مبارکباد دیتے ہیں کہ یہ عوام کے مذاق کے مطابق بہترین تصاویر پیش کرتی رہی ہے۔

شاہی فقیر کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے گیارہ ہزار فٹ فلم کی پابندی سے وشنو سینے ٹون کو مستثنے قرار دیدیا ہے۔ اس لئے شاہی فقیر" کی چودہ ہزار فٹ لمبائی ہوگی۔ یہ عجوبہ روزگار تصویر دہلی اور یو۔پی کے تین شہروں میں چار ہزار روپے کی منعم گارنٹی پر بک کی گئی ہے۔ اب تک کوئی جادو کی تصویر اتنی منعم گارنٹی پر بک نہیں کی گئی۔

(۵) شالیمار پکچرز ایک رات کے بعد اب یہ فلم کمپنی من کی جیت پریم سنگیت اور اندھیر نگری کا شوٹنگ کر رہی ہے۔ پہلے دونوں فلم میں **نینا** ہیروئن کا کردار ادا کر رہی ہے۔

(۶) جاگیرتی پکچرز کا فلم "بدلہ" اور "بلیک آؤٹ" تیار ہو چکے ہیں۔ "بدلہ" میں محبت کی افسانویت کے علاوہ مذاق کا بھی کافی حصہ موجود ہے۔

اس میں شستری۔ بابوراؤ۔ بیبی۔ نذیر وغیرہ نے کام کیا ہے۔

"بلیک آؤٹ" میں سردار منصور۔ شوبھا۔ مہدی وغیرہ کام کر رہے ہیں۔

(۷) نیشنل سٹوڈیوز انکا مشہور فلم جوانی دہلی کے میجسٹک سینما میں دکھایا جا رہا ہے جس میں حسن بانو اور مسٹر بیدر نے کام کیا ہے۔ اس فلم کی کہانی کافی دلچسپ ہے۔ اگرچہ اسکو پیش کرنیکا طریقہ کچھ زیادہ موثر نہیں معلوم ہوتا۔ فلم میں بہترین اداکاری عبدالرحمن کابلی کی ہے۔ یہ ایک ۶۵ سالہ بوڑھے کا پارٹ ادا کر رہے ہیں جسکو چالیس سال تک انکے خاندانی ڈاکٹر نے شادی کرنے سے باز رکھا ۶۵ سال کی عمر میں پوتی کی عمر کی لڑکی سے شادی کرنے کھڑے ہوئے ہیں۔ جو انکے چونا لگا کر اپنے نوجوان محبوب سے شادی کر لیتی ہے۔ غرض بڑھاپے اور جوانی کا مقابلہ خوب دکھایا ہے جس میں جوانی کا نیا اور بڑھاپا لیسورتا ہوا نظر آتا ہے۔

(۸) رنجیت موویٹون انکے متعدد فلم **گوری۔ اندھیرا۔ تان سین۔ بنسری۔ کالیداس۔ ممتا** وغیرہ تیار ہو رہے ہیں۔

بمبئی سینے ٹون

محبت کی دنیا میں جب "سویرا" ہوتا ہے تو ہر چیز سہانی اور سُریلی معلوم ہوتی ہے۔ اس فلم میں شوبھنا سمرتھ۔ اردن۔ یعقوب۔ نرملا۔ وغیرہ کام کر رہے ہیں۔ اس فلم کو ورِندرا دیسائی نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ جگت ٹاکیز دہلی میں ۳۰ر اپریل سے دکھایا جا رہا ہے ؎

مُرلی مووی ٹون

کا فلم قربانی ۳۰ر اپریل سے موتی ٹاکیز دہلی میں دکھایا جا رہا ہے جس میں درگا کھوٹے۔ ایس۔ ایل۔ [illegible] وسنتی۔ کوشلیا۔ گوپ۔ گلاب وغیرہ کام کر رہے ہیں۔ اس فلم کو رام بھیانی نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ "پیاس" کے بعد ان کا دوسرا نیا فلم ہے ؎

وادیا پیراماؤنٹ

کی فرم "ایک باپ اور بیٹے کی جذبات" پیش کر رہی ہے کہانی بیٹے کے خیالات میں ہمیشہ زمین آسمان کا فرق رہا ہے جس میں پرتھوی راج۔ کوشلیا۔ ترلوک کپور۔ گلاب۔ آغا نے کام کیا ہے۔ ۳۰ر اپریل سے منروا سنیما دہلی میں دکھایا جا رہا ہے ؎

(۱۳) یونائیٹڈ فلمز

ان کی پہلی تصویر "رنگیلی زندگی" ہے جس کے مکالمے اور گیت حضرت آرزو لکھنوی نے لکھے ہیں تیار ہو رہی ہے۔ اس میں شیخ مختار اور انیس خاتون نے کام کیا ہے ؎

(۱۴) چترا پروڈکشنز

کا فلم پرتگیہ تیار ہو چکا ہے جس میں موتی لال اور سورن لتا نے کام کیا ہے ؎

(۱۵) اسٹار پروڈکشن

مس رتن بائی نے جو ایک فلم کمپنی تیار کی ہے اس میں انہوں نے پہلا فلم سہیلی تیار کیا ہے اب یہ دوسرا فلم داسی تیار کر رہی ہے جس میں خود انہوں نے اور سلوچنا نے کام کیا ہے ؎

(۱۶) موہن پکچرز

رنک پروڈکشنز کے ساتھ یہ فلم کمپنی ایک فلم ریکھا تیار کر رہی ہے جس میں لیلا چٹنس اور ہریش نے کام کیا ہے۔ خیال ہے کہ یہ فلم اگلے مہینہ تک تیار ہو جائیگا اسکے بعد دو تین اور سوشل فلم تیار کرینگے جن میں اشوک کمار اور لیلا چٹنس نے کام کیا ہے۔ اور تیسرے میں جسکا نام "کون ہے" لیٹو دھر اکانجو اور ساہو مودک [illegible]، اس فلم کا نام دُلہن ہے ؎

(۱۷) سن رائز پکچرز

پروڈیوسر شنو کمار ویاس بہت تیزی سے فلم تیار کرتے ہیں۔ انکی کئی تصویریں بیک وقت تیار ہو رہی ہیں۔ جنکے نام یہ ہیں۔ دہائی۔ غالب۔ نوکر اور نرگس۔ نورجہاں۔ شانتا آپٹے شوبھنا سمرتھ۔ چندر موہن یعقوب وغیرہ نے کام کیا ہے ؎

[illegible] پکچرز

[illegible] کے بعد [illegible] کام کر چکی ہیں [illegible] انکا پہلا فلم ہے جس میں ستارہ۔ [illegible] یعقوب وغیرہ نے کام کیا ہے۔ فلم میں یو۔پی کے نوابوں کی شاندار زندگی کا خاکہ کھینچا گیا ہے ؎

(۱۹) امر پکچرز

انکی پہلی تصویر پیغام تیار ہو چکی ہے جس میں سادھنا بوس اور سریندر نے کام کیا ہے۔ انکی دو اور تصویریں آواز؟ [illegible] غرض اور برادری تیار ہو رہی ہیں ؎

(۲۰) مراری پکچرز

کا فلم بدلتی دنیا بھی تیار ہو رہا ہے۔ اس میں ممتاز شانتی شہزادی۔ مدا جکماری۔ ششی کلا۔ ترلوک کپور۔ کے۔ [illegible] وغیرہ نے کام کیا ہے اور موہن سنہا نے اس فلم کو ڈائرکٹ کیا ہے ؎

(۲۱) کیرتی پکچرز

کا فلم برات تیار ہے جس میں شوبھنا سمرتھ۔ کوشلیا۔ [illegible] شوبھا دیوی۔ رام پیاری۔ مرزا مشرف وغیرہ نے کام کیا ہے۔ انکا دوسرا فلم اشیر باد ہے جس میں للتا پوار۔ وتسلا کمٹیکر۔ ترلوک۔ رام [illegible] وغیرہ نے کام کیا ہے۔ انکا تیسرا فلم محبت ہے جسے ڈائرکٹر شوکت حسین نے تیار کیا ہے۔ اس میں ممتاز شانتی کام کر رہی ہیں ؎

(۲۲) شوری پکچرز

کا فلم تشانی تین چار مقامات پر دکھایا [illegible] بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ بیحد دلچسپ اور مذاقیہ ہے جس میں مجنوں قہقہوں کا بادشاہ اور راگنی حسن کی دیوی کام کر رہے ہیں۔ یہ فلم یہاں بھی جلد آنے والا ہے ؎

(۲۳) نیو تھیٹرز لمیٹڈ

کا "کاشی ناتھ" نیو تھیٹرز کا بہترین اور تازہ فلم ہے جسے نتن بوس نے ڈائرکٹ کیا ہے اسکی کہانی بنگال کے مایۂ ناز ناولسٹ ڈاکٹر شرت چندر بوس کے ناول سے اخذ کی گئی ہے۔ اداکاروں میں [illegible] اسیت۔ سنندا۔ نواب اور نیمو کے نام قابل ذکر ہیں۔ پنکج ملک نے اس فلم کی موسیقی کو ڈائرکٹ کیا ہے۔ انکا دوسرا فلم میناکشی جس میں نجم الحسن اور سادھنا بوس نے کام کیا ہے۔ رٹز سنیما میں خوب زور سے چل رہا ہے ؎

ہند پکچرز

کا فلم "کلجگ" جس میں ستارہ۔ کمار۔ انور ادھا۔ نذیر۔ ازوری وغیرہ نے کام کیا ہے۔ یہ ایک سوشل کامیڈی ہے۔ جسے ڈائرکٹر نذیر نے ڈائرکٹ کیا ہے اس میں دل فریب رقص اور سحر آفریں موسیقی موجود ہے۔

دل کو موم کر دیتے ہیں۔ جب وہ آنسو بھری آنکھوں کو رحم کے لئے التجا کرتے دیکھتا ہے پانی پانی ہو جاتا ہے۔

یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان لوگوں کی بات کا بڑا اثر پڑتا ہے جو آنسو آنکھوں میں لا سکتے ہیں۔ چنانچہ جو واعظ اپنے بیان کو آبدیدگی سے تر کرنے کے خوگر ہیں اُن کے کلام میں معلوم ہے۔ اُن کی آنکھیں پُر آب ہوئیں اور سامعین ماہی بے آب بنے۔

مصنوعی آنسو میں بھی اثر ہوتا ہے۔ تماشہ گاہوں میں تماشہ کرنے والا مصنوعی تار دیکھا کرتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ بناوٹی دکھاوے کی باتیں ہیں۔ ایک فرد بشر بھی یقین نہیں کرتا کہ یہ اصلی روتا ہے۔ مگر اثر کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ہر شخص کو سکتہ ہو جاتا ہے بلکہ بعض نرم طبیعت کے آدمی تو خود رونے لگتے ہیں جب نقل میں یہ تاثیر ہے تو اصل میں خبر نہیں کیا عالم ہوگا۔ یورپ والے رونے کو مردانگی کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس لئے اُن کے ہاں آنسو آنکھ سے نکالنا خلاف فیشن تصور کیا جاتا ہے۔ مگر اہل ایشیا رحمدلی کے آنسوؤں کو جوانمردی میں گنتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ انسان، انسان نہیں جس کا دل دردآشنا اور آنکھ آنسو بار نہ ہو۔ ایشیا کے ہر مذہب میں "چشم تر" کی تعریف کی گئی ہے۔ آنسو دردمندی کا کام کیا نشان ہے جس کی آنکھ اس سے خالی ہے وہ کیونکر ہمدردی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یورپ کی خودغرضی و مطلب آشنائی کے صدہا واقعات ہیں۔

لیکن یہ واقعہ سب سے زیادہ اہم ہے کہ وہاں کے باشندے رونے کی لذت سے محروم ہیں۔ اس دعوے کی دلیلیں ایک نہیں ہزاروں ایشیا کی تاریخ میں موجود ہیں کہ رونے والے اور آنسو بہانے والے کیسے بہادر اور دلیر ہوتے تھے۔ دشمن کے مقابلہ میں ان کی ثابت قدمی اور مردانہ شجاعت یورپ والوں سے اکہ درجہ بڑھ کر تھی۔ پس اس خیال کی کچھ وقعت نہ کرنی چاہئے کہ آنسو مردی کی شان کو بٹہ لگاتے ہیں۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ خشک چشمی مردانگی کو بدنما بنا دیتی ہے۔

آنسو دنیا کے ہر کام میں مدد دیتا ہے۔ بڑی بڑی مشکلیں دو آنسوؤں سے حل ہو جاتی ہیں۔ ظالموں کے قہر و غضب کی آگ آنسو کی دو بوندیں بجھا دیتی ہیں۔ جس کی آنکھ سے آنسو نکلتے رہتے ہیں اُس کا دل نفسانی کدورتوں سے پاک صاف رہتا ہے۔ آنسو نکلتے وقت وہ لذت اور پُراسرار محویت انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ جس پر یورپ کے تمام مال و منال قربان ہیں جس کے سامنے موجودہ تمدن کے عیش و عشرت ہیچ ہیں۔ اسی واسطے مسلمانوں کے فرقہ شیعہ نے آنسو کی مدح و تعریف میں دفتر کے دفتر لکھ دئے ہیں۔ اور اسی لئے صوفیوں میں بڑے بڑے نامور بزرگ جب دعا مانگتے ہیں تو آب دیدہ کی ضرور درخواست کرتے ہیں تہجد کا سہانا وقت جب کہ ہر چیز پر ایک خوشگوار خاموشی کا عالم ہوتا ہے اور خلاقی شان کے دریا لہریں مارتے ہیں آنسوؤں کی بہار کا موسم ہے بہار میں ہوا کی تاثیر ہر چیز میں شگفتگی پیدا کر دیتی ہے اسی طرح تہجد کا وقت بیدار رہنے والی آنکھوں میں آنسوؤں کی بہار کا موسم نمایاں کرتا ہے۔

یہ موسم ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہی اس کا لطف اٹھاتے ہیں جو رات کے پچھلے حصہ میں سونا ترک کر دیتے ہیں۔ جو اس مبارک وقت کو اپنے رب کی عبادت میں بسر کرنے کے خوگر ہیں۔ جن کے چہرے دن کے وقت غیبی نورانیت کے سبب الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی درخواست خدا کے دربار میں مقبول ہے۔ جو تجلیات راز کے ہر شب دیدار کرتے ہیں۔ انہیں کے آنسوؤں سے تمام دنیا میں آرام و راحت کا وجود قایم ہے ورنہ الحاد و دہریت نے تو انسان کو اضطراب و بے اطمینانی کے سمندر میں غرق کر دینے کا سامان کر لیا ہے۔ اے وقت سحر کے آنسو بہانے والے بزرگو! وہ آنسو ان غافل انسانوں پر بہاؤ، جو بےخبری کی نیند میں پڑے سوتے ہیں۔ شاید وہ بیدار ہو کر اس راحت سے حصہ پا سکیں۔ اور اے نورانی دل میں رہنے والے جذبے تو جلدی بھڑک اور آنسوؤں کی شکل میں نمودار ہو کر ہماری پستی کو عروج سے تبدیل کر دے۔

خداوندا تو واقف ہے کہ اب ہم میں ذوق و شوق کے آنسو ناپید ہیں۔ ہماری تقدیر پلٹ گئی۔ اب ہمیں لاوارث یتیموں کے آنسو۔ بے ٹھکانا بیواؤں کے آنسو۔ تین تین دن کے فاقہ کشوں کے آنسو۔ مقروضیت کی پریشانی کے آنسو۔ کس مپرسی کے آنسوؤں کے سوا اور کوئی مزیدار آنسو نصیب نہیں۔

دہاتی لڑکی اور شہری سیاح

(از جناب الطاف مشہدی)

(ایک دہاتی لڑکی کی التجا اپنے شہری محبوب کے حضور میں، جو اسے چھوڑ کر اپنے وطن کو جا رہا ہے)

مری کھلی ہوئی باہوں پہ رحم میرے حبیب
دبی دبی ہوئی آہوں پہ رحم میرے حبیب
مری اداس نگاہوں پہ رحم میرے حبیب
غموں سے مجھ کو بچاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

میں رو رہی ہوں سرِ راہ کوئی دیکھ نہ لے
اک اجنبی کے لئے آہ، کوئی دیکھ نہ لے
ذرا سی عمر میں یہ چاہ، کوئی دیکھ نہ لے
مجھے نہ اتنا ستاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

مرا فسانۂ غم عام کر کے جاتے ہو
ستم نصیب کو بدنام کر کے جاتے ہو
غضب کہ واقفِ آلام کر کے جاتے ہو
گری ہوئی کو اٹھاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

مرا خیال تھا تم میرے ہو رہو گے کبھی
کوئی نہ جس کا بنا اس کے بن سکو گے کبھی
میں صرف تیرا ہوں چپکے سے یوں کہو گے کبھی
بچا سکو تو بچاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

مرے شباب سے اب زندگی نہ جھانکے گی
ستم نصیب کے لب سے ہنسی نہ جھانکے گی
نظر سے پھول کے بھی دلکشی نہ جھانکے گی
جگر کی آگ بجھاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

تمھارے بعد یہاں بدلیاں نہ چھائیں گی
ہوائیں مست ترانے نہ گنگنائیں گی
ہمارے گاؤں کی گلیاں نہ گیت گائیں گی
نہ بیقرار بناؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

میں سوچتی ہوں مری زندگی کا کیا ہوگا
تمھیں بتاؤ مجھے کس کا آسرا ہوگا
میں بے نوا ہوں مرا کون ہمنوا ہوگا
کوئی تو بات بتاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

تمھارے ہجر میں میں ہی نہ تلملاؤں گی
کئی جوانیوں کو بیقرار پاؤں گی
حسین دلوں میں غموں کے دیئے جلاؤں گی
قیامتیں نہ اٹھاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

تمھارے دیس میں یوں ہی نباہ ہوتا ہے؟
ہر ایک دن وہاں وقفِ نگاہ ہوتا ہے؟
کرے جو تم سے محبت تباہ ہوتا ہے؟
تباہیوں سے بچاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

تمھاری طرح سبھی ہیں جفا شعار وہاں؟
ہوس کا خوب چمکتا ہے کاروبار وہاں؟
لباس پہنے ہوئے ہیں گلوں کا خار وہاں؟
نظر نظر سے ملاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

سماج گھور رہا ہے مری جوانی کو
عطا کرے گا کوئی روگ زندگانی کو
فروغ دے گا مرے عشق کی کہانی کو
کہانیاں نہ سناؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

سنا ہے شہر میں بکتے ہیں گنگناتے شباب
خرید کرتے ہیں سکوں میں انکھڑیوں کی شراب
حسین چہرے، جواں جسم، جھلملاتے نقاب
یہ زندگی نہ سکھاؤ میں بے سہارا ہوں
مجھے نہ چھوڑ کے جاؤ میں بے سہارا ہوں

شہنشاہ اکبر کی رواداری

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب)

شہنشاہ ہمایوں شیر شاہ افغان سے شکست کھا کر ایران گیا اور شاہ ایران کا مہمان ہوا تو ایک دن دربار میں شاہ ایران کے برابر شاہی مسند پر بیٹھا تھا۔ مسند چھوٹی تھی۔ ہمایوں کا ایک گھٹنا مسند سے ذرا باہر نکلا ہوا تھا سامنے درباری ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اُن ہی میں ہمایوں کا سپہ سالار بیرم خاں بھی کھڑا تھا۔

بیرم خاں نے دیکھا کہ اس کے آقا ہمایوں کا ایک گھٹنا مسند سے باہر ہے۔ اس بات کی برداشت نہ کر سکا۔ خنجر کمر سے نکال اپنا زریں پٹکا کاٹا اور آقا کے گھٹنے کے نیچے بچھا دیا۔ شاہ ایران کو یہ ادا بہت پسند آئی اور اس نے ہمایوں سے پوچھا۔

بھائی ہمایوں جب تمہارے پاس بیرم جیسے وفادار اور آقا پرست نوکر موجود تھے پھر شکست کیوں ہوئی؟ ہمایوں نے جواب دیا۔ میرے بھائیوں نے رفاقت نہ کی بلکہ مخالفت پر آمادہ رہے۔

شاہ ایران نے پوچھا تو کیا رعایا نے بھی ساتھ نہ دیا؟ جواب: زیادہ سب ہندو ہیں۔ ہم میں اُن میں مذہب کا اختلاف ہے۔ خیالات اور عادتوں کا فرق ہے۔ اس لئے کوئی مدد اِن سے نہ مل سکی۔

شاہ ایران نے کہا۔ اب کے ہندوستان قبضہ میں آئے تو رعایا کو اپنا بنانے کی کوشش کرنا۔ اس کے بعد کھانا آیا۔ دسترخوان بچھایا گیا۔ شاہ ایران کا بھائی کمر باندھ کر ہاتھ میں آفتابہ۔ سلاپچی لے کر کھڑا ہوا، اور اپنے بھائی کے اور ہمایوں کے ہاتھ دھلائے۔

شاہ ایران نے کہا۔ دیکھو بھائی ہمایوں بادشاہوں کے بھائی ایسے اطاعت گزار اور فرماں بردار ہوتے ہیں۔

ہمایوں نے یہ دونوں باتیں خیال میں رکھیں اور جب ایران کی مدد لیکر ہندوستان میں آیا تو اکبر کو دونوں باتیں سمجھائیں اور کہا:—

"ہندوؤں سے میل جول بڑھانا۔ اور ان کو اپنا بنانے کی کوشش کرنا۔ یہ ایرانی تورانی اپنی قوم ہیں مگر ہندوستان میں پردیسی ہیں۔ ایران توران کے خیال میں رہتے ہیں۔ اور ہندوستانی باہر کے کسی ملک سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ اپنے ہو جائیں تو ہندوستان ہمیشہ اپنا رہیگا۔"

ہمایوں نے اکبر سے یہ بھی کہا کہ مذہب کا تعلق انسان کے دل اور خدا سے ہوتا ہے۔ قرآن میں بھی خدا نے فرمایا ہے "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" تمہارا دین تمہارے لئے میرا دین میرے لئے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ دین کے معاملہ میں کسی پر جبر اور زبردستی نہ کرنی چاہئے۔ پس ہم کو بھی ہندوستان والوں کے مذہب سے رواداری کرنی چاہئے اور اپنے دین پر قایم رہ کر دوسروں کے دین سے کسی قسم کی پرخاش نہ کرنی چاہئے۔

اکبر اس وقت دس سال کا بچہ تھا مگر تیمور اور بابر جیسے عقلمند بادشاہوں کی اولاد تھا۔ اس نے باپ کی بات کو غور سے سنا اور دل میں جگہ دی۔

جب ہمایوں دہلی کے پرانے قلعہ میں ایک کوٹھے پر سے گر کر مر گیا تو اکبر اس وقت پنجاب میں افغانوں سے لڑ رہا تھا۔ وہیں تخت نشین ہوا۔ یکا یک ہیموں بقال افغانوں کی فوجیں لے کر پورب سے چڑھ دوڑا۔ پہلے آگرہ لیا۔ پھر دلی بھی لے لی۔ اور تخت پر بیٹھ کر اپنا نام راجہ بکرماجیت رکھا۔ اور دم لئے بغیر فوراً پنجاب کی طرف بڑھا کہ اکبر اور بیرم کو دلی کی طرف رخ کرنے کی جرأت ہی نہ ہو سکے۔

آخر پانی پت کے میدان میں ہیموں کو شکست ہوئی اور وہ مغلوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اکبر دلی میں آیا اور دلی سے آگرہ پہنچا۔ اور چاروں طرف مغل فوجوں کو افغانوں کے دبانے کے لئے بھیجنے لگا۔ جو ہندوستان کے باہر ہر صوبہ میں گھٹا کی طرح چھائے ہوئے تھے۔

نارنول میں ایک مغل سردار افغانوں کے نرغے میں پھنس گیا تو آمیر کے راجہ بھارا مل نے مغل سردار کو سہارا دیا اور افغانوں سے صلح کرا دی۔ اور مغل سردار کو حفاظت کے ساتھ آگرے بھجوا دیا۔

مغل سردار نے اکبر سے راجہ کی بہت تعریف کی۔ اکبر کو تو باپ کی نصیحت یاد تھی۔ فوراً راجہ کے نام فرمان گیا کہ ہم سے ملنے آؤ۔ راجہ اپنے بیٹے بھگوانداس اور پوتے مان سنگھ وغیرہ کے ساتھ آگرے میں آیا۔ اکبر نے بہت شاندار مدارات کی اور ہاتھی گھوڑے انعام دئے۔

جب راجہ کو خلعت تقسیم ہو رہے تھے تو اکبر خود ہاتھی پر بیٹھ کر تماشا دیکھنے محل سے باہر آیا۔ اور راجہ کو مخاطب کر کے کہا۔ من ترا نہال خواہم کرد

میں تجھکو نہال کردوں گا تو اپنے خاندان کو لیکر میرے پاس چلا آ۔

مگر راجہ پرانا تجربہ کار تھا۔ اپنی ریاست میں جاکر بیٹھ رہا۔ اکبر کے پاس نہ آیا۔ ڈرا ہوگا کہ مغلوں کا کیا اعتبار آج دوست ہیں کل بگڑ جائے گی تو رہی سہی عزت بھی برباد ہو جائے گی۔

چند مہینے کے بعد اکبر کے ایک رشتہ دار نے راجپوتانے کو فتح کرنا شروع کیا اور راجہ بھاڑا مل کا ملک بھی چھین لیا۔ اور راجہ کو بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ اکبر کو اس کی خبر نہ ہوئی کہ شرف الدین حسین مرزا نے یہ بدسلوکی راجہ بھاڑا مل کے ساتھ کی ہے۔

کچھ عرصہ بعد اکبر اجمیر شریف کی درگاہ میں زیارت کے لئے گیا تو اس نے یہ خبر سنی کہ راجہ کے ساتھ حسین میرزا نے یہ بدسلوکی کرکے میرے دامن کو داغ لگایا ہے اس لئے اس نے چند امیر بھیجے اور راجہ کو اپنے پاس بلایا اور اس کا ملک اس کو واپس دلوایا۔ اور اپنے ساتھ آگرے لایا۔ اور راجہ بھاڑا مل سے رشتہ داری کرنا چاہی جس کو راجہ نے بخوشی قبول کر لیا اور راجہ کی بیٹی سے اکبر کی شادی ہوگئی اور راجہ کا پوتا مان سنگھ اکبر کے دربار میں بہت مقرب امیر بنا دیا گیا۔

رواداری کی پہلی مثال

راجہ بھاڑا مل نے رشتہ کرنے میں پہل کی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی اور بھی راجاؤں نے اکبر سے رشتہ داریاں کر لیں۔

یہ رشتہ داری ہندوؤں میں کس نظر سے دیکھی گئی اس کو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ عوام ہندو اس کے خلاف ہوں گے۔ مگر ہندو حکومتوں میں سوائے رانا اودے پور کے اور کسی نے مخالفت نہیں کی۔ اور رانا کی مخالفت بھی اس بنا پر تھی کہ وہ ہندوستان کے عوام ہندوؤں کو اپنا بنانا چاہتا تھا۔ مگر ہندوؤں سے زیادہ مسلمان امیر اس رشتہ داری کے خلاف تھے۔ ایرانی بھی۔ تورانی بھی۔ ترک بھی۔ افغان بھی۔ سب کے سب اس کو حکومت کے لئے اور اسلامی نسلوں کے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔ چنانچہ مصاحبوں نے صاف صاف کہنا شروع کیا کہ حضور نے بہت بری مثال قایم کی ہے۔ مگر اکبر باوجود کم عمری کے ہر مسلمان کی مخالفت کو اس کان سنتا تھا۔ اس کان اڑا دیتا تھا۔ مگر ہندو عوام کی مخالفت کی خبروں پر ہر وقت متوجہ رہتا تھا۔ آخر اس نے حکم دیا کہ راجہ بھگوانداس کو ہم اپنے زنانہ محلوں کا محافظ مقرر کرتے ہیں۔ یہ حکم سنتے ہی مسلمان اُمرا بگڑ بیٹھے اور انھوں نے بادشاہ سے کہا۔ ہمارے شاہی خاندان کی اس سے بڑھ کر کوئی بے عزتی نہیں ہو سکتی کہ بادشاہ کی ماں اور بادشاہ کی بہنوں اور بادشاہ کی بیگمات کی حفاظت ایک ہندو کے سپرد کر دی گئی ہے۔

اکبر نے جواب دیا۔ اگر میرا دین اجازت دیتا تو میں اپنی لڑکیاں ہندوؤں کو دیتا۔ کیونکہ اُنھوں نے اپنی ہندو لڑکیاں ایک مسلمان بادشاہ کو دی ہیں اس لئے میں نے ہندو کو اپنے حرم کا محافظ بنا کر مسلمانوں کی گردن سے ہندوؤں کے احسان کا بوجھ اتارا ہے۔

دوسری مثال

جب اکبر کے بھائی حکیم میرزا نے بغاوت کی اور کابل سے فوج لے کر ہندوستان پر چڑھ آیا تو اکبر نے اس مہم کی سپہ سالاری راجہ مان سنگھ کو دی۔ اس سے ایرانی۔ تورانی امیر پھر بگڑے۔ مگر اکبر اپنی رائے پر قایم رہا۔ یہاں تک کہ حکیم میرزا کی بغاوت ختم ہو جانے کے بعد افغانستان کی گورنری بھی راجہ مان سنگھ کو دیدی۔

تیسری مثال

اکبر شروع میں کئی سال تک بہت زیادہ نمازی تھا۔ مسجد میں خود اذان دیتا تھا۔ جھاڑو دیتا تھا۔ اور مذہبی محکمے کے افسر مُلا عبدالنبی کی جوتیاں سیدھی کیا کرتا تھا۔ مگر جب مُلا عبدالنبی نے متھرا کے ایک برہمن کو اس جرم میں مار ڈالا کہ برہمن نے مسجد کے بچے ہوئے اینٹ چونے سے ایک مندر بنا لیا تھا۔ اور بازپرس کے وقت اسلام کے خلاف کچھ گستاخانہ باتیں کہی تھیں۔ تو اکبر نے مُلا عبدالنبی جیسے بڑے مولوی کو قتل کرا دیا۔ حالانکہ مُلا عبدالنبی تمام ہندوستان کے اسلامی محکمے کے صدرالصدور تھے۔ اور دربار کے سب امرا مُلا سے ڈرتے تھے اور اکبر خود اُن کی جوتیاں سیدھی کیا کرتا تھا۔ مگر اسلامی انصاف کے تقاضے سے اس نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور جس طرح مُلا نے برہمن کو گلا گھونٹ کر قتل کیا تھا۔ اکبر نے بھی ابوالفضل کو حکم دیا کہ مُلا کو اسی جگہ جہاں برہمن قتل ہوا تھا گلا گھونٹ کر مار ڈالو۔ چنانچہ اس کی تعمیل کر دی گئی۔

اکبر پر یہ الزام غلط ہے کہ وہ مسلمان نہ رہا تھا۔ کیونکہ اکبر نے مرتے دم تک اسلامی اصول کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ ڈاڑھی منڈانا۔ ماں کے مرنے پر بھدرہ کرانا وغیرہ کام اصول اسلام سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ جس طرح ہندو درویشوں کی عزت کرتا تھا اس سے زیادہ مسلمان درویشوں

کو مانتا تھا۔ اور حضرت شیخ سلیم چشتی کا مرید بنگیا تھا اور ان کو اتنا دیتا تھا کہ جب حضرت شیخ کے جانشین حضرت شیخ ابراہیم چشتی سنے وفات پائی تو ۲۰ کروڑ روپے نقد اُن کے گھر سے نکلے تھے۔

مرتے وقت اکبر نے علما کو بلایا۔ اور ان سے کہا مجھے قرآن مجید سناؤ۔ اور میرے سامنے کلمہ پڑھو۔ اور اس کے بعد سانس ختم ہونے تک برابر خود بھی کلمہ پڑھتا رہا جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ آخر تک مسلمان رہا اور اس کے مذکورہ کام محض رواداری اور سیاست کے لیئے تھے۔ اس کی رواداری کی مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ اگر سب کو قلم بند کیا جائے تو یہ مضمون ایک کتاب بن جائے۔ اس لئے میں نے صرف تین بڑی بڑی مثالیں لکھی ہیں۔

ردِ عمل جہانگیر بھی اپنے باپ اکبر کے قدم بقدم چلتا تھا۔ اور اکبر نے اس کی شادیاں بھی ملک کے ہر راجہ کے ہاں کی تھیں۔ مگر علماء اور امراء اور بیگمات ردِ عمل کے درپے تھیں۔ چنانچہ جہانگیر کی تخت نشینی کے دو سال بعد جب نور جہاں کا شوہر شیر افگن خاں مارا گیا اور نور جہاں قید ہو کر آگرے میں آئی تو اکبر کی ایک بیوی سلیمہ سلطان بیگم نے جو تیموری نسل کی تھی اور بہت ذی علم اور فہیم مانی جاتی تھی۔ نور جہاں کو اپنے پاس ٹھہرا لیا اور چار برس تک ایسی تعلیم و تربیت دیتی رہی کہ نور جہاں جہانگیر کی ملکہ بن سکے اور ہندو رانیوں کا اثر جہانگیر کے دل سے دور کر دے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ چار سال کی تربیت کے بعد خود سلیمہ سلطان نے جہانگیر کو مجبور کر کے اس کی شادی نور جہاں سے کرائی اور نور جہاں نے اپنی ایرانی ذہانت اور حسن صورت اور حسن سیرت اور سلیمہ سلطان بیگم کی تربیت کے اثر سے جہانگیر کے دل پر قبضہ کر لیا اور ہندو رانیوں کے عروج کا چراغ گل ہو گیا تاہم جہانگیر نے اکبر کی رواداری کی پالیسی پر پوری طرح مرتے دم تک عمل کیا۔

جہانگیر کے بعد شاہجہاں بھی اکبر کی رواداری پر عامل رہا۔ مگر اورنگ زیب نے کچھ اپنی طبیعت اور کچھ درباری امرا اور مولویوں کے دباؤ سے اور کچھ ہندوؤں کی حد سے زیادہ شوخیوں اور ملکی و فوجی طاقتوں پر غالب آجانے کی وجہ سے اکبر کی پالیسی میں ترمیم کرنی شروع کی۔

تاریخوں سے یہ الزام ثابت نہیں ہے کہ اورنگ زیب نے اکبر کی پالیسی ترک کر دی تھی۔ کیونکہ اورنگ زیب نے اکبر و جہانگیر و شاہجہاں سے زیادہ ہندو راجاؤں کو جاگیریں دی تھیں۔

انجام ہستی

از جناب کامل رشید

ذہنِ ناقص میں ابھی تک ہے ہماری یہ شام
جا رہا تھا ہو کے چوپائی سے جو ہو شاد بکام

عکس مہجور سے روشن تھی مری بزم دماغ
میرے والا تھا دھواں خورشید خاور کا چراغ

لاریوں کی گڑگڑاہٹ آگ پانی کا وقفہ
لہلہاتے پارکوں میں جابجا بچوں کا شور

مغربیت میں نہاں بے پردگی بے باکیاں
چمنیوں کا پیچ و خم کھاتا ہوا کالا دھواں

دے رہی تھیں سرخیاں چہروں کو فیشن کا پیام
جلوہ فرما تھا نگاہوں میں تمدن کا نظام

محو نظارہ تھا بے پردہ مگر کوئی شباب
تشنہ کاموں کیلئے بیتاب تھی نورِ سراب

اپنی ہستی سے خودی آگاہ تھی تہذیب کی
اڑ رہی تھی خاک ہر سو جادہ تخریب کی

مست جلوہ کا تقاضہ تھا نظر پیدا کرو
زندگانی کہہ رہی تھی سیم و زر پیدا کرو

جا رہا تھا گنگنا تا سر بسر مسرور تھا
آنکھ کے پردوں میں فردوسی سماں مستور تھا

اتنے میں ٹھہرا ٹھٹکا میں سانحہ یہ دیکھ کر
آ رہے تھے لوگ کچھ میت لئے اک دوش پر

رسم ایسی آج تک میں نے کبھی دیکھی نہ تھی
جسم پوشی تھی مگر میت کی روپوشی نہ تھی

تازہ پھولوں سے معطر ہر طرح نکھرے ہوئے
مشکبو گیسو تھے سلجھائے ہوئے سنورے ہوئے

چہرۂ بے نور پر اینٹھی ہوئی کچھ چینیاں
سرد پیشانی پہ کمھلائی ہوئی رنگینیاں

مانگ میں سیندور پیشانی پہ قشقہ کی جھلک
چھپی گردن میں اجل رخ پہ مصنوعی چمک

موت کا تھا نشہ سی سرشار آنکھوں کا خمار
تک رہی تھی حسرتوں کا منہ جوانی کی بہار

دیکھ کر یہ آنکھ کی بینائی غش کھانے لگی
کروٹیں لینے لگا دل روح تھرانے لگی

فکر تھی حیرت کو ہے یہ رونمائی کس لئے
ہے گوارا اس طرح دردِ جدائی کس لئے

آئی اک آواز میرے کان میں سن آخرین
راز تو نے آہ یہ سمجھا نہیں جانا نہیں

اس لئے عریاں ہے چہرہ جینے والے دیکھ لیں
سیم و زر کی گود میں نازوں کے پالے دیکھ لیں

دیکھ لیں وہ جن کو اپنی زندگی پر ناز ہے
دیکھ لیں مجھ کے دلیں جوش حرص آز ہے

دیکھ لیں وہ غور سے اہل دول اہل حشم
شیش محلوں میں لیا ہے جن کی ہستی نے جنم

چشم خود بیں سے وہ اپنی دیکھ لیں فرخندہ فال
کیا نتیجہ زندگی کا کیا ہے ہستی کا مآل

دیکھتے ہیں ورطۂ عشرت میں جو دلچسپ خواب
اُن سے کہہ دو زندگی ہے صورت موجِ سراب

ہاتھیوں کا شکاری

(ایک روسی افسانہ کا ترجمہ)

(از جناب مظہر ح۔ یوسف)

میں رسٹورانٹ میں ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ دفعۃً میرے پیچھے سے کسی نے اتنی لغویات کہی جو تصور میں بھی ممکن نہیں "جب میں امریکہ میں ہاتھی کا شکار کر رہا تھا"۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک نوعمر شخص اور اس کے مقابل دو خوبصورت عورتیں بیٹھی تھیں۔ یہ تینوں بری طرح شراب پی رہے تھے۔ دونوں عورتوں کے حسین چہروں پر حیرت مترشح تھی۔ ان کے منہ آدھے کھلے ہوئے تھے۔ نازک منہ اور پتلے پتلے ہونٹ۔

"مجھے یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ امریکہ کے ہاتھی خونخوار اور دہشت ناک ہونے کے سبب خاص طور پر مشہور ہیں۔ ....."

اس قدر سُن لینے کے بعد میں اپنے پرخلوص اور سچے دل پر جو میرے سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا قابو نہ رکھ سکا۔ میں اٹھ کر ان تینوں کی طرف گیا۔ ایک مہذب شخص کی طرح ان خواتین سے معذرت چاہی اور پھر اس شیخی خور، مکار شخص سے خطاب کیا "یہ سراسر جھوٹ ہے" میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں جما کر کہا۔

وہ اچھل پڑا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"جناب! اس سے آپ کو کیا واسطہ"

"یہ صحیح ہے کہ مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں تاہم آپ ان محترم خواتین کے سامنے غلط بیانی سے کام لے رہے تھے"۔

"یہ ہمیں سُنا رہے تھے" ان میں سے ایک نے اس کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔ ..... "یہ ہمیں اپنی بہادری کے کارنامے اور ان مہموں کے حالات سنا رہے تھے۔ جو انھوں نے امریکہ میں سر کی تھیں، جب یہ وہاں ہاتھی کا شکار کر رہے تھے"۔

"محترم خاتون۔ آپ کا مہموں میں اس قدر دلچسپی لینا میں پسند کرتا ہوں۔ مگر ..... حقیقت یہ ہے کہ امریکہ میں ہاتھی ہوتے ہی نہیں۔ ہاتھی صرف افریقہ اور ایشیا میں پائے جاتے ہیں"۔

"واقعی؟ پھر یہ ہمیں کس طرح بتا رہے تھے کہ انھوں نے امریکہ میں دو ہاتھی مارے"۔

"اب یہ تو بالکل صاف ہے۔ یہ بالکل جھوٹ بول رہے تھے"۔

"جناب" اس نوجوان نے ہمت کے ساتھ کہا جو مایوسی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ "آپ کو اس کا جواب دینا ہوگا"۔

"جب آپ چاہیں۔ مگر یہ نہ سمجھیے کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امریکہ میں ہاتھی پائے جاتے ہیں"۔

ان عورتوں میں سے ایک ہنسنے لگی۔

ان کا ساتھی غصہ سے کانپنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا جیسے نکلتے ہوئے سورج کا رنگ۔ "میرا خیال ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے"۔

"یقیناً! ڈوئل؟ جب آپ چاہیں ...... براہِ مہربانی اپنا ملاقاتی کارڈ دیتے جائیے"۔

اس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنا بٹوہ کھولا اور ایک کارڈ مجھے دیدیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو رسمی سلام کیا۔ اور میں وہاں سے چلا آیا۔

میں ہرگز بزدل نہیں ہوں مگر ...... مگر ڈوئل پھر ڈوئل ہے میں ان معاملات کو سنجیدگی سے دیکھا کرتا ہوں۔ اس لئے مجھے بہت سی اہم تیاریاں کرنی پڑیں جو ان حالات میں عموماً کرنی پڑتی ہیں۔ ساتھیوں کی تلاش۔ ایک ڈاکٹر۔ اعزا اور اقرباء کے نام خطوط کیونکہ ڈوئل میں حالت کا ناخوشگوار ہونا تعجب خیز نہیں ہوتا۔ غرض ایک شام کو میں یہ تمام کام ختم کر چکا تو جب میرے ساتھی میرے پاس لوٹے۔

"تمام باتیں طے ہو چکی ہیں" انھوں نے کہا "کل سات بجے جنگل میں شاہ بلوط کے درختوں کے پاس پستولوں سے"

"وہ ہچکچایا تو نہ تھا" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ برخلاف اس کے اسے کسی قدر خوشی ہوئی۔ اس نے ہماری پیش کی ہوئی تمام تجاویز خوشی سے منظور کر لیں۔

پونے سات بجے میں مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ دس منٹ کے بعد میرے مخالف کی گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ میرے ساتھی اس کے ساتھیوں کے پاس

گئے۔ اور زمین کو ناپ کر انہوں نے ہم دونوں کے ہاتھوں میں پستول دیدئے۔ جیسا کہ عام طور پر ایسے موقعہ پر ہوتا ہے میں نے اپنے مخالف کو اچھی طرح نہ دیکھا، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں اسے کوئی وقعت نہیں دیتا۔ اور شاید میرے مخالف نے بھی اسی وجہ سے مجھے نہ دیکھا ہو۔ ہم مقررہ مقامات پر کھڑے ہو گئے۔ میں نے پستول اُٹھایا اور نشانہ لینے لگا کہ اچانک .... پستول میرے ہاتھ سے گر گیا۔ میں حیرت کی وجہ سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔

"ٹھہرو" بالآخر میں نے کہا: کیا یہی وہ شخص ہے جس سے تم نے کل طے کیا تھا"

"یقیناً اور ہو ہی کون سکتا ہے" ہم نے آپ سے بتاتے ہوئے پتے پر بنا لیا۔ اسی شخص سے آپ کی تجاویز طے کی تھیں"

"مگر یہ شخص کسی قدر کالا ہے جس نے مجھ سے مقابلہ کے لئے کہا تھا وہ اس سے گورا تھا"

اسی قسم کی گفتگو دوسری طرف بھی جاری تھی۔

"اس کا کیا مطلب ہے" میرا مخالف چلا رہا تھا" پستول لئے ہوئے یہ شخص کون ہے۔ میں نے اسے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا"

"میرے ساتھی حیران تھے"

"معاف فرمائیگا۔ مگر کل آپ ہی سے ہم نے یہ معاملہ طے کیا تھا اور آپ نے تمام شرائط کو منظور کر لیا تھا"

"جی ہاں۔ میں نے منظور کر لیا تھا۔ کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ آپ اسی شخص کی طرف سے آئے تھے جس کو میں نے مقابلہ کی دعوت دی تھی۔ مگر مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔ یہ بجید مہذب اور شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں" پھر اس نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا: "مزاج شریف"

"آپ کا مزاج" میں نے کہا۔ ہم نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا: "معاف کیجئے گا۔ یہ کارڈ آپ ہی کا ہے؟

"جی ہاں یہ کارڈ میرا ہی ہے۔ اسے میں نے ایک سفید رو مکار ...... "

"ایک منٹ" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا جس کی داڑھی اور مونچھیں منڈی ہوئی ہیں اور جو بجید جھوٹ بولتا ہے"

"بالکل ٹھیک۔ وہی اس نے مجھ سے قسم کھا کر کہا تھا کہ اس کی شادی ایرن ہارڈ کے ساتھ ہوئی ہے اور یہ بھی کہ وہ حسد میں اپنی ٹانگ توڑ بیٹھی۔

مجھے بجید غصہ آیا اور میں نے اسے گلوبند سے پکڑ لیا"

"اور میں اس سے ہاتھیوں کے سلسلہ میں جھگڑ پڑا۔ وہ ڈینگ مار رہا تھا کہ امریکہ میں اُس نے ہاتھیوں کا شکار کیا .... جھوٹا کہیں کا"

ہم باتیں کرتے ہوئے شہر واپس آ گئے۔ اب ہم دونوں دوست ہو گئے تھے۔ ہم نے کھانا کھایا اور ساتھ ہی ٹہلنے نکل گئے۔

میرے دوست نے دفعتہً اپنا ہاتھ میری کلائی پر مارا۔

"وہ دیکھو!" "کیا"؟

"ایرن ہارڈ کے شوہر اور ہاتھیوں کے شکاری۔ ایک خاتون کے ساتھ"

ہم نے تھوڑی سے فاصلہ طے کر لیا اور ان کی باتیں سُننے لگے۔

"دیکھو! پیاری جہاں تک ڈوئل کا تعلق ہے میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ حالانکہ انسانوں کی زیادہ تعداد بزدل ہوتی ہے .... گذشتہ چند ہی دنوں میں میں دو آدمیوں کو چیلنج دے چکا ہوں اور دونوں میں سے ایک نے بھی اپنے ساتھیوں کو میرے پاس نہیں بھیجا۔ بلاشبہ دونوں ڈرپوک نکلے ہا۔ ہا۔ ہا۔ اور میں نے بیوقوف بن کر ان کا انتظار کیا۔ آخر کار میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ خواہ کچھ ہی ہو۔ میرے دو کارڈ تو بچ گئے۔ جن سے میں اپنی مہمات سر کرنے کی تشنگی بجھا سکتا ہوں ...... مجھے بہت لطف آتا ہے جب میں خوش ہوتا ہوں۔ میں تمھیں بتاؤں جب میں ایک روز اسکاٹ لینڈ (Scotland) میں نیاگرا آبشار میں تیر رہا تھا۔

ہم دونوں کو بیساختہ ہنسی آ گئی۔

وہ کون سی جگہ ہے؟

(از جناب اختر پیامی - دائرہ اُردو گیا)

جہاں راتوں کے سناٹے میں دنیا روپ بھرتی ہے — جہاں یہ زندگی اپنے دوراہے سے گذرتی ہے
جہاں تاروں کی چھاؤں میں جوانی کانپ جاتی ہے — جہاں ٹھنڈی ہوا سانسوں کی رو میں سرسراتی ہے
جہاں سکّوں کی جھنکاریں جوانی مول لیتی ہیں — جہاں وحشی نگاہیں زندگی کا خون پیتی ہیں
جہاں تاریک دھبّوں میں ستارے جگمگاتے ہیں — جہاں چوسی ہوئی ہڈی کو کتے کڑکڑاتے ہیں
جہاں کچلی ہوئی سانسوں میں اک دنیا مچلتی ہے — جہاں کچلی ہوئی انسانیت کروٹ بدلتی ہے
جہاں معصوم راتیں اپنے گہوارے میں سوتی ہیں — جہاں میلی کچیلی آرزوئیں خون روتی ہیں
جہاں نبض تمدن سے بھی جیتا خون بہتا ہے — جہاں بیجان سی تہذیب کا لاشہ تڑپتا ہے
جہاں خونخوار اوروں کی جوانی بیچ دیتے ہیں — جہاں تاریکیوں میں زندگی کی ناؤ کھیتے ہیں
جہاں ویرانیوں کی گود میں ارمان پلتے ہیں — جہاں انفاس کی گرمی سے احساسات جلتے ہیں
جہاں ہر مسکراہٹ اِک پیامِ درد ہوتی ہے — جہاں دکھتے ہوئے اعضا میں زندہ روح سوتی ہے
جہاں آنکھوں کی گہرائی میں دنیا تلملاتی ہے — جہاں ہونٹوں کی حرکت پر جوانی کسمساتی ہے
جہاں جذبات پر پیاسی جوانی دوڑ جاتی ہے — جہاں ننگی کہانی زندگی کا منہ چڑاتی ہے
جہاں ہر لمحہ بوڑھی زندگی کو درس دیتی ہے — جہاں جلتے دیئے کی لو میں دنیا سانس لیتی ہے

جہاں دنیا سے چھپ کر معصیت کی گود بھرتی ہے
جہاں چوڑی کی ہر جھنکار پر عصمت سسکتی ہے

ہندی کہاوتیں

(از جناب پرنسپل مشتاق احمد صاحب زاہدی)

ضرب الامثال اور کہاوتوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ کہاوت ذاتی یا قومی اور ملکی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر کہی جاتی ہے۔ اس لئے عام طور پر بطور سند استعمال کی جاتی ہے۔ اکثر اوقات کہاوتوں میں ناقابلِ تردید واقعات بیان ہوتے ہیں۔ مثلاً موسموں کے متعلق جو کہاوتیں ہیں وہ سب سچی ہیں۔ جیسے ماگھ کا جاڑا، جیٹھ کی دھوپ۔ بڑے کشٹ (دشوار) سے جئے (اُگے) روکھ (پودا) یعنی بہت جاڑے اور زیادہ گرمی کے موسم میں گھاس نہیں اُگتی۔ اسی طرح مثل ہے کہ بسنت جاڑے کا انت۔ یعنی بسنت آئی اور جاڑا ختم ہوا۔ بارش کے متعلق کہاوت ہے کہ برسے اسوج تو ناج کی موج۔ یعنی ساون کی بارش سے اناج بہت ہوتا ہے۔ اسی مثل کو یوں بھی کہتے ہیں۔ برسے ساون تو ہیوں پانچ کے باون۔ بہت سی کہاوتیں نصیحت کے طور پر بیان ہوتی ہیں جیسے مت کر ساس برائی تیرے آگے بھی جائی۔ یا "صابن دے میل کٹے اور گنگا نہائے پاپ۔ جھوٹ برابر پاپ نہیں اور سانچ برابر تاپ"۔ مطلب یہ کہ جھوٹ سے زیادہ کوئی گناہ نہیں اور سچ سے بہتر کوئی عبادت یا تپسیا نہیں۔ اسی طرح صحبت کی نسبت کہاوت ہے کہ "صحبت اچھی بیٹھ کے کھائیے ناگر پان۔ صحبت بری بیٹھ کے کٹائیے ناک اور کان"۔ صبر کرنے کی یوں نصیحت کی گئی ہے "صبر کرو من میت نا سمجھ رہے تو ہیں"۔ بعض انسانی کمزوریوں کی کہاوتیں بہت مشہور ہیں۔ مثلاً شیخی باز اور اپتروں کے متعلق ذیل کی کہاوتیں زبان زد خلائق ہیں (۱) اپتر کے گھر تیتر۔ باہر باندھوں یا بھیتر (۲) آدھی رکابی بھلبھلا جات۔ لونچوں ہاتھوں ہاتھ" (۳) آدھ جل گگری چھلکت جائے (۴) تھوتھا چنا باجے گھنا۔ (۵) اوچھے کے گھر کھانا جنم جنم کا طعنہ (۶) اوڑھی چادر ہوئی برابر میں بھی شاہ کی خالہ ہوں (۷) گھر میں دھان نہ پان بی بی کو بڑا گمان۔ یا گھر میں بھونی بھنگ نہیں اور باہر نیوتے سات دھیو وغیرہ۔

خوشامدی لوگوں کی بہت سی کہاوتیں ہیں۔ جیسے اللوں بللوں ٹھنک سر کاتوں۔ یا سر سیلاؤں بیچا کھاؤں۔ کہاوتوں سے بعض قوموں کی خصوصیات پر بھی بہت روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً ہندوستان میں بنیا اور جاٹ اس لئے مشہور ہے کہ ایک کے ہاتھ میں تجارت اور دوسرے کے ہاتھ میں زراعت اور دونوں کو ایک دوسرے سے کام بھی پڑتا ہے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانا بھی ان کا شعار ہے۔ لیکن بنئے کا نمبر اول ہے۔ چنانچہ مثل مشہور ہے "اگم بدھی بانیا پچھم بدھی جاٹ"۔ یا "اور بنج کرے بانئے اور کریں ریس بنج کیا تھا جاٹ نے رہ گئے سو سے تیس"۔ "بنئے سے سیانا سو دیوانہ"۔ بنئے کے بیٹے تک کی سیان پت کی تعریف ہے یعنی بنئے کا بیٹا کچھ دیکھ ہی کے گرتا ہے۔ اس مثل کا قصہ یوں مشہور ہے کہ ایک بنئے کے لڑکے کے سر پر تیل کی ہانڈی تھی وہ چلتے چلتے گر پڑا اور ہانڈی ٹوٹ گئی کسی نے اس کے باپ کو خبر کی۔ باپ نے یہ مثل دہرائی تحقیق پر معلوم ہوا کہ لڑکے نے ایک اشرفی پڑی دیکھی اسے اٹھانے کے لئے جھکا تھا جو ہانڈی گر گئی۔ اہیر ذات کی کہاوت ان کی برائی ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً اہیر سے جب گن ہمیں جب بھالو سے گھی نکلے۔ یا اہیر کا کیا ججمان اور لسبی کا کیا پکوان۔ برہمنوں کے متعلق عام طور پر ان کے لالچ اور خود غرضی کا ذکر ہوتا ہے۔ جیسے بامن جیسے جی جتنا کمائیں یہ ججمان چاہے سرگ کو جائے چاہے نرک کو مجھے دہی پوری کا کام۔ آگے ناگت۔ پچھیلا کا نس۔ بامن اچھے ہیں نولیا اس۔ مسلمانوں میں یہ مثل ہے کہ مردہ دوزخ میں جائے یا جنت میں ہمیں نیاز ونذر سے کام۔ قاضی جی کی نسبت بھی بہت کہاوتیں ہیں۔ قاضی جی کو شہر کا اندیشہ اور قاضی جی کے چوہے بھی سیانے تو عام ہیں۔ لیکن ان سے قاضی جی کی کوئی برائی ایسی نہیں ظاہر ہوتی جس سے وہ شرمائیں۔ مگر قانون گو کو بُرا کہا گیا ہے۔ چنانچہ مثل مشہور ہے "قانون گو کی مری کھوپڑی بھی دغا دے"۔ اس کے متعلق یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی قانون گو کی کھوپڑی کھیت میں پڑی تھی۔ ہل چلانے پر جو یہ کھوپڑی نکلی تو اس میں کر آواز آئی کہ اس سال بیج نہ بونا کیونکہ بارش نہ ہوگی۔ گاؤں والوں نے ہل نہ چلائے۔ اتفاق کی بات کہ اس سال بہت بارش ہوئی۔ لوگ بہت پچھتائے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ کھوپڑی قانون گو کی تھی تو لوگوں نے کہا قانون گو کی کھوپڑی بھی دغا دے۔

بہت سی کہاوتیں جانوروں سے متعلق ہیں۔ "اونٹ کے گلے میں بلی"۔ اور "اونٹ کس کل بیٹھے"۔ یا "اونٹ کی کونسی کل سیدھی"۔ یا "اونٹ کا پہاڑ کے نیچے آنا"۔ عام طور پر مشہور ہیں۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ بلی کے خواب میں چھیچھڑے۔ بلی بھی لڑتی ہے تو منہ پر پنجہ رکھ لیتی ہے۔ اور بلی کی سیانوں کی کہاوت روزمرہ بولی جاتی ہے۔ بندر کے ہاتھ ناریل۔ بندر کیا جانے ادرک کا سودا (سواد) بندر کی کیا آشنائی وغیرہ وغیرہ کہاوتیں بندر کی خصوصیت ظاہر کرتی ہیں۔ بیلوں کے متعلق بھی بہت مثلیں ہیں۔ بیل سرکاری اور بیاپاریوں کی ٹھکاری۔ بیل نہ کودا کودے گون۔ یہ تماشہ دیکھے کون۔ ہاتھی کے متعلق ذیل کی کہاوتیں اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالتی ہیں (۱) ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ چونکہ ہاتھی کا پاؤں اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس میں ہر ایک پاؤں سما جائے۔ اس لئے اس کہاوت کا مطلب یہ ہوا کہ امیروں اور بڑے آدمیوں کے ساتھ غریبوں کا بھی گزر ہو سکتا ہے (۲) ہاتھی نکل گیا دم باقی ہے یعنی کام کا بڑا حصہ ہو گیا چھوٹا رہ گیا ہے (۳) ہاتھی کے ساتھ گنّا چوستا یعنی بڑے آدمی کی برابری کرنی (۴) ہاتھی گھوڑے بہائے گئے گدھا پوچھے کتنا پانی یعنی جب ہاتھی دریا سے پار نہ ہو سکا تو گدھے کی کیا حیثیت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں

ہندوستانی کہاوتیں ... پٹ ہوں (۲) ... یا حقیقت۔

بعض کہاوتوں سے توہم پرستی اور بعض سے اعتقاد کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ اس شخص کے ہاتھ پیر میں سنیچر ہے۔ سنیچر ایک سیارے کا نام ہے جسے عربی میں زحل کہتے ہیں۔ جن کا اعتقاد سیاروں کی گردش پر ہے وہ سمجھتے ہیں کہ جس کے طالع میں سنیچر یا زحل آ جاوے تو اس کے لئے بہت منحوس ہے۔ ہاتھ میں سنیچر کا مطلب ہاتھ میں پیسہ نہ ٹھہرنیکا اور پاؤں میں سنیچر ہے کے معنی ہوئے پیر میں چکر ہے (۲) آوے نہ جاوے برہسپت کہلاوے۔ برہسپت بھی ایک سیارے کا نام ہے۔ جسے مشتری بھی کہتے ہیں جس کے طالع میں مشتری ہو اس کا بڑا علم مشہور رہتا ہے (۳) دھن کے پندرہ مکر پچیس۔ چلتے کہیں چالیس۔ دھن یا دھنک اس برج کا نام ہے جسے قوس بھی کہتے ہیں اور مکر کے برج کو جدی بھی کہتے ہیں۔ کہتے ہیں جب آفتاب ان برجوں میں آتا ہے تو ہندوستان میں جاڑے کا موسم آ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جاڑے کے چالیس دن بہت سخت ہوتے ہیں (۴) مرن چلی اور سوکھ سامنے۔ سوکھ کو زہرہ بھی کہتے ہیں جب زہرہ ستارہ سامنے آ جاوے تو نیک فال سمجھی جاتی ہے۔ اس کہاوت کا یہ مطلب ہے کہ جب مرنا ہی ٹھہرا تو اچھے برے شگون لینے سے کیا نتیجہ۔ بعض لوگ آنکھ پھڑکنے کا شگون لیتے ہیں چنانچہ مشہور مثل ہے آنکھ پھڑکے دہنی میاں ملے یا بھنی (بہن) آنکھ پھڑکے بائیں۔ بیر (بھائی) ملے یا سائیں۔

ذیل کی کہاوتیں حقیقت پر مبنی سمجھی گئی ہیں۔ (۱) خربوزہ چاہے دھوپ کو۔ اور آم چاہے مینہ۔ ناری چاہے زور کو بالک چاہے نیہہ (پیار) (۲) باقی کیا مار اکھاڑوں۔ چلموں کا ماما چولہا۔ اور راولوں کا مارا کھیت پنپتا ہی نہیں۔ (۳) ان چار دن کا کیا اعتبار بالو کی بھیت (دیوار) اوچھے کی میت۔ پر (غیر) تریا کی پریت (محبت) تتلی کا رنگ (۴) بھٹ (بادہ فروش) بھٹیاری بیسوا تینوں جات کجات۔ آتے کا آدر کریں جات نہ پوچھیں بات (۵) پریت نہ جانے جات کجات۔ نیند نہ جانے ٹوٹی کھاٹ۔ بھوک نہ جانے باسی بھات۔ پیاس نہ جانے دھوبی گھاٹ۔ (۶) ٹھنڈا کھائے گرم سے نہائے۔ ساتے میں سوئے۔ اس کا بیری پچھواڑے روئے۔ (۷) سات ہاتھ ہاتھی سے رہئے۔ پانچ ہاتھ سنگھاری (یعنی سینگ والے جانور سے)۔ بیس ہاتھ متواری سے (۸) لیکھ لیکھ گاڑی چلے۔ اور لیکھ ہی چلے کپوت یہ تین پیڑھے چلیں۔ ساگر۔ سنگھ۔ سپوت

ان کہاوتوں کو کس نے بنایا اور یہ کیونکر بنیں اس سے فی الحال غرض نہیں ہے۔ غور کرنے کی بات تو یہ ہے کہ سینکڑوں برس سے لاکھوں لوگ ان کو بولتے چلے آ رہے تھے اور ان کی صداقت اور شیرینیٔ کلام ان کی قدامت سے ثابت ہے۔ مشرقی اخلاق اور ہندی رواج و عادات وطرز زندگی کا اگر پتہ چلانا ہو تو یہاں کی کہاوتوں کا مطالعہ بے حد دلچسپ ثابت ہوگا۔

قطعہ

(از جناب سید مصطفےٰ علی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل۔ کانپور۔ المتخلص بہ "م۔ ع")

حُسن کی سحر کاریاں توبہ
عشق کی بیقراریاں توبہ

اور پھر "ازدواج" کی لعنت
روح کی ہائے خواریاں توبہ

باز آئے ہم اس ردیف سے اب
قاضیوں کی وہ داڑھیاں توبہ!

"......تو کیا کرے گا قاضی"

(از جناب سید مصطفےٰ علی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل، کانپور، المتخلص بہ "م۔ ع")

خبر ہے؟ دَورِ رفتہ کے علمبردار قاضی جی
کہ امکاناتِ حُسن و عشق کی حد ہی نہیں کوئی

مگر سرمایہ دارانہ تفکر سے خدا سمجھے
سمجھنا چاہئے تھا جن کو وہ بھی کیا سے کیا سمجھے!

یہ مانا "اتحادِ مرد و عورت" عین فطرت ہے
جو آسودہ نہ ہو جنسی کشش تو اک مصیبت ہے

مگر یہ حق کسے ہے، پوچھئے اپنے سے شرما کر،
کہ دلّالی کرے مابین دو جنسوں کے وہ آکر؟

یہ جنسی جبر جس کی آپ یوں بنیاد رکھتے ہیں
یہ معصوموں کے سر پر سنگِ استبداد رکھتے ہیں!

کہاں یہ آپ نے اپنی جبین بندگی رکھ دی؟
تجارت کے اصولوں میں جکڑ کر زندگی رکھ دی!

یہ کل ہندوستان چرچا ہے جس کی وضعداری کا
مُرقّع ہے گھریلو زندگی کی سوگواری کا

یہاں انساں نہیں انساں نما حیوان رہتے ہیں
"نشاطِ زندگی" سے عمر بھر انجان رہتے ہیں

نظامِ زندگی یہ عقل سے ہے سر بسر عاری
یہاں ہر فرد کی رگ رگ میں غم کا زہر ہے ساری

بقائے نسل کے حامی مگر پروا نہیں کرتے
مریضِ جاں بلب کو ہوش میں آنے نہیں دیتے

یہ طرزِ خود کشی اب خود ارادی ہوتی جاتی ہے
پُرانے طور سے "شادی" پہ "شادی" ہوتی جاتی ہے

مگر انسانیت اب پھر سنبھالا لینے والی ہے
سماجی بندشوں کا سخت بدلہ لینے والی ہے

گئے وہ دن کہ جب ہوتی تھی حضرت ہی کی من مانی
بہت دن ازدواجی دوزخوں کی کرلی دربانی!

نہ کیوں کھیلیں نہ کیوں چھیڑیں؟ کسی کا کیا اجارہ ہے؟
اگر ماضی نہیں تو حال و مستقبل ہمارا ہے!

ذرا سی چھیڑ سے کیوں گڑگڑانے پر ہیں آمادہ؟
نہیں! قاضی نہیں ہیں، آپ تو ہیں قاز کی مادہ!!!

کتاب السلف

(سلسل۔ سلسلہ کے لئے ادیب" ۱۹۴۳ء ملاحظہ فرمائیے)

(از علامہ سیماب اکبرآبادی)

(۱۰) حضرت خواجہ میر درد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

ولادت۔ نام و نسب محمد میر نام۔ درد تخلص۔ خواجہ خاندانی لقب۔ بنسف خواجہ محمد ناصر عندلیب دہلوی ۱۱۳۳ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ باپ شاعر بھی تھے۔ اور صاحبِ سجادہ بھی۔ اس لئے یہ دونوں باتیں آپ کو وراثتاً ملیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب گیارہ واسطوں سے خواجہ بہاؤ الدین نقشبند علیہ الرحمۃ تک اور ۲۵ واسطوں سے حضرت امام عسکری تک پہنچتا ہے۔

اخلاق و عادات خواجہ میر درد دہلوی متوکل، قانع، متقی اور خدا پرست بزرگ تھے۔ فن موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا۔ مشہور مغنی اپنے گانے بنظرِ استفادہ آپ کو سنایا کرتے تھے۔ آپ کے مکان پر بھی ہر مہینے میں دو بار مجلس سماع منعقد ہوتی تھی۔ کبھی کبھی شاہ عالم بادشاہ بھی شریک ہوتے تھے۔ اور خود بھی کبھی کبھی ہوا کرتے تھے۔ ۱۲ برس کی عمر میں اپنے والد ماجد کی خانقاہ میں سجادہ نشین ہوئے۔

معاصرین خواجہ صاحبؒ سودا، میر سوز، اور میر تقی میر کے معاصر تھے۔ اس دور میں یہی چاروں شعرا اردو شاعری کے چار ستون کہلاتے تھے۔ رنگ سخن بھی چاروں کا یکساں تھا۔ اور زبانِ اردو کی اصلاح و ترصیع میں چاروں کی کوششیں مساوی تھیں۔ امتیاز صرف یہ تھا کہ خواجہ میر درد اپنے مسلک و مشرب کے لحاظ سے تصوف آمیز اشعار زیادہ کہتے تھے۔

اعترافات میر تقی میر اکبرآبادی "نکات الشعرا" میں لکھتے ہیں:—

"جوان صالح۔ از درویشی بہرۂ وافی دارد۔ و فقیر را بخدمتِ او بندگی خاص است"

مصطفیٰ خاں شیفتہ "گلشن بے خار" میں فرماتے ہیں:—

"فکرش صحیح و نظمش فصیح۔ گفتارش از رکاکت و اغلاط پاک۔ دیوانش از نظر گزشت از اشعار پُر کن خالیست"

مولانا محمد حسین آزاد "آبحیات" میں رقمطراز ہیں:—

"تصوف جیسا انھوں نے کہا۔ اردو میں آجتک کسی سے نہ ہو سکا"

شعر ہے

سودا بدل کے قافیہ تو اس غزل کو لکھ لے بے ادب تو درد سے بس بے ادب نہ ہو

وضعداری خواجہ میر درد دہلوی کے تینوں مشہور معاصر یعنی سودا، سوز اور میر دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ لیکن خواجہ صاحب تمام عمر دہلی ہی میں رہے۔ آشوب وقت کے اثرات جیسے اور شعرا پر تھے ان پر بھی تھے۔ لیکن آپ نے ان سے اثر نہ لیا اور نہ کبھی کسی بادشاہ یا امیر کے لئے قصیدہ خوانی کی۔ یہ امتیاز وضعداری خواجہ درد علیہ الرحمۃ کو ان کے معاصرین میں ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے۔

وفات خواجہ صاحب نے ۶۸ برس کی عمر میں جمعہ کے دن ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ کو وفات پائی۔ اس مصرع سے سن رحلت نکلتا ہے۔

"حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب"

۱۱ ہجری ۹۹

آپ کا مزار دہلی میں جیل خانے کے پاس "میر درد روڈ" پر اب تک زیارت گاہ خواص و عوام ہے۔

تصانیف

(۱) دیوانِ غزلیات اردو
(۲) مختصر دیوان فارسی
(۳) رسالہ اسرار الصلوٰۃ۔
(۴) نالۂ درد
(۵) وارداتِ درد۔

خواجہ صاحب کے مشہور تلامذہ شیخ قیام الدین قائم چاندپوری ضلع بجنور (المتوفی ۱۲۰۸ھ بمقام رامپور) میر محمد اثر دہلوی (برادر خورد)۔ ہدایت اللہ خاں ہدایت۔ حکیم ثناء اللہ فراق۔ میر محمدی بیدار (المتوفی ۱۲۰۹ھ بمقام آگرہ)۔ سید ناصر نذیر فراق دہلوی مرحوم خواجہ صاحبؒ کے خاندان کی آخری یادگار تھے۔ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ مگر صوبہ بہار میں "درد اسکول" کا اتباع ابتک جاری و باقی ہے۔

انتخاب کلام درد

بارے مجھے بتا تو سہی، کیا سبب ہوا   پھر مجھ پہ مہربان ہوا تو، غضب ہوا

تیری ہی گلی میں راہ نکلی   بھولے بھٹکے جدھر گئے ہم

دل بھی تیرا ابھی وحشت سیکھا ہے   آن میں کچھ ہے، آن میں کچھ ہے

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما   اس طرف کو کبھی گذر نہ کیا

پھرتی ہے میری خاک صبا در بدر لئے   اے چشم اشکبار یہ کیا تجھکو ہوگیا
آیا نہ اعتدال پہ ہرگز مزاج دہر   میں گرچہ گرم و سرد زمانہ سمو گیا

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا   پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور   شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
یاد جو دیکھے پر و بال نہ تھے آدم کے   وہاں پہونچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن   میں نے پوچھا، تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا   کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں   کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
یک بیک نام لے اٹھا میرا   جی میں کیا اس کے آگیا ہوگا

حیران آئینہ دار ہیں ہم   کس سے یارب دوچار ہیں ہم؟
اپنے ملنے سے منع مت کر   اس میں بے اختیار ہیں ہم

کچھ روئے نہ تھے کہ کھو گئے ہم   تھے آپ ہی ایک، سو گئے ہم
ماتم کدۂ جہاں میں جوں ابر   اپنے تئیں آپ رو گئے ہم

بعد مرنے کے مرے، ہوگی مرے رونے کی قدر   تب کہا کیجیے گا لوگوں سے وہ برسات ہیں کہاں؟

خوش خرامی ادھر بھی کیجیئے گا   میں بھی جوں نقش پا ہوں چشم براہ
جس پہ تقصیر وار تم سمجھو   ابھی ایسا تو کچھ نہیں ہے گناہ

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک   اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

مدت تک جہاں میں ہنستے پھرا کئے   جی میں ہے خوب روئیے اب منہ چھپا کہیں

ذرہ اپنی طرف سے حاضر ہے   آگے پھر ہے تمہارے ہاتھ نہاد

آتش عشق جی جلاتی ہے   یہ بلا جان ہی پہ آتی ہے
تو ہے اور سیر باغ ہے ہر وقت   داغ ہیں اور میری چھاتی ہے

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا!   میں بے صبر اتنا ہوں، وہ تند خو ہے
غنیمت کر یہ دید و وادید یاراں   جہاں مند گئی آنکھ، میں ہوں نہ تو ہے

آج ہے آہ کی ہوا کچھ اور   دیکھئے کس طرف پلٹتی ہے

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس   تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے   تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے؟

ارض و سماں کہاں تری وسعت کو پا سکے   میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں ہوں ستم دیدہ   گر دل ہوں تو آزردہ، خاطر ہوں تو رنجیدہ

تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے   یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے

خواجہ صاحب کے بعض ضرب المثل اور مشہور اشعار:—

روندے ہے مثل نقش قدم خلق یاں مجھے   اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے!

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا   خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

سینۂ دل حسرتوں سے چھا گیا   بس ہجوم یاس، جی گھبرا گیا

ہم کس ہوس کی تجھ سے فلک جستجو کریں   دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ   جب تلک بس چل سکے، ساغر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

جدید اُردو شاعری

(از محترمہ حمیدہ سلطانہ بیگم صاحبہ ادیب فاضل)

محترمہ حمیدہ سلطانہ بیگم صاحبہ ادیب کے ممتاز قلمی معاونین سے ہیں جب سے ادیب کا اجرا ہوا ہے۔ ان کے مضامین اور افسانے بیشتر ادیب میں شائع ہوتے رہے ہیں جنھیں ادیب کے ناظرین میں بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

مندرجہ ذیل مضمون کے بعض حصوں سے ہمیں اتفاق نہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ دائرہ مضمون نگاروں اور ناظرین کے درمیان آہنی دیوار حائل کر دے اور مضمون نگاروں کے نتائج تحقیقات کو محض اس لئے بغیر ناظرین تک جانے سے باز رکھے۔ اس لئے محترمہ کا پورا مضمون بغیر کسی ردوبدل کے شائع کیا جاتا ہے۔

"جدید اردو شاعری" پر یہ مضمون ایک نئے [illegible] مختصر تبصرہ ہے۔ [illegible] ملک کے شعرا خصوصاً محترمہ [illegible] جدید [illegible] علیحدہ [illegible] لکھی ہیں [illegible] ترتیب میں محترمہ کا اپنا ذوق قابلِ ستائش ہے۔ (فصیح الدین احمد)

قاعدہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات اور اس کے رجحانات میں [illegible] اس کا ذوق بدلتا ہے اسی قدر شعرا کی حالت بدلتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی زمانے کے مذاق کے مطابق بالکل نامعلوم طریقے سے ہوتی رہتی ہے۔

کیونکہ شاعر قصداً خود نہیں بدلتا بلکہ سوسائٹی کے ساتھ ساتھ وہ خود بخود تبدیل ہوتا جاتا ہے۔

اُردو شاعری میں جدت کا سہرا جس شاعر کے سر پر سب سے قبل بندھا وہ مرزا غالب ہیں۔ مرزا نے اپنے ماحول کے مطابق میدانِ تغزل سے قدم نہیں ہٹایا لیکن غزل گوئی میں ان کا راستہ سب سے جدا ہے۔ اور اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ جہاں تھے وہیں تنہا کھڑے ہیں۔ کوئی ان کا حریف نہ بن سکا۔ مرزا کی شاعری مغل سلطنت کے زوال و انحطاط کا مرثیہ ہے۔ شاہانِ مغلیہ کی شان و شوکت ختم ہو چکی تھی اور اس اُجڑی ہوئی بزم کا آخری چراغ دہلی کے لال قلعہ میں ٹمٹما رہا تھا۔ ایوانِ ظفر گذری ہوئی بہار کا ایک خزاں زدہ منظر تھا۔ تاہم قلعہ معلیٰ میں عہدِ پیشین کی صدائے بازگشت گونج رہی تھی۔ امارت جا چکی تھی۔ لیکن امارت کا نشہ رگ و پے میں ابھی باقی تھا۔ شہنشاہی دبدبے کے ڈنکے کب کے خاموش ہو چکے تھے لیکن ایک سازِ شکستہ ابھی سُر دئے جا رہا تھا۔

مشاعرے ہوتے تھے مجلسیں ہوتی تھیں۔ ذوق جو بہادر شاہ کے اُستاد تھے وہی پرانی ڈھفلی الاپ رہے تھے لیکن غالب نے اس انقلاب پر ایک مفکرانہ غور کیا تھا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ محفل اب قریب ختم ہے۔ شمع کی اداسی۔ سامانِ نشاط کی برہمی۔ فضا کی افسردگی۔ ماحول کی ملالت۔ یاس و قنوط کی فراوانی اُن سے سب کہہ گئی تھی اس لئے انھوں نے ایک نیا اور سنجیدہ و متین راستہ اختیار کیا۔ یہ رنگ گو ان کے زمانے میں زیادہ مقبول نہ ہو سکا لیکن ان کے بعد جو ان جواہر پاروں کی قدر ہوئی وہ محتاجِ بیان نہیں۔

ان کے یہ شعر اور ان کے علاوہ بہت سے شعر جدید اُردو شاعری کے ایسے گوہر شہوار ہیں جو دامنِ ادب پر ہمیشہ درخشاں رہیں گے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

غالب کی صناعانہ تخیل نے کس کو مجال دیا ہے۔ غزل کے محدود میدان میں انھوں نے فلسفۂ زندگی کو اس طرح بیان کیا ہے جو ان کا ہی حق تھا۔

انھوں نے بتا دیا کہ غزل محض معاملہ بندی اور چونچلوں کا ہی نام نہیں اس میں کچھ کام کی باتیں بھی کی جا سکتی ہیں۔ شاعری صرف دل لگی اور دماغی تعیش ہی نہیں۔ بلکہ زندگی کے حقائق کو سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ اس لئے مرزا غالب تمام جدید اردو شعرا کے استاد ہیں۔ انھوں نے یہ نئی راہ اگر نہ کھول دی ہوتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ حالی و آزاد اور اقبال یہ کارنمایاں کر دکھاتے جو آج دنیا سے خراجِ تحسین وصول کر رہے ہیں۔ غالب کے بعد حالی و آزاد کے نام جدید اردو شاعری کے بانیوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انقلابِ روزگار نے اسلامی جاہ و جلال کا خاتمہ کر دیا تھا اور مسلمانوں کی زبوں حالی باعثِ عبرت تھی۔ حالی و آزاد کو قوم کی زبوں حالی نے انقلابی بنا دیا۔ وہ ذکی الحس تھے اور ایسا ہونا آرٹسٹوں کے لئے لازمی ہے۔ اس لئے انھوں نے شعر و ادب کو زندگی کی حقیقتوں سے قریب لانے کی کوشش کی۔ سب سے پہلی نظم آزاد نے ۱۸۷۴ء میں لکھی اس نظم کی تمہید میں انھوں نے اس نئی ادبی تحریک کے بعض اصول بیان کئے ہیں جن کا پہلا جملہ یہ ہے:۔

"ہماری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے اس کو آزاد کرنے کی کوشش کرو"

اسی طرح ترقی کا خیال آزاد اور حالی نے آنے والی نسلوں کے دلوں میں اپنے کاموں سے پیدا کیا۔ انھوں نے انفرادی طور پر نیا نظام قائم کیا۔ تلخ حقائق سے دوچار ہونے کے بعد اور نئی حکومت کی بدولت ان کے خیالات کی کایا پلٹ گئی۔ مشاعروں کی جگہ مناظمے ہونے لگے۔ اس تحریک کے بانی آزاد اور ان کے معاون حالی تھے۔

ان کی شاعری محض گل و بلبل اور زلف و کمر کی شاعری نہ تھی وہ کام کی باتیں کہتے رہے۔ قوم کی زبوں حالی کا ماتم کرتے رہے۔ لیکن ان کی شاعری زیادہ تر منظر نگاری اور اخلاقی نصائح سے بھری ہوئی ہوتی تھی۔ حب الوطنی کا ذکر محض اخلاقی فرض سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ حالی و آزاد نے ہمیں واعظوں کی طرح اصلاح و عمل کی راہ دکھائی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں انگریزی تعلیم نے دماغوں پر جلا کر دی۔ علم و سائنس کی ترقی اور علمی وسائل کی آسانی سے متوسط طبقے میں سمجھ بوجھ کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ ملک کی ایک باعزم جماعت نے قومیت کا تصور شعرا کے دماغ میں بھر دیا۔ اس اوائل

ترقی کی پیداوار دو شاعر اکبر الہ آبادی اور چکبست ہیں۔

ان دونوں کی راہ الگ تھی لیکن مقصد ایک ہی تھا۔ اکبر نے ہر نئے خیال کا مقابلہ کیا کیونکہ پرانی روایات پر نئی ترقیاں کاری ضرب لگا رہی تھیں اور اکبر پرانے اصولوں کو چھوڑنے کے روادار نہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان بندھنوں کا توڑ دینا قوم کے زوال کا باعث ہوگا۔ ان کا کلام اُس شراب کی طرح ہے جو پھیکی تو ضرور ہے لیکن پرانی ہونے کی وجہ سے کام و دہن کو اس کی تلخی ناگوار گذرتی ہے۔ چکبست کی شاعری جذبۂ حب الوطنی سے لبریز ہے مگر وہ بھی ایک دائرے میں محدود ہے۔

لیکن بیسویں صدی نے دنیا میں جو کشمکش پیدا کر دی تھی اُس کا بہترین مفہوم اقبال کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اقبال نے تنہا وہ کام کیا جو اور لوگ متحدہ طور پر نہ کر سکے۔ انھوں نے غافل ہندوستانیوں کو اپنے پرجوش کلام سے احساس خودی جاننے کی تلقین کی۔ اقبال کی الہامانہ شاعری سے متاثر ہو کر اہل ہند انگڑائی لے کر بیدار ہو گئے۔ ان کے دل میں احساس غیرت کروٹیں لینے لگا۔ عروس ادب نے پرانا جامہ اُتار پھینکا۔ اقبال کے تفکر نے نئی نئی راہیں کھول دیں۔ قوم کا بکھراؤ جو رسوائی کی حد تک پہنچ گیا تھا اس کو دُور کرنے کے لئے انھوں نے مختلف تدابیر سوچیں۔ سب سے زیادہ ان کو فلسفۂ خودی نے اپنا لیا تھا۔ انھوں نے سوچا جب تک افراد میں نصب العین اور بلندی کی کمی رہے گی کوئی اجتماعی احساس انھیں منظم نہ کر سکے گا۔ ۱۹۱۷ء کے قریب وہ انقلابِ روس کے بعد سمجھ گئے کہ دنیا میں اب مزدوروں کا دور آ گیا ہے۔ اس دور سے ان کو بہت ہمدردی تھی لیکن ان کے اوپر فلسفۂ خودی غالب آتا چلا گیا اور ان کے فکر کا مقام دن بدن بلند ہوتا گیا۔ عوام ان کا بلند "تخیل" سمجھنے سے قاصر رہے اور یہ خیال عام ہو گیا کہ اقبال اپنی انقلابی اسپرٹ کے لحاظ سے ایک حد میں رہتے ہیں۔ چند خوش عقیدہ مسلمان نقادوں نے اقبال کو محض ندیم اسلام قرار دے کر ان کی شاعرانہ عظمت کی جانب سے آنکھیں بند کر لیں۔ حالانکہ اقبال انسانی انفرادیت اور مخلوق کی خود مختاریت کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"فطرت" کو خرد کے روبرو کر — تسخیرِ مقامِ رنگ و بو کر
تاروں کی فضا ہے — تو بھی یہ مقام آرزو کر
بے ذوق ہے گرچہ فطرت — جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

اقبال کا پیغام دنیا کے لئے تھا وہ کسی خاص فرقے کے رہنما نہ تھے۔ فرماتے ہیں:۔

یہ مصرعہ لکھ دیا اک شوخ نے محرابِ مسجد پر۔ یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

اس شعر میں جو روحِ عمل ہے جو پیغام ہے، اس کا مطلب صاف ہے۔

اقبال مسلمانوں کو محض نمازوں تک محدود رکھنا نہیں چاہتے بلکہ وہ اُس روحِ جہاد کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ جو اسلام کی اصل روح ہے!

ہاں یہ صحیح ہے کہ اقبال کا اول مسلمانوں کی موجودہ بےحسی کاہلی اور ذہنی غلامی کی طرف تھا اور انھوں نے اس پستی کا اصلی سبب بھی بتا دیا تھا۔

ع :۔ شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

قدرت کے ساتھ اقبال کے محبت آمیز شکوے اور مجبوبانہ انداز ناز اس کے کلام کی بڑی دلکش خصوصیت ہے۔ ذرا حسن بیان دیکھئے فرماتے ہیں۔

تھا ارنی گو کلیم، میں ارنی گو نہیں — اس کو تقاضا روا، مجھ پہ تقاضا حرام

آزادی کی تڑپ ہمیشہ اقبال کے دل میں جلوہ گر رہی اور کمزور قوموں کو آزاد ہونے کی تلقین وہ تمام عمر کرتے رہے اُن کا آخر عمر کا کلام روحانیت کی لطافتوں سے بالکل خالی ہے۔ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں وہ شاعر سے زیادہ مفکر ہیں کہیں کہیں اُن کے فکر کا مقام اس قدر بلند ہو جاتا ہے۔ جو ہر ایک کے لئے سمجھنا آسان نہیں اس لئے ہی اس کے متعلق لوگوں نے الٹی سیدھی رائے قائم کر لی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اقبال کے اصلی منشا کو سمجھ سکے ہیں: ہندوستان کے اس مفکر شاعر کی بہت سی پیش گوئیاں۔ آج حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔

اقبال نے آنے والی نسلوں کو مقصد زندگی سمجھا دیا اردو نظم نے ترقی کی بہت منازل طے کر لیں لوگوں کے دماغی سانچے اپنی جگہ چھوڑ کر ایک نئی شکل اختیار کرنے لگے گو ایجاد و تخلیق میں ابھی تک تکمیل کی شان پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ پھر بھی چند سالوں میں اردو شاعری میں ہم بہت تغیر و تبدل دیکھ رہے ہیں۔ جدید اُردو شعرا کے کلام میں اب مبالغہ آمیز داخلیت روحانیت بےکیف انفرادیت بالکل معدوم ہے۔ ڈاڑھی مونچھ والا محبوب فرضی عشق و محبت کی بے سر و پا داستانیں اب شاعری کا جزو اعظم نہیں رہیں بلکہ زندگی کے تمام حقائق کو عریاں کر کے یہ شعرا ہمارے سامنے لا رہے ہیں۔ زمانے کی سرعتِ انقلاب نے ان کی راہبری کی ہے اس لئے سماجی کشمکش سے پیدا ہونے والے ادب کا اس قدر ذخیرہ اُردو میں فراہم ہو گیا ہے کہ ہندوستان کی کوئی اور زبان اب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اگر صرف اُن شعرا کا خیال کیا جائے جو صحیح طور پر انقلابی ہیں اور جنھوں نے اُردو شاعری میں نئی نئی راہیں نکالیں تو بے اختیار ان چند شعرا کا نام لب پر آ جائیگا۔

جوش[1] ۔ حفیظ[2] ۔ سیماب[3] ۔ احسان[4] ۔ ساغر[5] ۔ اختر شیرانی[6] ۔ مجاز[7] ۔ جذبی[8] ۔ فیض[9] ۔ ن۔م۔ راشد[10] ۔ روشن[11] ۔ تاثیر[12] ۔ علی سردار جعفری[13] ۔ سجاد ظہیر[14] ۔ جاں نثار اختر[15] ۔ رضی[16] ۔ مطلبی[17] ۔ مخدوم[18] ۔ وقار[19] ۔

اگرچہ ان میں سب انقلاب کے صحیح مفہوم سے آشنا نہیں ہیں لیکن موجودہ تمدن سے بیزاری ان سب کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ ان کے شعر محض رومان کی داستان

جیسے ہیں۔ وہ علم و تقلید کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہیں کم و بیش ان میں سے ہر ایک نے شاعری کو زندگی کے ربط سے سمجھا ہے۔ یہ سب نئی نئی اشکال میں نئے نئے تجربے کر رہے ہیں۔ ان کے تصورات اچھوتے ہیں ان کا تخیل بلند۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس مختصر مضمون اور اس تھوڑے وقت میں ان سب شعرا کے اُن کارناموں کا بیان کرنا جس سے انھوں نے اردو ادب کو زندہ کر دیا بہت مشکل ہے۔ لیکن ان چند شعرا کا ذکر کر دینا ضروری ہے جن کے نام آسمانِ ادب پر ستاروں کی مانند جگمگا رہے ہیں۔ تاکہ ان کے کاموں کی اہمیت کچھ آپ کی سمجھ میں آ سکے۔

جوش ملیح آبادی نے جس جرأت اور حقیقت نگاری سے ہماری زندگی کے ہر رُخ کو اجاگر کیا ہے اس کا جواب اُردو تو کیا اور دوسری زبانوں میں بھی تلاش کرنا مشکل ہوگا اقبال ہمارے دلوں میں صرف ہلکی ہلکی تھپکیاں لیتے ہیں۔ لیکن جوش ہمیں جھنجھوڑ ڈالتے ہیں مگر کہیں کہیں وہ اس تہذیب کے مدح خواں نظر آتے ہیں جس میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی۔ شاعرِ انقلاب ہونے کے باوجود بھی وہ جاگیرداری عہد کی عینک سے زندگی اور خاص کر عورت کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ عورت کو محض ذریعہ تفریح سمجھتے ہیں۔ علم و عمل کے قابل اس کو نہیں سمجھتے۔

جوش کے مزاج میں تخریب و تکامل کے عناصر ہیں اس کا اثر ان کی شاعری پر بھی ہے لیکن اُن کی باغیانہ اسپرٹ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کو سماج کی بدلتی ہوئی حالت کی خبر ہے وہ زمانے کی سرعتِ انقلاب سے پوری واقفیت رکھتے ہیں زبان و بیان پر جوش کو حیرت انگیز طور پر قدرت حاصل ہے۔ کوئی زبردست نقاد بھی اُن کے کلام پر تنقید کرتے وقت اُس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دریا کی روانی۔ پھولوں کی لطافت۔ بہار کی شگفتگی۔ جوش کے کلام کی دلکشی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اُن کی شاعری ہمارے اعصاب کو صرف راحت ہی نہیں بخشتی بلکہ ہمیں سوچنے کے لئے بھی مجبور کرتی ہے۔ زندگی کے حقایق جوش کی شاعری کی جان ہیں۔

اُن کے کلام میں شدید فارسیت کے ہوتے ہوئے بھی ہندی ساز و سامان کافی ہے بنیادی طور پر جوش کی روح ہندوستان کی سرزمین اور ہندوستانی روایات سے متاثر ہے۔

ہمارا حکم میں وہ کہتے ہیں:۔

قسم اس عزم کی سادات جب میدان میں آتے ہیں
دمِ رخصت عروسِ نو کا جب گھونگٹ اٹھاتے ہیں
قسم اُن فو تو ں کی جو ملی تھیں رام و لچھمن کو
قسم اُس آگ کی جو کھا گئی تھی ملکِ راون کو
قسم اُس نور کی روشن تھے جادے جس سے صحرا کے
جھلکتا تھا جو ٹیکے کی طرح ماتھے پہ سیتا کے
قسم اُس تیر کی چلتا تھا جو چٹکی سے ارجن کی
قسم میدان میں گاتی ہوئی تلوار کی دشمن کی
قسم اُس جوش کی جو نبضیں ابھارے گا
کہ اے ہندوستان جیسے ہی تو مجھکو پکارے گا
مری تیغِ رواں باطل کے سر پر جگمگائے گی
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

جوش کے یہ شعر اردو شاعری میں ٹیکنیکل انقلاب کا ثبوت ہیں اور جدید اردو شاعری کا بہترین نمونہ۔

وہ کبھی کبھی عہدِ نو کی تخلیق کرنے کی دھن میں انتہا پسند ہو جاتے ہیں۔ ان کے کلام کی خصوصیت طنز نگاری ہے "نازک اندامان کالج سے خطاب" کرتے ہیں وہ کالج کے نوخیز لڑکوں کی سج دھج دیکھکر نہایت دلچسپ طنز کرتے ہیں۔

نازکی کا مقتضا پتلی چھڑی باندھے ہوئے
شوقِ کنگن کا کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے
ریشمیں رومال سے ہے فرقِ نازک پر بہار
اوڑھنی پر دیدنی ہے راہ کا گرد و غبار
جنگ اور نازک کلائی بیچ میں تقدیر کے
ٹوٹ نہ جائے گی نگوڑی بوجھ سے شمشیر کے
زندگی طوفان ہے اور ناؤ ہو تم پاپ کی
آہ جیتی جاگتی بدبختیوں ماں باپ کی

فیشن پرستیوں اور جمود کے خلاف یہ پوری نظم جوش کا ایک زبردست شاہکار ہے۔ رومانی ..... میں بھی جوش باتیں اکثر کام کی کہتے ہیں۔ اُن کی مثال اُس شرابی کی سی ہے جو سُئے تند و تیز کے۔ پے بہ پے جام چڑھ جانے کے بعد بھی بہت کم بہکتا ہے

حفیظ کی شاعری کی خصوصیت سادگی اور رنگینیِ ترنم ہے۔ آفاقیت کی کمی حفیظ کے ہاں بھی نہیں ہے۔ زبان و اسلوب بیان پر ان کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ اُردو دنیا اُن کے دلکش گیتوں سے واقف ہے۔

حفیظ کی نظموں میں اس درجہ روانی اور ترنم ہے کہ بے اختیار گنگنانے کو جی چاہتا ہے لیکن ان کا خاص کارنامہ جس کے لئے مسلمان ان کے ممنون ہیں "شاہنامۂ اسلام" ہے۔ یہ سعادت خدا نے ان کی قسمت میں لکھی تھی۔ اسلام کی تاریخ کو اس خوبی سے

نظم کردینا تھی تکمیل تھا حفیظ کی اس تصنیف نے نئی عزت و احساساتِ قومی کو مسلمانوں
میں زندہ کردیا" فردوسی" شاہنامہ کے مصنف سے اپنا موازنہ کرتے ہوئے حفیظ کہتے ہیں۔

کیا فردوسی مرحوم نے ایران کو زندہ — خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ
مقابل کا کروں دعویٰ یہ طاقت کہاں مری — تخیل ہے ناقص نا مکمل ہے زباں میری
زبانِ پہلوی کی ہمسر یہ زباں ہو نہیں سکتی — ابھی اردو میں پیدا وہ روانی ہو نہیں سکتی
وہاں ہے اب وہ دورِ غزنوی کی فارغ البالی — غلامی نے دبا رکھی ہے میری ہمت عالی

آخری شعر میں جو درد ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ حفیظ کو آزاد ہونے کی کتنی خواہش ہے۔ اور وہ قوم کی زبوں حالی سے کس قدر متاثر ہیں۔ مگر افسوس ہے پچھلے دو تین سالوں سے حفیظ کی شاعرانہ حس پر دھند طاری ہو چکا ہے۔ اب ان کے نغمے سینوں میں [illegible] نہیں دھڑکا سکتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکے اور اب نئی چیز اردو ادب کو وہ دے نہیں سکتے۔

سیماب نے کوئی خاص جدت و اختراع اردو شاعری میں نہیں کیا لیکن زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ وہ تبدیل ضرور ہوتے گئے اور ان کے تازہ کلام میں ہندوستان کی ذہنی کشمکش اور موجودہ پابندیوں کے خلاف کافی چیزیں ہوتی ہیں۔ اپنی نظم "مزدور" میں سرمایہ دار کو مزدور کی بیکسی مصیبت زدہ زندگی کا احساس کراتے ہوئے کہتے ہیں

دیکھ لے قارونِ اعظم دیکھ لے سرمایہ دار — نامرادی کا مرقع ہے کسی کا شاہکار
ہے تیری طرح انسان مگر مقہور ہے — دیکھ لے دولت کے اندھے سانپ! یہ مزدور ہے

احسان زندگی کی عکاسی کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ مزدوروں کی زندگی کی تصویر احسان سے بہتر کسی نے نہیں کھینچی چونکہ انھوں نے اس طبقے میں اپنی زندگی کے بہت سے دن گزارے ہیں۔ اس لئے وہ جو کچھ کہتے ہیں لفاظی نہیں حقیقت ہوتی ہے۔ ذاتی تجربات نے احسان کو انقلاب پسند بنا دیا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ قنوطیت بے حسی اور پستی کا احسان کو شدید احساس ہے۔ اولیائے کرام کے مزارات پر بیٹھے ہوئے فقیروں کو مخاطب کرکے احسان کہتے ہیں۔

صابر کے درِ پاک کے بیٹھے ہوئے فقیر وا — بہروپ ہے یہ روپ صداقت ہے صداقت
مانا کہ یہ دریوزہ گری سنتِ شاہاں — ورثے میں ملی ہے تمہیں عزت نہ شجاعت
جو مرد ہیں لیکن وہ گدائی نہیں کرتے — تم دامنِ تہذیب پر ہو داغِ نجاست

جس صاحبِ عرفاں کا تمہیں نام ہے ازبر
تعلیم ہے اُس مردِ مجاہد کی۔ قناعت

احسان کی شاعری ایک مضطرب دل کی تڑپ ہے۔ ایک بے چین روح کا ہکار ہے

ساغر کی شاعری کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا طرزِ تحریر صحیح معنی میں "ہندوستانی" ہوتا ہے۔ حتی الامکان وہ ایسے الفاظ و استعارات اور تشبیہات استعمال کرتے ہیں جو ہندوستان کے کلچر کے لئے موزوں ہوں۔

اپنے گیتوں میں ہندو علم الاصنام کا پیوند لگا کر ساغر نے اپنا انفرادی رنگ قائم کیا ہے۔ ساغر کی بعض نظمیں بھی گیت کی شکل میں ہیں "ناگ" ان کی ایک ایسی ہی نظم ہے۔ شاعر سماج کا باغی۔ سرمایہ داری سے متنفر ہے۔ موجودہ نظام سے اکتا چکا ہے اس کی نظر ناگ پر پڑتی ہے۔ جس سے ہر انسان ڈر کر بھاگ جاتا ہے۔ باغی شاعر سے بھی سب ناگ کی طرح خائف ہیں اس لئے وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے

مصرع:۔ آؤ تمھیں تن من میں بسا لوں اے بانبی کے باسی

پھر آگے اس نظم میں ناگ کو شنکر کی جوشش اور کالی کا گجرا کہہ کر قدیم ہندو دیو مالا کی یاد ساغر نے دل میں تازہ کردی ہے۔ یہ نظم نہ صرف انقلاب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بلکہ اس میں ہماری جدید شاعری کی دوسری خصوصیت بھی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ساغر کی چند اور جدید نظمیں "وعدہ" "سماج" "مجھے اتنی فرصت کہاں" اردو شاعری میں ایک نئے رنگ کا اضافہ کرتی ہیں۔ ساغر کی نظر دنیا کے ہر ایک خشک و تر کا مطالعہ کرتی ہے۔ اور اپنی رو میں ہر شے کو رنگین معطر و دلکش بناتی چلی جاتی ہے۔

اختر شیرانی نے اردو شاعری میں اوّل اوّل رومانی تصورات کو جامہ تشکیل دی۔ ان کی نظموں کی سلمیٰ اور ریحانہ سے ہم اس طرح واقف ہیں گویا وہ اسی دنیا کے چلتے پھرتے کردار ہیں۔ اختر کی شاعری ایک ایسی طلسمی رنگینی ہے جس کو دیکھتے ہی ہم مسحور ہو کر جھوم جاتے ہیں۔

محبت کے سرسری اور ہلکے پھلکے پہلو کو نفسیاتی مطالعہ کی گہرائیوں سے قابلِ غور چیز بنا دینا اختر کی شاعری کی خاص خصوصیت ہے۔

"ننھا قاصد" اختر شیرانی کی دلکش و رنگین شاعری کا ایک ایسا ہی شاہکار ہے۔ عہد ماضی میں شاعر کی محبوبہ کا ننھا بھائی اپنی باجی کا پیغام [illegible] ہو کر جب وہ شاعر سے ملا تو عہد ماضی کی تمام بھولی ہوئی کہانی شاعر کے ذہن میں تازہ ہو گئی اور شاعر اس جوان کی شریر طنزیہ نظروں سے شرمندہ ہو گیا۔ نظم کے آخری بند ملاحظہ کیجئے۔

ترے قاصد سے یہ افکار دل کو گدگداتے تھے — اور اپنے بھولپن [illegible]
ہنسے تو وقت انھیں ایام پر جب بھی خیال آیا — تصور تیرے بعد [illegible]
[illegible]

وہی ننھا سا قاصد نوجواں ہو کر ملا مجھ کو ‏— زمانے کے تغیر نے پریشاں کر دیا مجھ کو

جنونِ ابتدائے عشق نے کروٹ سی لی دل میں ‏— پس از مدت یہ لیلےٰ آ گئی پھر اپنے محمل میں

تبسم قاصد سے ملتے وقت مجھکو شرم آتی تھی ‏— مگر اُس کی نگاہوں میں شرارت مسکراتی تھی

شرارت کا یہ نظارہ مری حیرت کا ساماں تھا ‏— کہ اس پردے کے اندر تیرا رازِ عشق عریاں تھا

اختر کی شاعری بالکل جذباتی سہی لیکن متاثر ضرور کرتی ہے۔ مجاز الفاظ کی بندش اور انداز بیان میں جوش سے متاثر ہیں لیکن جوش کی درشتی کے اثرات سے مجاز کی شاعری محفوظ ہے استعاراتی اور تشبیہاتی انقلاب مجاز کی شاعری کی خصوصیت ہے اپنی مشہور نظم "آوارہ" میں وہ کہتے ہیں

مسجد کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب ؟

جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب

چاند کے لئے ملا کا عمامہ اور بنئے کی کتاب کہنا ایک نئی تشبیہ ہے یہ استعارات بنیادی انقلابی تخیل کو ایک نئے روپ میں اجاگر کرتے ہیں۔ مجاز کے کلام میں رومانیت کا عنصر بہت زیادہ ہے ان کی زیادہ تر نظمیں رومانی ہیں۔ مجاز کی شاعری قدیم اسالیب اور جدید طرزِ تفکر میں ایک حد فاصل کھینچتی ہے۔ جدید تشبیہ، جدید استعارات اور نئے نفسیاتی شاعرانہ شعور مجاز کی شاعری کی دلکش خصوصیات ہیں۔

جدید شاعری بنی نوع انسان سے محبت و ہمدردی کی آئینہ دار ہے جدید اردو شعراء [illegible]کار، اچھوتوں، عفونت بیز گلیوں۔ ٹوٹے پھوٹے مکانوں جھلسی ہوئی جھونپڑیوں حتیٰ کہ بیسوا عورتوں تک کو گہری ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اپنی نظموں کا موضوع ان کو بھی قرار دیتے ہیں معین احسن جذبی کی تازہ نظم "کسبی" ملاحظہ کیجئے:

ہائے یہ جلتی ہوئی حسرت تری آنکھوں میں ہے ‏— کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھکو

اپنی پستی کا بھی احساس اور پھر اتنا احساس ‏— کہ نہیں میری محبت میں گوارا تجھکو

ترے زرد سے رخسار پہ اشکوں کی قطار ‏— مجھ سے بیزار، مری عرض وفا سے بیزار

اتنی خوبیوں کے ہوتے ہوئے جدید اردو شاعری میں چند خامیاں بھی ہیں۔ کبھی کبھی جدید اردو شعرا ترقی پسندی کے زعم میں اس قسم کی عریاں نظمیں لکھ جاتے ہیں جو طبائع پر بار ہوتی ہیں۔ عریانی اردو شاعری میں کوئی جدت اور ترقی پسندی نہیں ہے پرانے غزل گو شعرا کا عریاں کلام نظروں کے لئے سامان خلش پہلے ہی بنا ہوا ہے۔ اب جدید اردو شعرا کو ایسے شعر کہنا جو رکاکت و ابتذال کا پہلو لئے ہوئے ہوں قطعی نہیں چاہئے بعض پنجابی نوجوان شعرا نے جدت کی دھن میں علامات کو اتنا داخلی بنا دیا کہ سوائے ان کے کوئی دوسرا اُن کے اشعار کا مطلب سمجھ ہی نہیں سکتا اس سے شاعری کا مقصد بالکل فوت ہو جاتا ہے شاعروں کو ایسی گورکھ دھندا قسم کی شاعری نہیں کرنی چاہئے جو اُن کے علاوہ کوئی دوسرا سمجھ ہی نہیں سکے۔ وہ پنجابی شعرا جن کی علامات داخلی اور تمثیلی ضرور ہیں لیکن ہمارے ذہن کے قریب اور بعید از قیاس نہیں ہیں ان میں فیض و راشد اولین صف میں ہیں۔ یہ دونوں جو کچھ کہتے ہیں اس کو ہم محسوس کر سکتے ہیں فیض کی نظم "موضوعِ سخن" اور راشد کی نظم "دریچے کے قریب" جدید اردو شاعری کا بہترین و دلکش نمونہ ہیں۔

قدامت کی اندھا دھند تقلید اور روایاتی شاعری کے بجائے فیض نے اپنی شاعری کا یکسر گرانقدر طرز تفکر اور نفسیاتی تقاضوں کو قرار دیا ہے فیض کا فارم قدیم سہی مگر ان سانچوں میں جو عناصر گھلائے گئے ہیں وہ نئے ہیں اور جس طرح جذبات اور زندگی کو وہ محسوس کرتے ہیں لکھتے ہیں۔ ایک کامل شاعر کی فنی اعلیٰ خصوصیات ان میں موجود ہیں

راشد بلینک ورس نظم معریٰ کے موجد کہے جاتے ہیں خیر یہ کریڈٹ تو تاریخ اُن کو دے نہیں سکتی کیونکہ نظم معریٰ کے متعلق اردو شاعری میں اس سے پہلے مولانا اسمٰعیل آزاد اور دوسرے لوگ تجربے کر چکے ہیں راشد کا عمل بھی تجربہ کی حیثیت رکھتا ہے ان کی چند نظموں کو چھوڑ کر باقی نظموں کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نے مغربی تصورات اور اسالیب کی نقل ہے۔ ان کے کلام میں ابہام اور ایک قسم کے کھردرے الفاظ کی زیاتی ضرور ہے لیکن یہ کہنا راشد پر ظلم کرنا ہے کہ ان کے تفکر میں امید مقصد واضح اثر کا نام و نشان نہیں ہے موجودہ دور کی کشاکش اور روایتی بندھنوں سے بیزاری اور مقاصد میں ناکامی کی وجہ سے ہر ذکی الحس نوجوان خصوصاً نوجوان ادیب و شاعر متاثر ہیں اور اس تاثر کی جھلکیاں ان کی تحریروں میں نظر آتی ہیں۔

راشد کی نئی نظم "زنجیر" کے چند آخری شعر ملاحظہ کیجئے جس میں ہندوستانی عورت سے مخاطب ہو کر وہ کہتے ہیں کہ شکر ہے تری سرمئی تحریر میں جس کو شاعر نے زنجیر سے تشبیہ دی ہے ایک لرزش پیدا ہو گئی یعنی ہندوستانی عورت میں بیداری کا تصور پیدا ہونے لگا۔ شکر ہے دنبالۂ زنجیر میں۔

اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی ‏— کوہساروں ریگزاروں سے صدا آنے لگی

ظلم پروردہ غلامو بھاگ جاؤ ‏— پردۂ شبگیر میں اپنے سلاسل توڑ کر

چارسو چھائے ہوئے ظلمات کو چیر جاؤ ‏— اور اسی ہنگام باد آورد کو حیلۂ شبخوں بناؤ

اس نظم کو دیکھنے کے بعد یہ اعتراض راشد کی شاعری پر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مایوس کن ہے۔ راشد نے جو فارم اختیار کیا ہے اور اپنی انفرادی حیثیت اردو ادب میں قائم کی ہے۔ وہ اپنی جگہ خوب ہے۔ یعنی اگر واقعی وہ قافیے اور بحور کی قیود کو توڑ دینا اردو شاعری کے لئے مفید خیال کرتے ہیں۔ تو ان کو زیادہ محنت کر کے کام کرنا چاہئے کیونکہ اُن کی

حرص ہماکثر شعرا اسی قسم کی نظم لکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور پنجاب کے اکثر رسائل ایسی نظموں سے بلبریز نظر آتے ہیں جن کا سر ہوتا ہے نہ پیر۔ نہ آغاز ہوتا ہے نہ انجام۔ ادب میں اس کے بڑھنے کی ذمہ داری یقیناً راشد کے سر ہے جو اس تحریک کے بانی ہیں اور اس بڑھتی ہوئی وبا کے روکنے اور ان مسائل پر کام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

روش۔ تاثیر۔ علی سردار جعفری۔ جواد زیدی۔ جاں نثار اختر۔ رضی مطلبی۔ مخدوم وقار۔

یہ سب شعرا سماج کے تضاد اور ہیجان سے واقف ہیں انھیں زندگی کے ان موڑوں سے واقفیت ہے جہاں انسانیت راہیں بدلتی ہے ان کی تیز نظروں سے انقلاب عالم کی تیزی پوشیدہ نہیں ہے ان کو اپنی منزل معلوم ہے۔ مذہب و اخلاق رسم و رواج سب ان کے سامنے عریاں ہو چکے ہیں۔ موضوع کی کمی نہیں۔ چند غزل گو شعرا کو چھوڑ کر ملک مادر وطن کے ان ہونہار سپوتوں پر نگاہ لگائے ہوئے ہے۔ جن کی ذہنی ترقیوں اور راہوں کا دشوں نے نت نئی راہیں اردو ادب پر کھولی ہیں۔ انسانی دماغوں پر سے صدیوں کا روایتی بوجھ ہٹانا اور زندگی کے صحیح اصول سمجھانا ذہنوں کی تربیت نئی ترکیب پر کرنا اور قدیم بندھنوں کے خلاف قدم اٹھانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ لیکن شعرا نے متحد طور پر مفلوج ناکارہ لیکن ذہنیت قدامت کے خلاف قدم اٹھایا اور زندگی کے پیکر میں نئی روح دوڑا دی۔

جوش کی "ضعیفہ" "بھوکا ہندوستان" ساغر کی "بھارت ماتا کی بھیک" مجاز کی "نوجوان خاتون سے" وغیرہ۔ ہماری جدید شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ یہ ہے اردو شاعری اور اس کا ارتقائی مرکز نہیں کہا جاسکتا یہ ترقی اب کس منزل پر جا کر دم لے گی۔

باتیں

(از محترمہ کنیز فاطمہ خاتون حیا لکھنوی)

دلِ پرسوز و ساز کی باتیں
اُف وہ راز و نیاز کی باتیں

خونِ ارماں کا حال کیا جانے
ہائے اس بے نیاز کی باتیں

ہونے دیتی نہیں سکون نصیب
دلِ فتنہ طراز کی باتیں

کرتی ہیں نیند مجھ سے کوسوں دُور
نرگسِ نیم باز کی باتیں

ہر گھڑی رنج و غم کا دھڑکا ہے
بس یہی اب ہیں راز کی باتیں

نہیں سُننے کو ہوتے ہیں تیار
ہم سے سوز و گداز کی باتیں

شامِ فرقت دراز اسپہ حیاؔ
شمع شعلہ طراز کی باتیں

معراجِ محبّت!

(سانیٹ)

(از محترمہ آدا بدایونی)

آنسو کی طرح نازک و نادان ہے محبّت!
معصوم و حسیں قلب میں کاشانہ ہے اس کا
ہر دیدۂ مشتاق پر یحنانہ ہے اس کا
اظہارِ محبت سے گریزاں ہے محبّت!
آسودہ رہے خواب میں معصوم جوانی
ہاں زینتِ مژگاں رہے یہ شمعِ فروزاں
مٹّی میں نہ مل جائے کہیں گوہرِ تاباں
بھیگی ہوئی پلکیں ہیں محبت کی کہانی
ناقابلِ انکار ہے اشکوں کی صداقت
آجائے گہن میں نہ ترا ماہِ درخشاں
پاکیزگی معراجِ محبّت ہے مری جاں!
مجروح نہ ہو جائے محبّت کی لطافت
آغوشِ تمنّا میں نہ سو جائے محبّت
شرمندۂ الفاظ نہ ہو جائے محبّت

عورت کا انتقام

(از محترمہ ایف۔ اختر بٹ صاحبہ)

یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے اور اس کا تعلق پنجاب کے جنوبی مغربی اضلاع سے ہے۔ اور ناموں کی تبدیلی کے بعد قارئین ادیب کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ایف۔ اختر بٹ

برسات کا موسم تھا۔ دریا کی متلاطم امواج دیوانہ وار لہراتی بل کھاتی ایک دوسرے سے ٹکراتی چلی جا رہی تھیں۔ حدِ نظر تک پانی ہی پانی پھیلا ہوا تھا۔ شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ تمام کائنات پر مسلط ہو رہا تھا۔ مریم ملاحوں کے سردار چھموں کی لڑکی اس سمے دریا کے کنارے بیٹھی کسی کی آمد کی منتظر تھی ——— دُور جہاں آسمان و زمین ملتے نظر آتے ہیں۔ ایک توانا اور مضبوط جسم کا سایہ کسی کشتی کو کھیتا نظر آ رہا تھا۔ مریم نے اس کو دیکھا اور پھر خود بخود شرما گئی۔ یہ باقر تھا اُس کا چچا زاد اور منگیتر ——— اس کا ہونے والا مجازی خدا ———

مریم سترہ سالہ خوبصورت دوشیزہ تھی۔ اُس کے خاندان کا آبائی پیشہ کشتی بانی تھا۔ آج کشتی کی واپسی میں دیر ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ دریا کے کنارے آ بیٹھی تھی اور سراپا انتظار بنی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی ——— باقر اور اس کا والد دونوں کشتی میں تھے۔ وہم اور خوف کے مخلوط جذبات مریم کے چہرے سے عیاں تھے۔ لیکن اب باقر کو صحیح سلامت دیکھ کر مسرت کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ اور اس کا دل ایک گونہ شادمانی محسوس کر رہا تھا۔ اور ایک عالم وارفتگی طاری ہو رہا تھا۔ اسی عالم میں اُس نے زیرِ لب "ماہیا" گنگنانا شروع کر دیا۔

وہ واپس جانے کے لئے اُٹھی۔ بالکل ایک ہرنی کی طرح جو قلانچیں بھرنے سے پہلے اپنے جسم کو تولتی ہے۔ مریم نے اپنے سر پر سے ڈھلکے ہوئے موتی ململ کے رنگین دوپٹے کو درست کرتے ہوئے اپنے جسم میں ہلکی سی دلفریب لرزش پیدا کی ——— جوانی، حُسن اور پھر ایک دیہاتی عورت ایک بجلی ہوتی ہے بے پناہ۔ ایک شعلہ ہوتا ہے عُریاں۔

دو فرلانگ پر اس کا گاؤں تھا احمد نگر! مویشیوں کے ریوڑ مختلف اطراف سے گرد و غبار کا طوفان برپا کرتے گاؤں کو لوٹ رہے تھے۔ وہ بھی مسکراتی گاتی، جوانی کی مدہوش کن اداؤں سے کھیلتی ہوئی گاؤں کو چل جا رہی تھی۔ مگر ابھی نصف راستہ بھی طے نہ کیا تھا کہ مغربی جانب سے گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سنائی دی۔ آہستہ آہستہ یہ آواز قریب تر ہوتی گئی۔ اور آخر کار ایک حسین نوجوان ایک اعلےٰ خوبصورت گھوڑے پر جو اعلےٰ قسم کے ساز و سامان سے مزین تھا سوار پہنچ گیا۔ مریم ایک ہرنی کی طرح ٹھٹھکی اور عین اس وقت نوجوان نے نظر بھر کر ——— ان نظروں سے جن میں اس کے جسم کا تمام اشتیاق گویا کھنچ کر آ گیا تھا ——— مریم کی نگاہیں بیباک تھیں۔ مگر یہ بیباکی اس بے حجابی سے بہت مختلف تھی جس سے انسان شہر میں دوچار رہتا ہے۔ نوجوان کے ہاتھ سے بید چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ ایک دو لمحے بے اختیاری کے عالم میں اس نے مریم کی طرف دیکھا۔ پھر گھوڑے کو تھام کر بید کو اُٹھانے کے لئے نیچے اُتر آیا۔

"یہاں سے نور پور کتنے فاصلہ پر ہے"؟ نوجوان نے اچانک مریم سے سوال کیا۔

"نور پور؟" مریم نے اپنی نیم وا آنکھوں سے نوجوان کے شاندار طرّے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم کیا جانیں"۔ اس بے باکی اور بے تکلّفی سے جو پنجاب کے جنوب مغربی اضلاع کے دیہات میں عام ملتی ہے۔

نوجوان بھی مسکرا دیا۔

"تمہارا نام؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"مریم چھمو ملّاح کی بیٹی"

"اور تمہارا نام کیا ہے"؟

"تم پوچھ کر کیا کرو گی"؟

"تم نے کیوں پوچھا"؟

"میرا نام اسلم ہے"

"اسلم!" دوشیزہ نے ایک مرتبہ دُہرایا۔ "کہاں رہتے ہو؟" نوجوان کا خوبصورت چہرہ، خوبصورت لباس، خوبصورت گھوڑا اور خوبصورت زین گویا مریم پر چھائے جا رہے تھے۔

"نور پور"

"نور پور! جہاں عدالت لگتی ہے"

"عدالت، اور اگر مریم کو معلوم ہو جائے کہ عدالت کرنے والا قانون کا محافظ فرمانِ بالا از فہم۔ خوفناک اور پُرہیبت ہستی اس کے سامنے کھڑی ہے۔

تو پھر کیا ہوا" اسلم نے دل ہی دل میں کہا اور جواب دیا -

"ہاں وہیں رہتا ہوں"

مریم نے شمال مشرق کی طرف اشارہ کیا - اپنے خوبصورت سڈول دلبرانے بازو کو شانے کے برابر اٹھایا اور پھر کہنی کے قریب خفیف سا خم دیتے ہوئے انگلی کو سیدھا کیا اور خلا میں دیکھتے ہوئے کہنے لگی -

"دیکھئے وہ بڑا سا کیکر، جو چھوٹی سی بیری کے پاس ہے - درختوں کے اس جھنڈ کے پاس - اس سے پرے نور پور ہے -"

اسلم خاک نہ سمجھا - اس نے مریم کی انگلی کے ساتھ ساتھ دیکھنا شروع کیا - مگر اسے نہ تو بڑا کیکر اور نہ چھوٹی بیری نظر آئی -

"میں سمجھ گیا - امید ہے کل راستہ نہ بھول سکوں گا" اسلم نے مریم پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہا - کہ وہ کل بھی اسی راستہ سے گذرے گا -

اسلم گھوڑے پر سوار ہو گیا اور مریم اپنے گاؤں کو چل دی - مگر دونوں کے دلوں میں ایک عجیب قسم کی خلش باقی تھی - مریم کو اس نوجوان کی شان نے حیران سا کر دیا تھا - اور اسلم کو مریم کے حسن اور جوانی نے مبہوت بنا دیا تھا -

اسلم ایک متمول زمیندار کا لڑکا تھا - اس کے والد نے عرصہ ہوا کہ مریم کے گاؤں سے تقریباً چار میل کے فاصلہ پر ایک وسیع رقبہ خرید کیا تھا - مگر اسلم آجتک لاہور میں رہا تھا - اس نے وہیں پرورش پائی تھی - اور اب چند ماہ ہوئے لاہور سے فارغ التحصیل ہو کر اس جگہ آگیا تھا - چونکہ فکر معاش سے بے نیاز تھا اس لئے والد کے اثر و رسوخ سے وہ نور پور میں آنریری مجسٹریٹ ہو گیا تھا اور اسی عدالت کی طرف مریم کا اشارہ تھا -

مریم اور اسلم دونوں رات بھر بےچین رہے - اسلم نے لاہور میں رہ کر حسن کو ہر رنگ میں دیکھا تھا مگر شہر کا حسن مریم کے حسن سے کس قدر کمتر تھا - لاہور کی رنگین و دلکش صحبتوں کے بعد اسلم اچانک نور پور جیسی دور افتادہ جگہ پر آگیا تھا - وہ اب طالب علمی کی غیر ذمہ دار زندگی سے نکل کر کارزار حیات میں داخل ہو رہا تھا - اگرچہ وہ چاہتا تھا کہ لاہور کو کبھی خیرباد نہ کہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی رنگینیوں میں کھویا رہے - مگر والد کا حکم تھا جس سے سرتابی ممکن نہ تھی -

نور پور میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی - اس لئے اس کی زندگی خشک اور بےکیف سی ہوئی جا رہی تھی کہ اچانک قدرت نے مریم کو اس کے راستہ میں لا پھینکا -

وہ رات بھر سوچتا رہا جنگل کی وحشی ہرنی - اس کے لئے کس قسم کے جال کی ضرورت ہوگی - بہت سخت اور مضبوط - ورنہ وہ اس کو توڑ دے گی - اس کی دھجیاں اڑا دے گی - اس کے بازوؤں میں طاقت تھی -

بیوقوف اسلم! اس نے اپنی تمام زندگی شہر میں گذاری تھی - اور وہ بھی لاہور جیسے شہر میں - جہاں ہر چیز پر غلاف چڑھا رہتا ہے - جہاں چہرے کی جھریوں کو پوڈر اور غازے سے چھپایا جاتا ہے - لبوں کی بدزیبی کو سرخی سے مٹایا جاتا ہے جسم کے اعضا کی بدنمائی کو تنگ اور چست لباس میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے - دل کے زہر کو زبان کی شیرینی سے ظاہر نہیں ہونے دیا جاتا - دماغ کی سازشوں کو ایک دلفریب تبسم میں لپیٹ دیا جاتا ہے - جہاں دل دلوں سے کھیلتے ہیں - دماغ دماغوں سے ٹکراتے ہیں - ایک دوسرے سے فریب اور دھوکہ میں سبقت لے جانے کے لئے -

مریم گاؤں کی رہنے والی تھی - سیدھی سادی - بھولی بھالی - جہاں محبت تھی فریب نہ تھا عشق تھا دھوکا نہ تھا - جہاں کی عورتیں محبت کرنے کے بعد سب کچھ برباد کر دیتی ہیں، اور جہاں کے مرد عورت کے ساتھ محض ایک کھیل کھیلنا جانتے تھے - .... خون کی ہولی -

دوسری طرف مریم رات بھر جاگتی رہی - اسلم کا خوبصورت چہرہ - خوبصورت جسم - اعلیٰ لباس، اچھلتا کودتا گھوڑا .... اس نے ایک خواب دیکھا .... اسلم اسی گھوڑے پر سوار تیزی سے آیا - بھاگتے ہوئے گھوڑے پر سے اس نے اپنے مضبوط بازوؤں سے مریم کو ایک ہی جنبش کے ساتھ اپنے پیچھے گھوڑے پر سوار کر لیا - اور پھر وہ دونوں گھوڑے پر سوار ہوا سے باتیں کرتے ہوئے چلے گئے .... دور .... بہت دور ....

وہ کانپ کر جاگ اٹھی کس قدر عجیب خواب تھا - کاش اسلم اس کو یونہی اڑا کر لیجائے .... دیہاتی عورت کو دو چیزیں بہت پسند ہیں - جوانمردی اور نمائش -

اگلے روز شام کے وقت مریم کے پاؤں خود بخود دریا کی طرف چل دیئے - اور اسلم کے گھوڑے کا منہ بھی اسی طرف ہو گیا - دونوں گذشتہ شام والے مقام اور وقت پر ایسے ملے گویا محض اتفاق تھا - مریم کے قدم اور اسلم کا گھوڑا بیک وقت رکے -

"مریم تم آج پھر اس طرف کیسے آگئیں؟" اسلم نے پوچھا -

"اور تم کیسے آگئے ہو؟" مریم نے مسکراتے ہوئے سوال کیا -

اسلم کو لاہور کے تجربے نے خوب سکھلا دیا تھا کہ عورت کے معاملہ میں کامیابی کا سب سے بڑا راز جرأت ہے۔ صرف موقع محل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ سب سے اچھا موقع تھا۔

"تمہیں دیکھنے!" اس نے فوراً جواب دیا۔ "اور تم" اور اس نے مسکراتے ہوئے مریم سے سوال کیا۔

"میں ــــــ میں تمہیں دیکھنے" کس قدر فیصلہ کن جواب تھا۔ اور کس قدر مختصر اظہار محبت۔

اسلم اس جواب کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ وحشی ہرنی اس قدر جلدی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی گود میں آگرے گی۔ مگر اسے کیا معلوم کہ دیہاتی عورت تمہید اور دیباچہ کی قائل نہیں ہوتی ہے۔ وہ ؎

"بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق"

کی زندہ مثال ہوتی ہے۔

یہاں شہر کی بے حجاب۔ حسینوں کی طرح چائے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوٹل اور سینماؤں کی حاجت نہیں ہے۔ موسیقی غیر ضروری ہے۔ لوچدار اور پرتصنع قہقہے نہیں ہیں۔ سرمئی آنکھوں کی جھپک نہیں ہے۔ معطر خطوط نہیں ہیں۔ یہاں عشق و عاشقی۔ الفت و محبت کی کہانی ہے ؎

کوٹھے اتے اِل ماہیا۔ چوری چوری گل سن لے۔ ساڈا تیرے کتے دل ماہیا۔

میں بیان کر دی جاتی ہے اور بس۔

اسلم گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ اگر وہ اس وقت کامیاب نہ ہوسکا تو شاید عمر بھر مریم کو حاصل نہ کر سکے گا۔

"مجھے دیکھنے!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھلا مجھ میں کیا رکھا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"اور مجھ میں کیا رکھا ہے؟" مریم نے کہا۔

"تم۔ مریم۔ تم بہت خوبصورت ہو"

"اور تم، کیا تم کم خوبصورت ہو۔ کبھی تم نے اپنی آنکھیں دیکھی ہیں!" وہ مسکرا رہی تھی۔

اسلم مریم کے نزدیک ہوتا چلا گیا۔ ان کے ایک طرف دور تک دریا پھیلا ہوا تھا۔ دوسری طرف وسیع میدان تھا۔ شام کی تاریکی میں دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اس کے بالکل قریب ہو گیا۔ اس نے اس کے دونوں بازو تھام لئے۔ مریم ایک مسحور جانور کی طرح اسلم کی ہر حرکت کو بغیر مزاحمت کے قبول کرتی رہی۔ اسلم اور بڑھتا گیا یہاں تک کہ اس کا جسم مریم کے جسم کو مس کرنے لگ گیا۔ اس کے رومال سے ولایتی سینٹ کی خوشبو مریم کو مدہوش سا کرنے لگی۔ مریم نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے اسلم کی طرف دیکھا۔ یہ دعوت عمل تھی۔ اسلم نے اپنے جلتے ہوئے لب مریم کے لبوں پر رکھ دیئے۔ مریم نیم جان ہو کر اسلم کے بازوؤں میں گویا گر گئی ؎

ہوس نے کام جاں پایا محبت شرمسار آئی

معلوم نہیں کب تک وہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں پڑے رہے، مگر گھوڑے کی اچانک ہنہناہٹ نے مریم کو ہوشیار کر دیا۔ اور وہ ایک وحشی ہرنی کی طرح اسلم کے بازوؤں سے علیحدہ ہو گئی۔

اسلم نے خوف زدہ آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ انسانی موجودگی سے مطمئن ہو کر وہ گھوڑے پر چڑھنے ہی والا تھا کہ مریم نے اس کے ہاتھ میں کوئی چیز دے دی۔ اسلم نے دیکھا۔ یہ ایک انگوٹھی تھی۔ نقرئی۔ نہایت معمولی جس میں سیاہ رنگ کا ایک چھوٹا نگ لگا ہوا تھا۔ یہ دیہاتی محبوبہ کا "تحفۂ محبت" تھا یعنی "نشانی"

اسلم نے مسکراتے ہوئے مریم کی طرف دیکھا اور کہا۔

"مریم! یہ انگوٹھی میری جان کے ساتھ رہے گی" اور اس نے انگوٹھی کو چوم لیا

مریم نے خواب کی سی حالت میں اپنے گاؤں تک فاصلہ طے کیا۔ وہ کھانا نہ کھا سکی۔ آج وہ اس دنیا میں تھی جہاں انسانی جسم غذا سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے

اسلم پیشہ ور عاشق۔ بناوٹی اظہار عشق میں ماہر اور مریم ستر سال کی کھلنڈری ناسمجھ دہقانی لڑکی۔ بھلا مقابلہ ہی کیا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس طرح بے پناہ محبت کا اظہار کیا کہ مریم وہ سب کچھ کھو بیٹھی جو ایک مرتبہ کھو دینے کے بعد عورت عمر بھر حاصل نہیں کر سکتی۔

مگر وہ خوش تھی۔ اسلم اور وہ دونوں کسی دن گھوڑے پر اڑتے چلے جائیں گے ــــ دور ــــ بہت دور۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ مریم اب مریم نہ تھی بلکہ ایک پروانہ تھا جو شمع پر جل جانا جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے والدین کو اس کا علم ہو گیا تو ایک ہی لمحہ میں اس کا بے جان جسم مچھلیوں کی نذر کر دیا جائے گا۔ مگر بے خوف انجام سے بے خبر بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ سطح کی اس

منزل تک پہنچ گئی جہاں صرف صحرا تھا۔ لق و دق میدان اور ویرانی۔

مریم جس قدر محبت میں دیوانہ ہوتی جا رہی تھی اسلم اسی قدر بیگانگی اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اسلم اُن لوگوں میں سے تھا جو ہر چیز با لخصوص عورت سے بہت جلد اکتا جاتے ہیں۔ وہ نمایش پسند نوجوان جس نے لاہوریئن پرورش پائی تھی کب تک مریم کی محبت کو برداشت کر سکتا تھا۔

ایک ہی قسم کی باتیں - ایک ہی طرح کا فرسودہ اظہار محبت۔ ان کا ہر دن گزشتہ دن کی محض ایک نقل ہوتا تھا۔ اس جگہ لارنس گارڈن۔ شالامار اور شاہدرہ نہ تھا۔ جہاں وہ مریم کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر چہل قدمی کرتا۔ یہاں کوئی نمایش گاہ نہ تھی جہاں مریم اور وہ دونوں سر شام ہلکے ہلکے قہقہے لگاتے گذر جاتے۔ یہاں "ڈارلنگ" اور "مائی لو" کے الفاظ گلے کی کسی نامعلوم جگہ سے بن کر نہ نکلتے تھے۔ یہاں صرف دریا کا کنارہ اور خفیہ ملاقاتیں تھیں۔ اور مریم کی طوفانی محبت جو ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہی تھی۔

مریم اب بھاگ جانا چاہتی تھی اسی گھوڑے پر دُور۔ بہت دُور۔

یہ خفیہ ملاقاتیں کب تک راز رہ سکتی تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ اسلم اس سے شادی کر لے۔ اور کئی مرتبہ جب اس نے اس کا اظہار کیا تو اسلم نے اس کو عمر بھر کے نباہ کا یقین بھی دلا دیا تھا۔ اور بدقسمت مریم یہ فریب خوشی سے کھائے جا رہی تھی۔

وقت گذرتا گیا اور آخر کار اسلم کی ہوس پرست طبیعت مریم سے بالکل سیر ہو گئی۔ اور عین اس وقت مریم کو معلوم ہوا کہ عنقریب اس کے گناہوں کی جیتی جاگتی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے ہوگی۔ وہ مستقبل کے خطرات سے کانپ اُٹھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ اسلم سے سب کچھ کہدے گی۔ اور پھر اپنے گھر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر کہیں دور جا بسے گی۔ اسی شام اسلم کے زانو پر سر رکھے مریم نے اس کو اس وحشت ناک خبر سے آگاہ کر دیا۔ اچانک اس خبر کے سننے سے اسلم کا تبسم مرتعش ہو گیا۔ اور جب مریم نے اس کو آیندہ زندگی کے متعلق اپنی تجویز سے آگاہ کیا۔ اور اس کے وعدے یاد دلائے تو اسلم نے بناوٹی تبسم کے ساتھ اس کو یقین دلایا کہ وہ ہر وقت اس کے لئے تیار رہے۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ایک بے ننگ و نام۔ جاہل۔ بے مایہ اور بے عصمت لڑکی کیونکر پنجاب کے ایک ذی عزت گھرانے کی بہو بن سکتی تھی۔ مریم کی آبروؤں کے خوشنما قلعے آن واحد میں مسمار ہو گئے۔ لیکن اسے پھر بھی یقین نہ آیا۔ اور جب اسلم اگلے روز دریا پر نہ پہنچا تو اس نے یہ کہکر اپنے دل کو تسلی دے لی۔ ہو سکتا ہے آج وہ بعض ناگزیر حالات کے ماتحت نہ آ سکا ہو۔ لیکن اگلے روز بلکہ اس سے اگلے روز بھی وہ نہ آیا۔ اس روز وہ خوب روئی۔ رات کی تاریکی میں دریا کے کنارے جہاں کا ذرہ ذرہ ان کی محبت آمیز ملاقاتوں کا گواہ تھا۔ وہ جی بھر کر روئی۔ اس کو یقین آگیا کہ اب اسلم کبھی نہ آئے گا۔

چند روز کے بعد اس نے نور پور کا قصد کیا۔ مگر وہاں کیا رکھا تھا۔ ایک عالیشان محل کے دروازہ پر چند نوکر تاش کھیل رہے تھے۔ مگر اسلم؟ مریم کو یہ جرأت کہاں کہ وہ اسلم کے متعلق دریافت کرے۔ وہ انتہائی مایوسی کی حالت میں واپس آگئی۔ وہ برباد ہو چکی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر روئی۔ وہیں جہاں آج سے چند روز پیشتر وہ اسلم کے زانو پر سر رکھے خود کو دنیا بھر کی خوش نصیب ہستی تصور کرتی تھی۔

وقت نے ایک خوفناک کروٹ لی۔ ایک شام لیٹے لیٹے مریم نے درد محسوس کیا عجیب و غریب درد۔ اور مستقبل کے خطرات مجسم حقیقت بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ وہ ایک دردناک احساس سے کانپ اٹھی۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ آخر کار اس نے انتہائی پریشانی کے بعد اضطراب کے عالم میں اس فرشتۂ رحمت کی طرف توجہ کی جسے "ماں" کے نام سے پکارا جاتا ہے چنانچہ ماضی کے تمام شرمناک واقعات رُک رُک کر۔ سہم سہم کر شدید درد سے کراہتے ہوئے اُس نے اپنی ماں کو بے کم و کاست سنا دئے۔ ماں نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس وقت وہ "ماں" تھی۔ صرف "ماں" ــــــ آخر کار وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی۔ اور ایک عورت کو لے آئی۔ جو کہ اس نازک وقت میں کچھ مدد دے سکتی تھی۔ رات بھیگ چکی تھی کہ مریم اور اسلم کے اتصال جسمانی کا نتیجہ ایک چیختی چلاتی بچی کی شکل میں برآمد ہوا۔

مریم ایک دوشیزہ سے عورت اور عورت سے ماں بن چکی تھی۔

مریم کی والدہ اس شرمناک منظر کی تاب نہ لا سکی۔ وہ باہر نکل گئی۔ دوسری عورت بھی کہیں چلی گئی تھی۔ درد کے درمیانی وقفہ میں مریم نے ایک نرم گدگدی سی چیز اپنے پہلو میں محسوس کی۔ اس نے ہاتھ سے اُسے ٹٹولا اور پھر تمام حقیقت جو درد اور تکلیف سے وہ کسی حد تک بھول چکی تھی، بجلی کی طرح اس کے سامنے آ گئی۔ اس وقت اس کا ہاتھ معصوم لڑکی کی گردن تک پہنچ چکا تھا۔ اچانک اس کے ہاتھ کی گرفت سخت ہونی شروع ہو گئی۔ مریم کو معلوم نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔ وہ اس وقت ہر چیز کو برباد کرنا چاہتی تھی جس بیرحمی سے اس نے اپنے خاندان

عزت وناموس کو برباد کیا تھا۔ اسی شدت کے ساتھ وہ کائنات کی ہر چیز کو نیست نابود
ردینا چاہتی تھی۔

جب مریم کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ تو مریم بے ہوش تھی اور اس کی بچی
اموش۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دیئے کی مدہم روشنی میں دیکھا۔ مریم کا دایاں ہاتھ
ی گرفت کے ساتھ معصوم بچی کے گلے کو دبائے ہوئے تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ
س کا ہاتھ علیحدہ کیا۔ مگر وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ ننھی بچی پیدا ہونے سے ایک
منٹ بعد مر چکی تھی۔ اپنی ماں کے ہاتھوں قتل ہو چکی تھی۔

اگلے روز ایک نوزائیدہ بچے کی نعش گاؤں کے جوہڑ میں تیر رہی تھی۔
س کو گاؤں کے ایک کمہار نے دیکھا۔ اس نے چوکیدار کو بتایا۔ چوکیدار نے
بردار کو اطلاع دی۔ نمبردار موقع پر گیا۔ چوکیدار کو نعش کی حفاظت پر چھوڑ کر
ود وہ تھانہ پہنچا۔ جہاں حسب ضابطہ رپورٹ درج ہوئی۔ اور دریافت شروع
دی۔ احمد نگر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہاں کیونکر یہ چیز راز رہ سکتی تھی۔ آخرکار
س عورت نے جس کو مریم کی ماں نے امداد کے لئے بلایا تھا بلاکم وکاست تمام
قعات بتا دئے۔ اور وہ راز جس کو مریم نے کئی ماہ تک حرز جاں بنائے رکھا تھا
ہند ہی لمحوں میں بچے بچے کی زبان پر تھا۔

تفتیش کے مراحل بہت جلد طے پا گئے۔ اور قتل عمد کے جرم میں مریم کا
الان کر دیا گیا۔

یہ تھا مریم کے رومان محبت کا انجام ——— کہنے والے جوہر
ر کو صرف "گناہ" اور "ثواب" "نیکی" اور "بدی" کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہیں۔
کہکر اپنے قلب کو تسکین دے لیں۔ مگر کہ مریم نے گناہ کیا تھا اس کی سزا
ی مگر مجھے وہ یہ بتائیں کہ آخر ہر سزا کے لئے عورت ہی کو کیوں منتخب کیا جاتا
ہے۔ ہمارا خود ساختہ سماج اور قانون مرد کو کیوں بری الذمہ قرار دیتا ہے۔ اور
ریب عورت کو ادنیٰ سی حرکت پر بھی گشتنی اور گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے۔
س کے برعکس مرد خواہ گلی گلی کی خاک چھانتا پھرے۔ وہ روز روشن میں گناہ
رتا پھرے لیکن کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ سماج کے
م نہاد ٹھیکیدار مجھے یہ بتلانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ سزا کے لئے غریب
ورناتواں کو ہی کیوں منتخب کیا جاتا ہے۔ "انصاف" "قہر" اور "عدالت" کا
رشتہ دولتمند اور طاقتور کے دروازے تک پہنچنے میں کیوں دیر لگاتا ہے؟
مریم کے لئے اگلا مرحلہ عدالت کا تھا۔ وہ اپنے ماحول سے مانوس ہونے

کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک صبح جیل کی میٹرن نے اس کو اطلاع دی کہ اس روز
اس کی تاریخ پیشی ہے۔ مریم نے پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ میٹرن نے
پھر کہا۔ "آج تمہیں عدالت میں پیش ہونا ہے۔"

عدالت۔ مریم پھر بھی نہ سمجھ سکی۔ یہ خبر مریم کے فہم وادراک سے بہت دور
تھی اس کو یہ معلوم تھا کہ اسے اپنی ناجائز بچی کے قتل میں گرفتار کیا گیا ہے مگر اب
کیا ہوگا۔ اس کا جواب دینے سے دماغ عاری تھا۔

دس بجنے والے تھے کہ مریم کو جیل سے نکالا گیا۔ وہ عدالت جا رہی تھی۔
یعنی "نورپور" جہاں عدالت لگی تھی۔ جہاں اسلم رہتا تھا۔ یہ تمام واقعات ایک
لمحے میں مریم کے دماغ میں پھر گئے۔ اسلم کی یاد پھر بغاوت کا ایک طوفان اس کے
دماغ میں اٹھا۔ مگر اس کا اظہار چند آنسو تھے۔

انہی خیالات میں کھوئی ہوئی گرد و پیش سے بے خبر کسی اور دنیا میں
آنکھوں اور کانوں کو بند کئے ہوئے وہ کمرۂ عدالت میں داخل ہوئی۔

اچانک آواز بلند ہوئی۔

"ملزمہ کا نام"

مریم یک لخت تڑپ اٹھی۔ یہ اسلم کی آواز تھی۔ اس کے محبوب کی جس
نے ثمر محبت کو قتل کرنے کے الزام میں مریم کے خلاف مقدمہ چل رہا تھا۔ یا اس
نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھا۔ اور نظر کھڑا کرنے ہی ڈالی تھی کہ سپاہی
نے تھام لیا۔ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر اسلم کرسی عدالت پر بیٹھا تھا۔

ایک ہلکی سی چیخ مریم کے منہ سے نکل گئی۔ اور اسلم نے بغیر اس کی طرف دیکھے
کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"مسمات مریم دختر چھموں عمر ۲۵ سال۔ ساکن احمد نگر حراست پولیس
حاضر ہے۔ کارروائی عدالت شروع ہوتی ہے۔"

اب مریم کا تمام جسم ایک جذبۂ بغاوت سے کانپ اٹھا۔ اس کے دل میں
نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ "فریبی ریاکار ظالم" اسلم جس کی خاطر اس نے
اپنا سب کچھ برباد کر دیا تھا۔ جو اس جرم کا حقیقی ذمہ دار تھا۔ اب فرشتۂ انصاف
بن کر اس کا فیصلہ کر رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ
وہ چیخ چیخ کر تمام دنیا کے سامنے اعتراف گناہ کرے۔ اور پھر اس شخص کی جو اس
قانون اور انصاف کی ترازو ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ تمام حقیقت کو طشت از بام
کر دے۔ مگر ——— وہ عورت تھی ——— بے یار و مددگار ———

عدالت کی ہیبت نے اس کے لبوں پر مُہر لگا دی تھی۔

مقدمہ کی سماعت ہوتی رہی مگر مریم نے عدالت کی کارروائی میں کوئی حصّہ نہ لیا۔ جس طرح ملاح کشتی کی سلامتی سے بالکل مایوس ہوکر اس کو طوفان کی موجوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اسی طرح مریم نے انتہائی مایوسی کے عالم میں انجام کو قدرت کے سپرد کر دیا تھا۔

تقریباً ایک ماہ کے بعد اسلم نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ملزمہ کے خلاف قتل عمد کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ مگر اخفائے ولادت کا جرم ثابت تھا۔ لہٰذا مریم کو اٹھارہ ماہ قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

مریم نے سزا کو خاموشی سے سُنا اور باہر نکل گئی۔

اسلم کے اس فیصلہ کو گرد و نواح میں بہت سراہا گیا۔ ایک اخبار نے اس کے حسب ذیل فیصلہ کے اقتباس کی بہت تعریف کی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ملزمہ نوجوان ہے۔ مگر جس جرم کا ارتکاب اس نے کیا ہے ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ فیصلہ کرتے وقت رحم کے جذبات کو دخل دینے کی اجازت دی جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ مس پر قتل عمد کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ کیونکہ ڈاکٹری ملاحظہ پر وجہ مرگ معلوم نہ ہوسکی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ بدنامی کے خوف سے ملزمہ نے اپنی ناجائز بچّی کو نہایت بے رحمی سے قتل کر دیا۔

اس قماش کی ارزاں اور رذیل یہ عورتیں جو چاندی کے چند ٹکڑوں کے لئے اپنی عصمت کو فروخت کر دیتی ہیں ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے کسی قسم کی رعایت روا رکھی جائے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم لوگ سائٹی کو اس قسم کی عورتوں سے جلد از جلد پاک کر دیں۔ مُلک اور قوم کی اس میں بہتری ہے"

دیکھا آپ نے اس کا نام ہے سماج۔ اس کو کہتے ہیں قوم اور ملک کی بہتری۔ یہ حال ہے ہمارے سماج کے ٹھیکیداروں کا۔ دل چاہتا ہے کہ اس سماج کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دی جائیں۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس چیز کا قلع قمع کر دیا جائے۔ لیکن واتے بر حال ما! مجبوری نیز دوسرا نام عورت ہے۔ قانون اور انصاف بھی تو مرد ہی کے غلام ہیں۔

مریم ڈیڑھ سال تک قید و بند کی مصیبتیں جھیلتی رہی۔ جب رہا ہوئی۔ تو اب وہ پہلی سی مریم نہ تھی اس کے روئیں روئیں میں مرد کے خلاف نفرت۔ حقارت اور بغاوت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ مرد سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس کی دنیائے آرزو کو مسمار کر دینا چاہتی تھی۔ چاہتی تھی کہ بھوکی شیرنی کی طرح اس کو کچا ہی چبا ڈالے تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ عورت جب ایک چیز کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ تو اپنے عزم کی تکمیل میں اپنی راہ میں ہر حائل ہونے والی چیز کو مَسَل دیتی ہے۔ عورت کی محبت جب نفرت سے بدل جائے تو مرد کے لئے یہ دنیا جہنم کا نمونہ بنا دیتی ہے۔ جیل میں ہی اس نے اسلم سے انتقام لینے کیلئے اپنا پروگرام بنا لیا تھا۔ اب آہستہ آہستہ اس نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

آج کل لاہور کے پربھات سینما میں کچھ دنوں سے مس کسم نامی ایک رقاصہ آئی ہوئی ہے۔ نازک بدن۔ نازک ادا۔ مرمریں باہیں۔ غزالی آنکھیں۔ لانبے لانبے گھنگھریالے بال لوگوں کے لئے ایک گونہ جاذبیت رکھتے ہیں۔ روزانہ پربھات کا ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ صدہا آدمی روزانہ ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے واپس چلے جاتے ہیں۔ حسن کے فدائی پروانہ وار کسم کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں اور بعض تو اس کو اپنے پنجۂ ہوس کا شکار بنانے کی فکر میں ہیں۔ الغرض لاہور میں بچے بچے کی زبان پر کسم کا نام ہے۔ ہوتے ہوتے یہ تعریف اسلم کے کانوں میں بھی پہنچی۔ دوسرے ہی دن کسم کا رقص دیکھنے کے لئے لاہور پہنچا۔ اور خوب محظوظ ہوا۔ ایک ہی نظر میں اپنا دل کسم کے حوالے کر دیا۔ اب روزانہ اس کا دستور ہو گیا کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتا۔ کہنے کو تو وہ رقص کا لطف اٹھانے میں مصروف ہوتا۔ لیکن فی الحقیقت اس کا دل و دماغ پریشان کن خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا۔ وہ کسم کو حاصل کرنے کی تدابیر سوچا کرتا۔ آخرکار ایک دن اس نے کسم کی جائے قیام کا پتہ لگا لیا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ سٹیفلز میں مقیم ہے۔ اس کو دل ہی دل میں بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ سٹیفلز کا منیجر اس کا دوست تھا۔ اور وہ اس کے ذریعے سے کسم کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اگلے ہی روز وہ بن ٹھن کر اپنے دوست کے پاس جا پہنچا۔ منیجر اس کو بڑے تپاک سے ملا۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد اسلم نے حرف مدعا کہدیا۔ لیکن جب منیجر نے اسے بتایا کہ یہاں روزانہ بڑے بڑے رؤسا اور عمائدین شہر طوافِ حریم حسن کرتے ہیں۔ لیکن وہ تو کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ تو اس کی آرزوؤں پر گویا بجلی سی گر گئی۔ لیکن پھر بھی وہ مایوس نہ ہوا۔ اس نے عزم کر لیا تھا کہ کسم کو ضرور حاصل کر کے رہیگا۔ وہ روزانہ سینما جاتا۔ سٹیفلز کے چکر کاٹتا۔ اپنے دوست منیجر سے اُسے حاصل کرنے کے پروگرام بناتا۔ لیکن کسی طرح بھی کامیابی نہ ہوئی۔

ایک شام اس نے تہیہ کر لیا کہ آج وہ ضرور کسم سے مل کر رہیگا۔ چنانچہ وہ رقص دیکھنے نہیں گیا۔ بلکہ ہوٹل میں منیجر کے پاس بیٹھکر اس کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً ساڑھے بارہ بجے کسم واپس اپنی قیام گاہ پر آئی۔ وہ پہلے ہی منتظر تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جونہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ بھی دروازے پر جا کھڑا ہوا اور کہنے لگا "مس کسم کیا میں اندر آسکتا ہوں"

کسم نے مڑ کر ایک بار نگاہیں اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اور کچھ حیرت واستعجاب اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ یہ کہکر کمرے میں داخل ہوئی "ہاں ہاں۔ بڑی خوشی سے" کسم نے اس کو ڈرائنگ روم میں لے جاکر بٹھا دیا۔ اور خود یہ کہکر "تشریف رکھئے میں ابھی حاضر ہوئی" لباس تبدیل کرنے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں ہنستی ہوئی داخل ہوئی اور کہنے لگی "معاف کیجئے گا مجھے چند منٹ کی دیر ہوگئی۔ اور آپ کو انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑی"

اسلم۔ نہیں نہیں مس کسم۔ کوئی بات نہیں۔

کسم۔ کہئے۔ کیسے تکلیف فرمائی۔

اسلم۔ بس یونہی چلا آیا ...... بات یہ تھی کہ .... میں آپ کا رقص روزانہ دیکھتا ہوں۔ اور ہر بار تقریباً ایک گونہ نئی جاذبیت اور دلکشی پاتا ہوں۔ دل چاہتا تھا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ہدیہ داد پیش کروں۔

کسم۔ یہ تو سب آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ میں کس قابل ہوں۔

اسلم۔ مجھے آپ سے مل کر دلی مسرت حاصل ہوئی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس تکلیف دہی پر معاف فرمائیں گی۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔

کسم۔ نہیں نہیں، تشریف رکھئے، ابھی کھانا منگواتی ہوں۔ کھا کر جائیگا۔

اسلم۔ شکریہ۔ معافی چاہتا ہوں....... دراصل میں کھانا کھا کر آیا تھا۔ اچھا پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔

کسم۔ اچھا۔ اب آپ جانے پر مصر ہیں۔ تو میں بھلا آپ کو کیسے روک سکتی ہوں۔ (پھر دونوں ہنس پڑے)

اسلم۔ آداب عرض۔

کسم۔ آداب عرض۔

یہ تھی اسلم اور کسم کی پہلی مختصر سی ملاقات۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھا۔ اس نے امیدوں کے کئی خوشنما قلعے بنا لئے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور کسم کو حاصل کرے گا۔ کیونکہ پہلی ہی ملاقات میں کسم اس کی گرویدہ نظر آتی تھی حالانکہ وہ دوسروں کو خاطر میں بھی نہ لاتی تھی۔ وہ ہنستا ہوا منیجر کے پاس گیا۔ اور اپنی کامیابی کی خوش خبری سنائی۔ منیجر نے اس کو مبارکباد دی۔

اب روزانہ اسلم کا دستور ہوگیا کہ وہ صبح اور شام بلکہ دوپہر کو بھی کسم کے دولتکدہ ناز پر حاضر ہوتا اور دو چار گھڑی گفتگو کرنے کے بعد واپس چلا آتا۔ رفتہ رفتہ یہ ملاقاتیں بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ وہ گھنٹوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے راز و نیاز کی گفتگو میں مشغول رہتے۔ ہنستے۔ قہقہے لگاتے۔ اسلم روزانہ کسم کے لئے طرح طرح کے تحائف لے جاتا۔ اور وہ اسے بڑی خوشی سے قبول کرتی۔ الغرض اسلم کسم کی خاطر سب کچھ لٹا بیٹھا۔ لیکن ابھی تک اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی۔ وہ کسم پر دیوانہ وار فدا تھا۔ وہ اس کی محبت میں سب کچھ بھلا بیٹھا۔ گھر گئے ہوئے اسے کتنے ہی مہینے ہو گئے۔ کئی خط گھر سے آئے۔ لیکن اس نے کبھی کسی کا خاص جواب نہ دیا۔ وہ تو اپنے دل کی ملکہ کسم کے پاس رہنا چاہتا تھا۔

چند دنوں کے بعد اس پر اس خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ کسم منیجر ہوٹل سے بھی محبت کرتی ہے۔ یہ چیز اس کو سخت ناگوار گزری۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دل کی ملکہ کسی دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ پھر بھلا وہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ کسم منیجر سے محبت کرے۔ اس کا دل کسم سے متنفر ہوگیا۔ وہ اب اس تلاش میں رہنے لگا کہ کسی طرح ان دونوں یعنی کسم اور منیجر میں سے ایک کا خاتمہ کر دیا جائے۔ آخر ایک رات تقریباً بارہ جب منیجر اور کسم بیٹھے راز و نیاز کی گفتگو میں مشغول تھے، وہ کسم کے کمرہ میں داخل ہوا۔ پہلے تو اس نے کسم کو پستول کا نشانہ بنانا چاہا۔ لیکن نہ جانے پھر کیا سوچ کر اس نے منیجر پر فائر کر دیا۔ پستول کی آواز سن کر ہوٹل کے ملازم دوڑتے ہوئے آئے۔ انھوں نے منیجر کو مردہ پایا۔ فوراً ملزم کی تلاش شروع ہوئی۔ اسلم پکڑا گیا اور پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ کسم کو جب ہوش آیا تو دیوانہ وار کھکھلا کر گھنٹوں ہنستی رہی!

پولیس نے اسلم پر قتل عمد کے جرم میں مقدمہ چلایا۔ کسم اس میں بطور گواہ پیش ہوئی۔ اس نے اسلم کے خلاف شہادت دی۔ مجسٹریٹ نے اسلم کو پھانسی کی سزا دیدی۔ اس کے بعد ہر چند اس نے عدالت عالیہ میں اپیل بھی کی۔ لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی اور پھانسی کی سزا بحال رہی۔

اب اسلم جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں اپنی موت کا منتظر تھا اسے اپنی موت بھیانک روپ میں نظر آتی۔ وہ راتوں کو اچانک بیدار ہو جاتا۔ اور سہمی سہمی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا۔ اس کا وہم موت کے شکاری کی مختلف صورتیں تبدیل کرکے اس کے سامنے آتا۔ وہ ڈر جاتا۔ پہروں خوف سے لرزتا رہتا۔ اب موت کا ایک معمولی سا تصور بھی اس کے دل و دماغ کو مختل کئے جا رہا تھا۔ اس کی راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ وہ سوچتا وہ کیا سے کیا بن گیا تھا۔

پھانسی کے دن سے ایک روز پہلے کُلثُم اس سے ملنے کے لئے آئی۔ کلثم کے پردے میں مریم نے اپنا انتقام لیا۔ اس انکشاف نے اسلم کو مبہوت کر دیا۔ وہی مریم جس کی دنیا تباہ کرکے چلا گیا تھا۔ ہاں وہی مریم جسے وہ بے ننگ و نام سمجھ کر چھوڑ چکا تھا۔ اس پر سکتہ کا سا عالم طاری تھا۔ وہ دیوانہ وار پھٹی پھٹی آنکھوں سے مریم کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ تک بھی نہ نکل سکا اور مریم کے لبوں پر ایک بے نام سا تبسم تھا——

آج وہ اپنا انتقام لے چکی تھی——

حسّاس دل

(از محترمہ اختر قریشی، بی۔اے۔ بی۔ٹی)

میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ کتاب بند کردی اور تھکی ہوئی نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی.......

آفتاب آہستہ آہستہ مغربی افق میں غروب ہو رہا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں کائنات پر غازہ سال رہی تھیں۔ دُور سامنے برگد کے پُرانے درخت پر بسیرا کرنے والے طیور نے ایک شور مچا رکھا تھا۔ باہر کھڑکی کے دونوں طرف زرد گلاب کی بیل پھیلی ہوئی تھی جس کے بڑے بڑے خوش رنگ پھول کھڑکی کے شیشوں پر چھائے ہوئے تھے۔ ایک تر و تازہ دہری سی زرد کلی جو کھل کر پھول بننے والی تھی نیم وا آنکھوں سے کمرے میں جھانک کر مسکرا رہی تھی۔ چمکیلی زعفرانی رنگ کی ایک ننھی تتلی جو اس معطر کلی پر دیر سے پر جوڑے بیٹھی تھی خود بھی پھول کی ایک پنکھڑی معلوم ہو رہی تھی...... میں ایک محویت کے عالم میں آگے بڑھی ...... خفیف سی سرسراہٹ ہوئی اور بادۂ گل سے مدہوش تتلی اپنے رنگین پر ہواؤں میں لہرانے لگی...... اور چند لمحہ بعد پھر اسی نشیلے انداز میں جھومتی ہوئی کلی پر آکر جم گئی...... میں دبے پاؤں پیچھے ہٹی اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہلکی ہلکی تاریکی کمرے میں چھائے ہوئے تھی۔.........

...... میرے دل پر وحشت سی ہونے لگی...... عصر مغرب کے درمیان کا وقت ...... نزع کا سا عالم...... خدا جانے یہ وقت کاٹنا میرے لئے کیوں مصیبت ہو جاتا ہے میں نے کمرے کے ایک گوشے میں جا کر برقی بٹن کو دبایا۔ ایک بڑا سا جھاڑ روشن ہو کر جگمگانے لگا۔ لیکن اس کی زرد زرد پھیکی روشنی سے کمرے کا دھندلکا دور نہ ہو سکا کیونکہ ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں ہنوز مغربی اُفق سے دنیا کو جھانک رہی تھیں۔

میں پریشان ہو کر باہر باغ میں نکل آئی فیض کاٹج کی شاندار دو منزلہ عمارت سامنے نظر آنے لگی۔

فیض ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مغربی تہذیب و تمدن کا دلدادہ نوجوان تھا۔ ایک کامیاب بیرسٹر ہونے کے علاوہ وہ اپنے مرحوم چچا نیّر جمال کی لاکھوں کی جائداد کا تنہا وارث تھا۔ صورت شکل میں [illegible] سے ہزاروں پر فوقیت حاصل تھی۔ وہ مردانہ حسن کا کامل نمونہ تھا۔ سوسائٹی میں وہ اس قدر ہر دلعزیز تھا کہ جس پارٹی یا ڈنر میں وہ شریک نہ ہو سکتا، سب اس کی کمی محسوس کرتے۔ مختصر یہ کہ اس کی زندگی ہر شخص کے لئے قابلِ رشک تھی اور اس کی شان و امارت سے کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ یوں تو ہر شخص فیض سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے اور فیض کاٹج میں بلائے جانے کا متمنی رہتا لیکن میرے لئے فیض کاٹج میں جو کشش تھی اس کا سبب کچھ اور ہی تھا......

فیض شہلا کا شوہر تھا۔ جو میری عزیز ترین سہیلی تھی۔ دنیا میں اگر میرا کوئی حقیقی ہمدرد تھا تو وہ شہلا تھی اور اگر شہلا کا کوئی سچا مددگار اور غمخوار تھا تو وہ میں تھی۔ اگر فیض کی دولت دوسروں کے لئے قابل رشک تھی تو ہماری باہمی محبت فیض کیلئے بھی باعثِ رشک تھی...... جب میں اپنی اداس تنہائی اور بے کیف زندگی سے گھبرا اُٹھتی تو اس وقت شہلا کے پاس اپنا دل بہلانے چلی جاتی تھی۔ اس کی دلچسپ باتیں اور نقرئی قہقہے میرے دل کی تمام کلفتوں کو دور کر دیتے تھے.... اس کی زندہ دلی اور خوش مزاجی دیکھکر ایک بار میری مردہ روح بھی جاگ اٹھتی تھی۔

...... اس وقت بھی کسی خاص جذبہ کے ماتحت میرے قدم خود بخود فیض کاٹج کی طرف اُٹھنے لگے۔

کوٹھی پر ایک دلفریب سکوت چھایا ہوا تھا۔ باغ میں ہی دُور فاصلے پر فوارے کے نزدیک ایک کرسی پر شہلا بیٹھی تھی میں آہستہ آہستہ اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ اپنے خیالات میں غرق دنیا و مافیہا سے بےخبر تھی۔ آفتاب کی سنہری کرنیں سُرخ پھولوں والی جھاڑی میں سے چھن چھن کر اس کے سیاہ بالوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ اس کے گلابی تر و تازہ رخسار آج زرد زرد کملائے ہوئے نظر آتے تھے۔ دراز ریشمیں پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ یاقوتی لبوں پر جو مخصوص تبسم ہمیشہ کھیلتا رہتا تھا وہ مفقود تھا...... اُف خدا...... میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اسے متوجہ کرنے کے لئے میں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھدیا۔ وہ چونک پڑی۔ اپنی دُکھ بھری سوچ سے سر اُٹھا کر اس نے کھوئی ہوئی نظروں سے میری جانب دیکھا۔ آنسوؤں کے دو قطرے بے اختیار اس کے رخساروں پر بہہ نکلے، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے لب کپکپانے لگے.... بالکل اس طرح جیسے گلاب کی نازک پنکھڑیاں ہوا کے لطیف جھونکے سے تھرتھرائیں

"شہلا!" میں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمھیں آج ہوا کیا ہے؟"

یوں تنہا اس سرد ہوا میں باغ میں کیوں بیٹھی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں یونہی کچھ سوچتے سوچتے دل بھر آیا" اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا" اب میں سمجھی یہ اشکباری "یونہی" ہو رہی ہے" میں نے چھیڑتے ہوئے کہا "اس کے علاوہ تمہیں آتا ہی کیا ہے۔ کوئی ذرا سی بات ہوئی اور تمہارے آنسو نکلے۔ مجھے تو فیض پہ رحم آتا ہے کہ غریب بات کرے تو سوچ سوچ کر تول تول کر اور جو کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکل گئی تو تم رو رو کر برا حال کر لیتی ہو۔ یہ تمہاری بچپن کی عادتیں کبھی جائیں گی بھی یا نہیں"

وہ زیر لب مسکرانے لگی۔

"اور کیا! بھلا تم خود ہی غور کرو" میں نے نصیحت آمیز لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "دن رات چوبیس گھنٹے بھلا ایک شخص کس طرح تصنع اور بناوٹ کی زندگی گزار سکتا ہے کبھی کبھار کوئی بات ہو بھی جاتی ہے تو تمہاری طرح کوئی اس کا غم نہیں کرتا۔"

"تم غلط سمجھیں فرحت" اس نے ایک انداز سے سر اٹھا کر کہا "میرے اور فیض کے درمیان کوئی رنجش نہیں ہوئی۔ وہ بات تو کچھ اور ہے" دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر پھر سسکیاں لینے لگی۔

"کیا احمقانہ حرکت ہے شہلا!! اگر فیض نے تمہیں کچھ کہا نہیں۔ .... کوئی اور بات نہیں۔ ... پھر تم روتی کیوں ہو؟ کیا دنیا کی ہر ایک بات کا سوگ منانے کیلئے تم ہی رہ گئی ہو"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بدستور ہچکیاں لے لے کر روتی رہی۔

"دیکھو تو سہی شہلا" میں نے اسے دوسری طرف متوجہ کرنے کیلئے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "ذرا آنسو پونچھ کر تو دیکھو۔ ... آفتاب بھی غروب ہو گیا ... ننھی کلیاں پتوں کو سہارا لیکر ننھی سی میٹھی نیند سو رہی ہیں .... درخت کیسے چپ چاپ کھڑے ہیں .... دیکھو یہ پیاسا بدمست بھونرا پھول کی پنکھڑیوں میں کیسے آرام سے چھپ کر بیٹھ گیا ہے ... اور وہ ننھا سا نیلا پرندہ جو ابھی شاخوں پر کودتا پھر رہا تھا۔ اپنے گھونسلے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ ..... آؤ ہم بھی اندر چلکر بیٹھیں۔ ہوا میں ناقابل برداشت خنکی پیدا ہو گئی ہے"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ وہ بغیر مزاحمت کے اٹھ کھڑی ہوئی اور خاموشی سے میرے ساتھ ہو لی۔ ہم دونوں اندر بڑے کمرے میں آتشدان کے قریب جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے —— کچھ عرصہ بالکل خاموشی رہی۔ میں نے بھی کچھ گفتگو مناسب نہ سمجھی۔ کیونکہ شہلا کی عادت سے واقف تھی۔ اگر وہ روتی اور کوئی اسے محبت سے سمجھاتا تو پھر اس کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

شہلا ایک نرم اور سچے دل والی۔ حد درجہ نیک۔ زود رنج۔ اور حساس طبیعت کی لڑکی تھی۔ دوسروں کی تکلیف اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ ابھی کچھ عرصہ کی بات ہے کہ ایک حسین نوجوان فقانی بھکارن اندر کوٹھی میں چلی آئی۔ میں بھی اتفاق سے وہیں بیٹھی تھی۔ بھکارن نے اپنی من گھڑت داستان غم کچھ اس طرح سنائی کہ اس کے انداز بیان سے میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ لیکن شہلا نے تو رو رو کر اپنی آنکھیں سرخ کر لیں۔

گو ہر معمولی بات پر رو رو کر شہلا نے اپنے آنسوؤں کی قیمت کم کر دی تھی لیکن پھر بھی نہ معلوم کیوں اس کے آنسو مجھ سے دیکھے نہ جاتے تھے۔ آج بھی میرا یہی خیال تھا کہ کوئی معمولی بات ہو گئی ہو گی جس پر یہ نازک لڑکی آنسو بہا رہی ہے۔

میں نے نظر اٹھا کر شہلا کی جانب دیکھا —— اب وہ خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"دل کی بھڑاس نکل چکی یا کچھ کسر باقی ہے" میں نے ہنسکر کہا "تمہارے تو وہی مثل ہے؟ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" وہ مسکرانے لگی۔

"میں تو تمہارے ہاں دل بہلانے آئی تھی لیکن تمہاری اشکباری نے طبیعت کو اور بھی مکدر کر دیا" میں شکایت بھرے لہجہ میں بولی۔

"کیا کروں فرحت دل سے مجبور ہوں"

"تجربہ سے ثابت ہوا کہ پہلو میں ایک حساس دل بھی بعض وقت مصیبت ہو جاتا ہے"۔ میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں بھی یہی سوچتی ہوں فرحت! کہ یا تو خدا نے میرا دل ایسا نہ بنایا ہوتا یا پھر میری زندگی میں ایسے غیر معمولی واقعات پیش نہ آتے"

"تمہاری زندگی میں ایسے کون سے غیر معمولی واقعات پیش آتے ہیں۔ البتہ یوں کہو کہ ہر معمولی واقعہ پر تم غیر معمولی طور پر آنسو بہاتی ہو۔ وہ تو شکر کرو کہ خوش قسمتی سے تمہارا شوہر ایسا شریف اور قدردان ہے کہ تم جیسی دیوانی لڑکی کو اس قدر اعلیٰ و ارفع ہستی سمجھتا ہے اور اس طرح تمہارا دل ہاتھوں میں رکھتا ہے۔ گویا تم بھی یا شیشہ کی مورت ہو کہ ہاتھ لگنے ہی ٹوٹ جاؤ گی"۔

"مجھے اپنی خوش قسمتی پر تو ذرہ بھر شک نہیں" اس نے مسکرا کر کہا "لیکن اگر انسان خود خوش قسمت ہو تو اسے ان لوگوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے جنہیں قدرت نے بدقسمت بنایا ہے۔ فیض کی پہلی بیوی نشاط ہی کو لو ... آج صبح فیض کی غیر موجودگی میں وہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ بس جب ہی سے برابر اس کا خیال چلا آ رہا ہے۔ ..... خفتہ بخت لڑکی .... یہ عمر ..... اور یہ آلام و مصائب .... افسوس!!! میری خوش قسمتی کی بنیادیں تو اس غریب بے بس لڑکی کی تباہی پر رکھی گئی ہیں۔

میں یہ باتیں سنکر سناٹے میں رہ گئی۔ کیونکہ مجھے بخوبی علم تھا کہ نشاط ایک بد باطن اور چالاک لڑکی ہے اور شہلا سے اس کا ملنا کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہیں۔

نشاط، فیض کی چچا زاد بہن تھی۔ بچپن ہی سے اس کی نسبت فیض سے طے ہو گئی تھی لیکن

فیض کو یہ رشتہ بالکل ناپسند تھا۔ نشاط او راس کی طبیعت میں کوئی مناسبت نہ تھی کیونکہ وہ جاہل تند مزاج اور بد سلیقہ تھی فیض نے ہر چند کوشش کی کہ یہ رشتہ نہ ہو لیکن بزرگوں کا فیصلہ اٹل ثابت ہوا اور والدین کی زبردستی سے فیض کی شادی ولایت جانے سے قبل ہی نشاط سے ہو گئی..... فیض پہلے ہی صاف طور پر یہ کہہ چکا تھا کہ وہ شہلا کو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتا...... چنانچہ وہی نتیجہ ہوا...... انگلینڈ کی واپسی پر تین ماہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ شہلا اس کی دلہن بن گئی۔

نشاط نے طیش میں آ کر گھر چھوڑ دیا اور اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔ اور پھر اس کی کوئی خبر نہ سنی فیض اس کی روپیہ سے مدد کرنی چاہتا تھا۔ قانونی طور پر اُسے آزادی اور مہر دینے کو تیار تھا لیکن اس نے انتہائی نفرت اور حقارت سے دونوں حالتوں کو سختی کیساتھ نامنظور کر دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سنا گیا کہ اس کے والد کا تبادلہ کہیں اور ہو گیا اور وہ وہاں چلی گئی...... گو مدت سے نشاط کی کچھ خیر خبر نہ ملی تھی لیکن ایک مبہم سا خوف ہمیشہ میرے دل پر چھایا رہتا۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ نشاط ان لوگوں میں سے نہیں جو قسمت پر صابر اور شاکر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں..... وہ ان لوگوں میں سے تھی جو ہر حالت میں قسمت سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کو تیار رہتے ہیں..... اور اب جبکہ اس کی خود داری کو ٹھیس لگ چکی تھی مجھے تعجب تھا کہ وہ اتنے عرصہ سے کیوں خاموش بیٹھی ہے...... آج شہلا کی زبانی نشاط کا نام سن کر پھر میرے دل پر ایک خوف طاری ہو گیا میں نے تنبیہاً کہا۔

"تو کیا تم نے نشاط سے ملنا شروع کر دیا ہے؟"

"میں نے کیا ملنا شروع کیا وہ خود ہی میرے پاس آئی تھی بلکہ میں نے تو اسے پہچانا بھی نہیں۔ اس نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔"

مگر تمہیں فیض کی غیر موجودگی میں اس سے ملنا مناسب نہ تھا۔ جانتی ہو وہ سخت خطرناک قسم کی لڑکی ہے اور تم جیسی نادان کو شیشہ میں اُتارنا اس کیلئے کوئی دشوار امر نہیں۔"

"پھر میں کیا کرتی فرحت؟" وہ معصومانہ انداز میں بولی۔

"صاف کہہ دیتیں کہ تم اس سے ملاقات نہیں کر سکتیں...... اور تم سے اس کا واسطہ ہی کیا۔ کہلوا دیا ہوتا کہ اگر کچھ کام ہے تو براہ راست فیض سے گفتگو کرے۔ تمہارے پاس آنے سے کیا مطلب"

"لیکن کام تو اسے مجھ سے تھا فیض سے نہیں" وہ آہستہ سے بولی۔

"کچھ بھی ہو تمہیں لازم تھا کہ ملاقات سے انکار کر دیتیں"۔

"میں اس قدر خود غرض کیسے ہو سکتی ہوں فرحت! ملاقات سے صاف انکار...... گویا اسے بغیر بات کئے گھر سے نکالنا تھا...... میں یہ جرأت کیسے کر سکتی تھی......

آخر وہ بھی کچھ عزت رکھتی ہے..... [illegible] تمام عمر اپنے آپکو معاف نہ کر سکتی......؟

"خیر تمہیں اپنے فعل کا اختیار ہے ہمارا کام تو یہی دینی سمجھا دینا ہے" میں نے قدرے رکھائی سے جواب دیا۔

وہ میرے لہجہ کو تاڑ گئی اور تیزی سے اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس نے اپنی باہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں۔

"تم کتنی جلدی خفا ہو جاتی ہو فرحت!... لیکن غور تو کرو...... آخر میں اس غریب سے بری طرح کیوں پیش آؤں؟...... اس کا جرم کیا ہے؟...... اور اگر ہے تو صرف اتنا جو اس کو جرم کہا جا سکے کہ اس نے خاموشی سے اپنا شوہر میرے حوالہ کر دیا...... کیا یہ بہادری کا کام نہیں ہے؟..... بولو فرحت" اس نے میرے دونوں شانے پکڑ لئے" بولو کیا یہ ہمت کا کام نہیں؟...... اس سے بڑھ کر ایثار و قربانی کی کونسی مثال عورت پیش کر سکتی ہے؟ ...... وہ چاہتی تو ہر وقت کی نیش زنی سے ہماری زیست کو دشوار کر سکتی تھی...... وہ چاہتی تو چین کا ایک سانس لینا ہمارے لئے دشوار ہو جاتا...... لیکن وہ ایک باہمت لڑکی ہے۔ ..... فیض کی زندگی سے وہ اس طرح خاموش چپ چاپ نکل گئی گویا کبھی آئی نہ تھی...... پھر تم ہی انصاف کرو فرحت ان تمام احسانات کو میں کس طرح فراموش کر دیتی؟ کیسے اس قدر بے رخی سے پیش آتی"

میں حیرت سے شہلا کی باتیں سن رہی تھی...... اُف وہ کس قدر نیک دل تھی...... کسی بات کا تاریک پہلو وہ دیکھنا ہی نہ جانتی تھی۔

میں نے اپنی شرمندگی چھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا" اچھا خیر کچھ معلوم بھی تو ہو آپکی "محسنہ" کی تشریف آوری کا سبب کیا تھا؟"

"سبب" اس نے میری بات کو دہراتے ہوئے کہا" سبب کوئی خاص نہ تھا... صرف یہ کہ وہ مجھ سے ایک بار ملنا چاہتی تھی۔ بالفاظ دیگر وہ اس ہستی کو دیکھنا چاہتی تھی جسے فیض نے اس پر ترجیح دی۔ پھر بہت دیر تک وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی"

شہلا یہ کہہ ہی رہی تھی کہ سامنے کے پردے کو جنبش ہوئی اور فیض کمرے میں داخل ہوا مجھے دیکھ کر وہ ایک لمحہ جھجکا لیکن پھر فوراً ہی ہنستا ہوا اندر آ گیا۔

"اوہو آپ ہیں فرحت! میں سمجھا نہ جانے کون...... کیوں؟ یہ شہلا آپ کے شانے پر کیسی جھکی ہوئی ہیں...... کچھ طبیعت خراب ہے؟

"نہیں طبیعت تو ٹھیک ہے...... کیا تمہیں خبر نہیں کہ آج ان کی ملاقات نشاط سے ہو گئی..... وہ یہاں...... انھیں دیکھنے آئی تھی...... بس اس کے جانے

بعد سے انھوں نے اس کی حالت پر آنسو بہانے شروع کر دیئے۔

"نشاط"؟ وہ فکرمند نظروں سے شہلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا..... "نشاط آخر کب آئی؟ ...... کیوں آئی؟ ..... کیا وجہ تھی؟"

"اُف خدا!" شہلا ایک انداز سے سر اٹھا کر کہنے لگی ... "اس کا نام آتے ہی تم سب کے چہروں کا رنگ کیوں اُڑ جاتا ہے ..... وہ آئی تھی میرے پاس ...... پریشان صورت ... تباہ حال ..... زرد چہرہ، اُڑی ہوئی رنگت ..... بکھرے ہوئے بال .... اُف اسے دیکھ کر پتھر کا دل بھی پانی ہو جاتا ...... فیض آخر تو وہ تمہاری بیوی ہے" وہ ملتجیانہ لہجہ میں کہنے لگی "کیا وہ اتنا بھی حق نہیں رکھتی کہ تمہارے گھر میں قدم بھی رکھ سکے؟"

"تم نہیں سمجھ سکتیں"..... وہ تیزی سے کہنے لگا ..... "وہ نہ معلوم کیا چال چلنا چاہتی ہے ..... اس کے یہاں آنے کا ضرور کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا ... میں اس کی عادت سے بخوبی واقف ہوں ... میں خوب جانتا ہوں وہ مجھے ہر صورت سے نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔"

"فیض! تم کیوں کسی شخص کے متعلق بری رائے قائم کر لیتے ہو .... تم اس سے محبت نہ کر سکے یہ دوسری بات ہے ... لیکن اُسے نشانۂ ملامت کیوں بناتے ہو"!!

"معلوم ہوتا ہے وہ تم پر خوب رونق نازل کر گئی ہے تمھیں کیا معلوم اس نے میری کس قدر اہانت کی ہے ... علیحدگی ہونے پر جب میں نے پچیس ہزار کا چیک بھیجا تو اس نے غصہ میں چیک کے پرزے پرزے کر ڈالے اور مجھے واپس بھیج دیے۔"

"اس سے تو اس کی خودداری ظاہر ہوتی ہے۔ تم روپیہ دے کر اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ روپیہ ان ذمہ داریوں کا ایک حقیر معاوضہ تھا؟"

"نہیں نہیں" وہ طنزیہ لہجہ میں کہنے لگا "وہ خوددار نہیں ہے۔ خودداری تو اسے چھو کر بھی نہیں گئی ..... وہ مغرور ہے .... حد درجہ مغرور ..... اپنے غرور میں وہ میرا کوئی احسان لینا نہیں چاہتی .... وہ میری کوئی مدد نہیں چاہتی ..... وہ میرا روپیہ لینا نہیں چاہتی .... حتیٰ کہ میری دی ہوئی آزادی بھی اسے قبول نہیں ..... یا یوں کہو کہ کوئی فتنہ بپا کرنے کے لئے وہ اس رشتہ کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔"

"یقین مانو فیض!" اس نے غمگین لہجہ میں کہا "اس کی حالت قابل رحم ہے .... اُف!! اس کو اس حالت تک پہنچانے کی تمام ذمہ داری میرے اوپر عاید ہوتی ہے ..... اس کی کشتی حیات کے ملاح کو میں نے چھین لیا ہے ..... ننھی سی کشتی اس بحر بے کنار میں موجوں کے تھپیڑے کھاتی بہتی چلی جا رہی ہے ..... ساحل کا دور دور پتہ نہیں ....

امیدیں دم توڑ رہی ہیں" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

فائدہ۔ "خود کردہ را علاجے نیست" میں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

"یہی تو میں کہتی ہوں" وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی "کہ فیض سے شادی کرنے میں میں نے بڑی سخت غلطی کی ..... بلکہ ایک بہت بڑا گناہ کیا ..... ایک لڑکی کی زندگی برباد کر دی ..... ایک بے بس کے دل کا سکون لوٹ لیا۔"

"تمہاری طبیعت ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوئی ہے شہلا! اور کوئی بات نہیں" فیض موضوع بدلتے ہوئے بولا "چلو کوئی اور اچھا ذکر شروع کریں ... ہاں خوب یاد آیا ابھی ابھی میں آ رہا تھا تو راستہ میں مجھے مسز پرشاد ملیں وہ نئے ٹی۔ بی سینیٹوریم کے لئے چندہ جمع کرنا چاہتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا ارادہ ہے کہ ستائیس تاریخ کو ایک چیریٹی شو کر کے روپیہ جمع کریں ..... تمھیں اس میں رقص کرنا ہوگا ..... دیکھو ..... دیکھو انکار نہ کرنا! میں اُن سے وعدہ کر آیا ہوں۔"

"ستائیس تاریخ تو بہت قریب ہے" وہ کچھ سوچ کر بولی ..... "صرف چار ہی روز تو رہ گئے ہیں۔ علاوہ ازیں میں نے ایک عرصے سے ڈانس کی پریکٹس چھوڑی ہوئی ہے .... تم ناحق وعدہ کر لیتے ہو ...... خواہ مخواہ مذاق بنے گا تو میرا"

"جی ہاں تم جیسی ماہر رقص کا ہی مذاق نہ بنا تو اور کس کا بنے گا" میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا ..... "اصل بات یہ ہے کہ ماہر فن ذرا نخرے دکھاتے ہیں۔"

وہ زور سے ہنس پڑی۔

"نہیں یہ بات نہیں آخر مجھے بھی تو تیاری کے لئے کچھ وقت چاہئے۔"

"خیر ابھی تو چار دن کا وقفہ ہے خوب پریکٹس کر سکتی ہو۔ بات یہ ہے شہلا کہ مسز پرشاد کے لہجہ میں اس قدر التجا اور عاجزی تھی کہ میں مجبور ہو گیا۔ وہ کہنے لگیں کہ بیگم فیض کا رقص اگر ہو گیا تو بس جلسہ میں گویا جان پڑ جائے گی ورنہ کوئی خاص کامیابی کی امید نہیں کیونکہ باقی آرٹسٹ تو بس یونہی ہیں ..... بیگم فیض جس شہرت کی مالک ہیں اُن کا نام ہی سن کر لوگ ٹوٹ پڑیں گے آپ انھیں راضی کرنے کی کوشش کریں پھر میں خود بھی کل شام کو آؤں گی۔ میں نے کہا۔ میں ضرور کوشش کروں گا اور مجھے قوی امید ہے کہ وہ ضرور راضی ہو جائیں گی۔"

"یہ ورائیٹی انٹرٹینمنٹ ہوگی کہاں؟" میں نے فیض سے مخاطب ہو کر کہا۔

"غالباً رنگیل ہال میں لیکن اس کا ملنا ذرا مشکل نظر آتا ہے۔"

"خیر رقص ہو جائے گا" شہلا آہستہ سے بولی "مگر نشاط کا قصہ بھی تو طے کرنا ہے۔"

"نشاط کا قصہ ہی کیا ہے!" فیض اکتا کر بولا "آج وہ آگئی تھی آئندہ نہیں آنے پائیگی میں نوکروں کو ہدایت کر دوں گا ..... آئندہ وہ تم سے مل کر تمہارا سکونِ قلب برباد نہ کرنے پائے گی۔ سُنا تم نے؟ ......"

کہا۔ "تم اس کی حسرت ناک صورت دیکھتے تو یہ بات کہنے کی کبھی جرأت نہ کرتے ... تم اُسے واپس کیوں نہیں لیتے ...... آخر وہ تمہاری منکوحہ ہے ...... خدا کے بعد کی نظروں میں ...... قانون کی نظروں میں اس کا تمہارے اوپر وہی حق ہے جو میرا ...."

"کیا بے تکی باتیں کر رہی ہو" فیض کا چہرہ غصہ سے تمتما اُٹھا ... "میں اسے واپس کیونکر نہیں بلا سکتا .... اپنی موجودہ جنت کو کھو کر دوزخ کی آرزو کوئی احمق ہی کر سکتا ہے ...... وہ یہاں نہیں آ سکتی .... "کیا وہ یہاں آنے کی خواہشمند ہے ؟"

میں نے شہلا سے مخاطب ہو کر کہا :

"نہیں اس نے تو خواہش ظاہر نہیں کی بلکہ میں نے خود ہی اُسے اس بات پر راضی کیا ہے تو وہ انکار کرتی رہی ..... لیکن وہ کیسا انکار ..... اُف کاش تم دیکھ سکتیں فیض ......"

میرے اس اشارے پر اس کا چہرہ سورج مکھی کے پھول کی مانند کھل گیا .... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تمام روح سمٹ کر اس کی سرگیں آنکھوں میں آ گئی ہے ..... یہ محض اس کی خودداری تھی جو وہ زبان سے انکار کر رہی تھی .... گو اس کے قلب کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے "

"لیکن آخر تم کیوں اُسے اس قدر بلانے پر مصر ہو ؟" میں نے خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا "تم اتنی نادان تو نہیں کہ تمہیں یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اس کا یہاں آنا تمہارے لئے کیا معنی رکھتا ہے ..... جانتی ہو وہ تمہاری رقیب ہے ... کیا تم یہ برداشت کر سکتی ہو کہ وہ فیض کی محبت میں تمہاری شریک ہو جائے "

"قسمت نے جب اُسے میرا شریک بنا یا ہے" وہ اُداس لہجہ میں بولی "تو پھر میرا اُسے روکنا کیا معنی رکھتا ہے ..... فیض میں اُسے خود جا کر لے آؤں گی ..... اُف ... اب میں یہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتی ..... اس کا غمزدہ چہرہ میری نظروں سے دور نہیں ہوتا ..... میرے دل میں کوئی چیز کہتی ہے کہ اُسے یہاں آ جانا چاہئے "

"نہیں وہ یہاں نہیں آئے گی" فیض نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا ..... "وہ تمہاری دشمن ہے ..... تمہارے سائے سے بھی وہ دور رہنا چاہتی ہے ..... نہ اُسے مجھ سے محبت ہے ..... وہ تو بس انتقام لینا چاہتی ہے ..... میری زندگی کا سکون تباہ کرنے کی آرزومند ہے .... اس کی یہ عاجزی اور انکساری بناوٹ ...... میں خوب سمجھتا ہوں "

"لیکن میرا ضمیر تو مجھ پر لعنت بھیج رہا ہے .... میری ہستی درمیان میں نہ آ جاتی تو بھلا تم کیوں اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے فیض !!! کیوں ایک غریب لڑکی کی زندگی اس طرح تباہ ہوتی ...... میرا دل کہتا ہے اگر میں نے اسے یہاں نہ بلایا تو اس کی آہیں مجھے تباہ کر ڈالیں گی "

"تمہارے دماغ میں تو فتور آ گیا ہے" میں نے غصہ سے کہا "تم بات کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکتیں۔ نشاط کا یہاں آ کر رہنا ایسی معمولی بات نہیں ہے جیسی تم سمجھ بیٹھی ہو۔ جب وہ یہاں آ کر رہے گی تو اس وقت تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گا ..... تمہیں اپنی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی "

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر گہری سوچ میں بیٹھی اپنی چوڑیوں سے کھیلتی رہی پھر سر اُٹھا کر کہنے لگی۔

"یہ تو میں جانتی ہوں کہ نشاط کی آمد سے میری زندگی کی بساط یکسر پلٹ جائیگی ...... اور یوں میری دستِ نگر بن کر وہ خود بھی یہاں آنے کو تیار نہیں لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نشاط کے حق میں دست بردار ہو جاؤں گی "

فیض سامنے کرسی پر خاموش بیٹھا سگار کا دھواں اُڑا رہا تھا اس کی نظروں سے پریشانی کے آثار ہویدا تھے۔ شہلا کا یہ جواب سُن کر اس کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔ وہ افسردہ لہجہ میں کہنے لگا

"اور تم شہلا" ؟

"میں ؟" .... ہاں !!! اپنے متعلق تو میں سوچا ہی نہیں ...... اوہ .... خیر میں شغل کے طور پر آرٹ کلاس میں داخلہ لے لونگی "

فیض کے چہرے کی رنگت سفید پڑ گئی وہ اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر بے چینی سے کہنے لگا۔ بند کرو .... مجھ میں زیادہ سننے کی تاب نہیں ہے ..... تمہاری گفتگو میں کانٹوں کی چبھن ہے ...... زہرِ ہلاہل کی سی تلخی ہے "

وہ مشتبہ نظروں سے چند لمحہ شہلا کے چہرے کو گھورتا رہا پھر بیقراری کے عالم میں اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور اس کے پیچھے شہلا تیزی سے اس کا نام پکارتی چلی گئی۔

میں کچھ دیر تنہا کمرے میں بیٹھی رہی ..... دُور سے فیض کے تیز تیز بولنے اور شہلا کی ہچکیوں کی آواز آ رہی تھی ..... میں نے زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور دبے پاؤں کمرے سے نکل کر اپنے گھر کی طرف چل دی ..... فضا میں عجیب پُرخوف سناٹا تھا ..... کبھی کبھی کسی موٹر یا گاڑی کی آواز اس سکوت کو توڑ دیتی تھی ...... سامنے کھجور کے بلند درخت کے پیچھے چودھویں شب کا چاند مسکرا رہا تھا ..... سڑک کی دوسری جانب "کافی ہاؤس" کی روشنیاں شیشوں میں سے تاروں کی طرح دمک رہی تھیں۔ ...... سرد اور تیز ہوا پتوں میں سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی میرے جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی اور تیزی سے قدم اٹھاتی میں اپنے کمرے میں پہنچ کر بے حال سی مسہری پر گر پڑی۔

اس شب میں نے کھانا بھی نہیں کھایا ..... طبیعت عجیب پریشان سی

تھی اور دماغ میں خیالات کا ہجوم۔۔۔۔۔ایک ذہنی کشمکش۔۔۔۔شہلا۔۔۔۔نشاط۔۔۔۔۔فیض۔۔۔۔تباہی۔۔۔۔بربادی۔۔۔۔یا خوشی۔۔۔۔۔اطمینان اور سکون۔۔۔۔۔یہی سوچتے سوچتے میں خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئی۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن میں نے سُنا کہ شہلا نشاط کو لے آئی ہے۔ مجھے سُن کر زیادہ تعجب نہیں ہوا کیونکہ میں جانتی تھی کہ شہلا جو بات کہتی ہے اُسے ضرور پورا کر کے رہتی ہے۔۔۔۔نشاط کی آمد سے میری ذات پر کوئی اثر نہ تھا لیکن نہ معلوم کیوں مجھے ایک روحانی اذیت ہوئی۔۔۔۔۔اور شہلا۔۔۔۔۔رہ رہ کر اس پر غصہ آتا تھا۔۔۔۔۔نا سمجھ لڑکی۔۔۔غصہ کی وجہ سے میں تین دن تک اُس سے ملنے بھی نہ گئی۔

ستائیس تاریخ کی شام کو میں باہر برآمدہ میں بیٹھی ایک دلچسپ ناول پڑھ رہی تھی کہ موٹر کے ہارن سے دفعۃً چونک پڑی۔ میرے کان اس آواز سے مانوس تھے میں سمجھ گئی۔۔۔سامنے فیض، شہلا اور نشاط چلے آ رہے تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ تھی۔ شہلا رقص کے لئے تیار ہو کر آئی تھی۔۔۔۔۔اس کے دراز سیاہ بال ربن کی بندش سے آزاد اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے۔۔۔۔سنہری تاروں بھری بڑی سی گھیردار پشواز پہنے وہ جنت ارضی کی کوئی حور معلوم ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔اس کا حسن واقعی ملکوتی تھا۔۔۔سیمیں تن۔۔۔سرو قد۔۔۔۔غزالِ کوہ کی مانند بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔۔۔۔اور پھر چہرے پر فرشتوں کی مانند معصومیت اور تقدس۔۔۔۔۔وہ درحقیقت ایک اعلیٰ اور ارفع ہستی تھی۔۔۔۔۔۔اپنی ہم عمر لڑکیوں سے بہت مختلف۔۔۔۔۔کہیں زیادہ بلند۔

شہلا دوڑی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے غور سے اس کے چہرہ کو دیکھا۔۔۔۔دل پر ایک چوٹ سی لگی۔۔۔۔آہ صرف تین دن کے عرصہ میں اس میں نمایاں تبدیلی ہو گئی تھی۔۔۔۔چہرہ اترا اترا تھا۔۔۔۔آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔۔۔۔۔اس کی فکر مند نظریں اور کھویا ہوا انداز اس کی دلی کیفیت ظاہر کر رہے تھے۔۔۔۔۔آج وہ کوشش سے اپنے آپ کو غیر معمولی طور پر خوش ظاہر کر رہی تھی۔۔۔۔لیکن اس کی مسکراہٹ میں کتنی آرزوؤں کا خون تھا یہ میں ہی جانتی تھی۔۔۔۔۔۔وہ اپنی حالت مجھ سے چھپانے کی بہت کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں کا اضطراب اس کے دل کا راز فاش کر رہا تھا۔ نشاط بھی اب قریب آگئی تھی۔ شہلا مڑی اور فوراً میرا تعارف نشاط سے کرا دیا۔ میں نے رسمیہ اس سے ملاقات پر اظہار مسرت کیا۔

"تم شاید اس وقت رقص میں جا رہی ہو شہلا؟" میں نے اس کے لباس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "خدا نظر بد سے بچائے۔ آج تو تمہارے حسن پر نگاہ نہیں ٹھہرتی۔"

وہ زور سے ہنس پڑی۔ "کیوں فیض کیا درحقیقت میں خوبصورت نظر آتی ہوں؟"

میں فیض کا جواب نہ سُن سکی کہ اس نے کیا کہا۔ البتہ میں نے محسوس کیا کہ اس سوال پر نشاط کے چہرے کی تمام برہمگی سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آگئی ہے۔ شہلا میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی: "چلو فرحت اب جلدی تیار ہو جاؤ میں خاص تمہیں لینے آئی ہوں۔۔۔تمہارے بغیر ہرگز نہ جاؤں گی۔"

میں جانا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کے اصرار پر مجبور ہو کر لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔ نشاط اور فیض برآمدہ ہی میں کرسیوں پر بیٹھے رہے لیکن شہلا کچھ عرصہ بعد میرے پاس اندر کمرے میں چلی آئی۔۔۔۔۔میں آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بالوں کو سنوار رہی تھی۔ وہ خاموش میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی میں نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا: "آخر تم نے فیض کو راضی کر ہی لیا؟"

"کچھ نہ پوچھو فرحت۔ بڑی خوشامدوں اور منتوں، آنسوؤں اور دھمکیوں سے فیض کو راضی کیا۔۔۔۔اگر وہ نشاط کو نہ لاتا تو یقین مانو میں خود یہاں سے چلی جاتی۔"

"چلو خیر جو تم چاہتی تھیں وہ ہو گیا۔" میں طنزیہ لہجہ میں بولی۔

"ابھی کہاں؟" "ابھی میرا مشن پورا نہیں ہوا۔"۔۔۔۔۔۔وہ میرے قریب آ گئی اور سرگوشی کے لہجہ میں کہنے لگی۔۔۔"بات یہ ہے فرحت۔۔۔۔وہ۔۔۔یہ۔۔۔۔کہ جیسے نشاط آئی ہے فیض نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔۔۔۔بات کرنی تو کجا۔۔۔۔لیکن رفتہ رفتہ۔۔۔میری کوشش سے وہ اس کی طرف مائل ہو جائے گا۔۔۔۔مجھے یقین ہے۔۔۔۔۔اور پھر میں خاموشی سے ان کی زندگی سے نکل جاؤں گی۔۔۔۔دور۔۔۔بہت دور۔۔۔۔کہیں جا کر کوئی قومی کام شروع کر دوں گی۔۔۔۔ہماری قوم کو بے غرض کام کرنے والوں کی ضرورت بھی ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش اپنے بالوں کو سلجھاتی رہی۔۔۔۔اور میں جواب بھی کیا دے سکتی تھی۔ اس کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔

اُس نے پھر خود ہی کہنا شروع کیا: "نشاط ایک عجیب قسم کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ پچھلی رات میں سو رہی تھی کہ آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔۔۔۔اور میں نے کیا دیکھا فرحت! اوہ تم سُن کر ڈر مت جانا۔۔۔۔نشاط میری مسہری کے قریب کھڑی میرے گلے کا ہار اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے حیرت سے اس کے آنے کا سبب دریافت کیا۔۔۔۔۔وہ کچھ جواب نہ دے سکی۔۔۔۔اس کا چہرہ فق پڑ گیا۔۔۔۔۔۔وہ بیدِ لرزاں کی طرح تھر تھر کانپنے لگی۔ لیکن پھر بھی ہار ہاتھ سے نہ چھوڑا

بلا رک کر یہ جملہ اس کے منہ سے نکلا "یہ ہار مجھے بہت پسند ہے میں ذرا اسے دیکھ رہی تھی۔"
میں خوف زدہ ہو کر شہلا کی طرف دیکھنے لگی "پھر ؟ تم نے فیض کو بیدار کیا ہوگا ؟"
"اوہ" وہ لاپرواہی سے بولی "فیض کو جگانے کی بات ہی کیا تھی۔۔۔۔ پہلے میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں پھر کچھ سوچ کر میں نے خاموشی سے گلے سے ہار اُتار کر اس کے ہاتھ میں دیدیا "اگر تمہیں پسند ہے تو ہمیشہ کے لئے اس کو لے سکتی ہو لیکن نشاط! اس طرح رات میں اُٹھ اُٹھ کر دیکھنا۔۔۔۔ اُف میں تو ڈر گئی تھی" اس نے شرمندگی ہو سر جھکا لیا۔ میرا خیال تھا وہ ہار مجھے واپس کر دے گی لیکن کس قدر تعجب انگیز بات:۔
۔۔۔۔۔ وہ ہار لے کر خاموشی سے میرے کمرے سے نکل گئی۔۔۔۔ گویا اس کے آنے کا مقصد ہی یہ تھا۔"
میں غصہ سے لرز گئی "بیوقوف لڑکی اپنا ہار اُسے کیوں دے دیا۔ وہ عورت نہیں کوئی خوفناک بلا معلوم ہوتی ہے۔ آدھی رات کو اُٹھ کر تمہارے ہار کو دیکھنا کیا وہ دن میں نہیں دیکھ سکتی تھی ؟"
"خوفناک بلا" شہلا زور سے ہنس پڑی۔۔۔۔ میں بھاؤں۔۔۔۔۔ بھوت اور جادو کی قائل نہیں۔۔۔۔۔ یہ تو جاہل عورتوں کے ڈھکوسلے ہوتے ہیں۔۔۔۔ پر ہاں" وہ کچھ افسردہ لہجہ میں کہنے لگی۔۔۔۔ "ہار دیکر مجھے افسوس بھی ہوا کیونکہ اماں جان مرحومہ کی یہی ایک نشانی میرے پاس تھی۔"
"تمہارے حساس دل کی یہ احمقانہ حرکتیں نہ جانے کیا رنگ لائیں" میں نے بزرگانہ انداز سے کہا "اور فیض۔۔۔۔ نہ جانے اس کو کیا ہو گیا ہے کہ تمہاری ہر بیہودہ خواہش کو پورا کرنا اپنا ایمان خیال کرتا ہے۔"
"جانے بھی دو ان باتوں میں کیا رکھا ہے" وہ بات ٹالنے کی غرض سے بولی۔
"چلو بس اب جلدی چھ بجنے والے ہیں ہمیں وقت سے دس منٹ پہلے پہنچنا مناسب ہے۔"
اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر جلدی سے باہر لے گئی۔ نشاط اور فیض اُٹھ کر ساتھ ہو لئے آٹھ دس قدم چلنے کے بعد شہلا نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔ میں بھی بغیر کچھ سمجھے آہستہ قدم اُٹھانے لگی۔ وہ میرے کان کے پاس منہ لا کر مسکرا کر بولی۔۔۔۔۔:
"دیکھو فرحت! فیض کیسے دانستہ نشاط سے دُور دُور۔۔۔۔۔ بچ بچ کر چل رہا ہے۔۔۔۔۔ اُسے میرا کس قدر خیال ہے۔۔۔۔ سمجھتا ہے کہ شاید نشاط کی طرف توجہ سے مجھے رنج ہوگا۔۔۔۔ لیکن کچھ عرصے میں یہ بات دور ہو جائے گی۔۔۔۔ تم دیکھ لینا فرحت" وہ متکبرانہ لہجہ میں بولی "یقین جانو میرے دل میں رقیبانہ حسد کا نام نہیں ہے۔"
راستہ خاموشی سے طے ہوا۔ ریگل ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نیچے، اوپر، گیلری میں، ہر طرف سر ہی سر نظر آتے تھے۔ شہلا کا رقص نہایت کامیاب ہوا۔ تحسین و آفرین کے غلغلوں اور تالیوں کے شور سے ہال گونج اُٹھا۔ پھر جب جلسہ

بارش شروع کر دی۔۔۔۔ پھولوں کی لطیف بو چھاڑ۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔ اس کا ملکوتی پیکر۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ننھا سا معصوم فرشتہ۔۔۔۔۔۔ بلند آسمانوں سے پرواز کرتا ہوا اُتر آیا ہے۔ رقص کے دوران میں گاہے گاہے نشاط کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کو دیکھتی رہی۔ وہ سب تماشائیوں سے علیحدہ ایک کونے میں بیٹھی ٹکٹکی باندھ کر شہلا کو دیکھ رہی تھی اور میں نے دیکھا۔۔۔۔۔ اس کی خوفناک آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

رقص کے دوسرے دن اخباروں نے کالم کے کالم شہلا کے کمال کی تعریف میں سیاہ کر دئے۔ میں اس کامیابی پر اسے مبارکباد دینا چاہتی تھی لیکن فرصت ہی نہ ملی۔ چوتھے روز سنا کہ اُسے رقص سے آنے کے بعد بخار ہو گیا۔ جواب تک نہیں اترا۔ اُس روز میں نے جانے کا ارادہ بھی کیا لیکن مسز فیروز آ گئیں اور شام کی آئی ہوئی کہیں رات کو گئیں۔ سمجھتی تھی کہ اُسے معمولی نزلہ اور حرارت ہو گئی ہوگی۔ کیونکہ اس روز وہ ریگل سے واپس آنے کے بعد بھی بہت دیر تک اسی باریک لباس میں پھرتی رہی۔
اس شب نہ جانے میرا دل کیوں پریشان تھا۔ رہ رہ کر اک عجب قسم کی گھبراہٹ اُٹھتی۔ گو شہلا کی عیادت کو تو نہ گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی خاص کام بھی گھر پر رہ کر مجھ سے نہ ہو سکا۔ بڑی دیر تک کافی کی پیالی سامنے رکھے بیٹھی رہی۔۔۔۔۔۔ دماغ میں خیالات کا ایک ہجوم تھا۔۔۔۔۔ نشاط مجھے ایک معمہ نظر آ رہی تھی۔۔۔ نہ جانے اس کی آمد کس تباہی کا پیش خیمہ ہے۔۔۔۔۔ یہی میں سوچتی رہی۔۔۔۔ اور کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکی۔۔۔۔۔ یہی خیال تھا کہ کسی مناسب طریقہ سے فیض کو ان سب واقعات سے آگاہ کر دوں گی ـــــ کافی برف کی مانند یخ ہو چکی تھی۔ میں اسے یونہی چھوڑ کر روشنی گل کر کے پلنگ پر لیٹ گئی لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔۔۔۔۔۔ کمرے کی تاریک فضا میں نیلے نیلے ستارے۔۔۔۔۔ روشنی کی کپکپاتی ہوئی لکیریں۔۔۔ بڑے بڑے سیاہ دھبے میری نظروں کے سامنے ناچ رہے تھے۔
اور نہ جانے۔۔۔۔۔ کب۔۔۔۔ اور کس وقت نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔
ایک دم کسی دھماکے سے میری آنکھ کھل گئی۔۔۔ میں گھبرا کر سیدھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔۔ اف میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔۔۔۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔۔۔۔۔ گلا خشک تھا اور ہونٹوں پر پپڑیاں۔۔۔۔ میں سر سے پاؤں تک کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔۔۔۔۔ کمرے کی سرد فضا میں میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔۔۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکل گئی ـــــ لیلائے شب اپنی سیاہ زلفیں سمیٹ کر رخصت ہو رہی تھی۔۔۔۔ درخشندہ ستارے بھی بساط آسمان سے ایک ایک کر کے غائب ہوتے جاتے تھے۔۔۔۔ ہلکی ہلکی روشنی چار سُو پھیلی ہوئی تھی۔۔۔۔ دور۔۔۔۔۔۔

بجے کوئی دیر سے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ پریشان ہو کر میں نے خود ہی جلدی سے صدر دروازہ کھولا۔ فیض کا نوکر سامنے کھڑا کچھ کہہ رہا تھا۔ اُف وہ وحشت ناک خبر..... شہلا کی حالت خراب تھی مجھے طلب کیا گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اُسے کیا جواب دیا۔ البتہ اتنا جانتی ہوں کہ پانچ منٹ سے بھی کم عرصہ میں شہلا کے سرہانے کھڑی تھی۔ ڈاکٹر ابھی مایوس سر جھکائے باہر نکلا تھا.. یا خدا..... میرا دل ڈوبنے لگا...... گذشتہ شب کے مہیب خوابوں کی تعبیر میری نظروں کے سامنے تھی۔ وہ بستر پر خاموش بے حس و حرکت لیٹی تھی...... چہرہ نقاہت کے باعث سفید تھا...... مردنی سی چھوٹ رہی تھی ......

میں نے بیقراری کے عالم میں اس کی جلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا اور جھک کر بار بار اس کا نام پکارنے لگی۔ آنسوؤں کے قطرے اس کی پیشانی پر گر پڑے..... اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی......

اس کے لب ہلتے ہوئے معلوم ہوئے نحیف آواز میں اس نے کچھ کہا۔ لیکن میں سن نہ سکی۔ اس کی آنکھیں دوبارہ بند ہو گئیں...... وہ زور زور سے کراہنے لگی۔

میں نے گھبرا کر فیض کو دیکھا تو اس کی حالت دگرگوں تھی۔ شب بھر اس نے ایک لمحہ بھی آنکھ نہ جھپکائی تھی۔ اُس کی آنکھ میں آنسوؤں کا نشان نہ تھا لیکن اس کا چہرہ کبھی مُردوں کی مانند سفید کبھی سبز ہو جاتا۔ اضطراب نے اس کی صورت ہی بدل دی تھی۔

راشدہ ایک کونے میں اپنے چہرہ کو رومال سے ڈھانپے بیٹھی تھی۔ میں فیصلہ نہ کر سکی کہ وہ رو رہی ہے یا آنے والے حادثے کی خوشی اپنے چہرہ پر ظاہر ہونے دینا نہیں چاہتی...... بہر حال اس کی طرف توجہ دینے کو میرے پاس وقت نہ تھا۔

میں وہیں شہلا کے بستر پر بیٹھی اس کی پیشانی سے سرد پسینے کے قطرے پونچھتی رہی۔ اکدم اُسے ہذیان ہو گیا۔ وہ بے چینی سے ادھر اُدھر کروٹیں لینے لگی۔ ہذیان میں کبھی میرا کبھی باپ اور بہن کا نام لیتی ...... کبھی غمگین آواز میں فیض کی شکایت کرتی کہ [illegible] تمھیں اب میری محبت نہیں رہی؟

فیض خاموشی سے سر جھکائے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اُس پر جھک کر اسے تسلی دینے لگا کہ تمھارے ابا جان اور راحیلہ ابھی آتے ہوں گے۔ میں نے انھیں کل رات ہی تار دیا تھا۔ فیض کے اس غیر معمولی ضبط پر میں حیران ہو رہی تھی۔

سامنے پردہ کو جنبش ہوئی۔ شہلا کا غمگین باپ داخل ہوا، اور اس کے پیچھے راحیلہ بدحواس روتی پیٹتی۔ سینہ کوبی کرتی تیر کی طرح آ کر شہلا سے لپٹ گئی ——

شہلا نے آنکھیں کھول دیں۔ اور نحیف آواز سے بولی ...... "ابا جان آ گئے"..
.... اور ...... راحیلہ...... تم روتی کیوں ہو؟ ...... کیا میں بیمار

سانس کی آواز تک بھی نہ آتی تھی۔ شہلا کا باپ فیض کو سمجھاتا رہا "مرد ہو ہمت سے کام لو دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے"...... پھر وہ پلنگ کے قریب کھڑا ہو کر قرآن پاک کی سورتیں پڑھ کر اس پر دم کرنے لگا۔

خفیف سی کھانسی اٹھی اور شہلا نے کمزور آواز سے پانی مانگا۔ بجلی کی سی تیزی سے بڑھ کر فیض نے آہستہ سے اس کا سر اپنے بازو پر اٹھایا اور پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ ایک گھونٹ پی کر وہ فیض کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگی گویا اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ فیض نے اس کا سر واپس تکیہ پر رکھ دیا۔

فوراً ہی اس پر نزع کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کے اعضا میں اینٹھن پیدا ہونے لگی..... آنکھوں کی چمک معدوم ہو گئی.... فیض کا چہرہ فق پڑ گیا۔
..... اس نے پلنگ کے پاس دوزانو ہو کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور زور زور سے اس کا نام پکارنے لگا...... لیکن بے سود ..... دو تین ہچکیاں آئیں ...... اور پھر ...... آہ۔

بربط زندگی کے تار شکستہ ہو گئے ...... ننھی سی پاک روح فرشتۂ موت کے بازوؤں میں چاند اور ستاروں کی بستی کی طرف پرواز کر گئی ....

حساس دل ایک بار زور سے دھڑک کر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا.....

راحیلہ زور زور سے چیخ کر ماتم کرنے لگی۔ شہلا کا باپ خاموشی سے فیض کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گیا۔

میں جھک کر شہلا کے چہرے کو دیکھنے لگی ..... آہ..... وہ ملکوتی پیکر! کون کہہ سکتا تھا کہ وہ بے جان ہے..... لبوں پر ایک خفیف سا تبسم تھا..... سفید بستر پر آنکھیں بند کئے وہ اس طرح لیٹی تھی جیسے باتیں کرتے کرتے غنودگی آ گئی ہو..... لیکن اُف وہ مرمریں پیکر سرد ہو چکا تھا.....

میں نے محبت سے اس کے ہاتھ کو اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں تھام لیا......
آہ تھوڑی دیر میں حسن کا یہ مجسمہ زمین کی گہرائیوں میں روپوش ہو جائے گا......
قبر کی مہیب تاریکیاں اُسے ابد تک چھپا لیں گی...... میری نظریں اس کی سرخ بلوریں چوڑیوں پر جمی کی جمی رہ گئیں ...... آہ وہ اس کی نازک خوشنما کلائیوں پر کس قدر زیب دیتی تھیں.....

میں نے ایک بار حسرت سے اس کا چہرہ دیکھ کر سفید چادر اُسے اُڑھا دی۔ لیکن راحیلہ تڑپ کر دوڑی "خدا کے واسطے میری آنکھوں کے سامنے یوں سفید چادر نہ ڈالو...... جی بھر کر صورت تو دیکھ لینے دو" اور وہ شہلا کی نعش سے لپٹ لپٹ کر رونے لگی۔ میں قریب ہی کھڑی اس کی وارفتگی کو دیکھتی رہی ..... دیکھتے دیکھتے میری نظریں شہلا کی گردن اور چہرہ پر جم گئیں...... پریشان ہو کر

...س کی فوری موت کا سبب میری سمجھ میں آگیا...... مگر کس قدر تعجب ڈاکٹر اس بار
...ا خاموش رہا... کچھ تشخیص نہ کر سکا...... اور نمد ڈاکٹر کی زبان طلائی سکوں
...ے بند کی جا سکتی ہے۔

...معلوم کس جذبہ کے ماتحت میں تیر کی مانند نشاط کے کمرے میں پہنچ گئی کنجیاں اس کے
...ہانے سے نکال کر میں نے ہر چیز کا بغور جائزہ لینا شروع کیا... میرا دل زور زور
...ے دھڑک رہا تھا... ہاتھ شدت سے کپکپا رہے تھے.... لیکن میری تلاش
...اری تھی..... صندوق...... سوٹ کیس۔ الماریاں...... درازیں۔
...بستر... کتابیں.... کمرے کا کونہ کونہ .... کوئی چیز میری تلاش سے
...فوظ نہ رہی تھی۔ ہر چیز کو میں نے الٹ پلٹ کر ڈالا...... اور آخر میری گرفت میں
...ہ چیز آ ہی گئی جس کی مجھے تلاش تھی.... کاغذ کی بہت سی تہوں میں لپٹی ہوئی، ایک ننھی
...ی خالی شیشی جس پر جلی حروف میں لال سیاہی سے لکھا تھا "زہر"، خون کا ایک تیز دھارا میری
...ظروں کے سامنے ناچنے لگا.... میرا سر چکرا گیا..... انتہائی غم و غصہ کی حالت
...الت میں میں نے سیدھا فیض کی جانب رخ کیا اور شیشی کو اُسے دکھا کر حقارت سے
...ہنے لگی۔

"یہ دیکھو نشاط کے کرتوت... اس زہریلی ناگن نے اُسے ڈس لیا.....
تمہاری شہلا کو.... تمہاری نظروں کے سامنے وہ ختم ہو گئی...... اور تم
دیکھتے رہے..... کچھ بھی نہ کر سکے...... تمہاری محبت اس وقت کہاں
سوئی پڑی تھی..... وفا کے وہ لمبے چوڑے دعوے کہاں گئے؟......
.. بادِ سموم نے اس نوشگفتہ کلی کو فنا کر دیا..... اور تمھیں خبر بھی نہ ہوئی"

فیض کی آنکھیں حیرت سے زہر کی شیشی پر جمی ہوئی تھیں..... اس کی نظروں
سے شرارے نکل رہے تھے...... وہ شیشی کو میرے ہاتھ سے چھین کر سیدھا اندر جا کر
نشاط کی طرف جھپٹا اور اُسے جھنجھوڑ کر کہنے لگا ——— نابکار..
..... مجرم قاتلہ...... یہ تو نے کیا کیا؟ ——— میری زیست کو
خاکستر کرنے والے بادِ سموم کے جھونکے...... لہو پی جانے والی خونخوار
ڈائن!!! کیا تو سمجھتی ہے کہ اب فیض تیرا ہو کر رہیگا؟..... ویرانوں کی بھیانک
چڑیل اچھی طرح سمجھ لے کہ شہلا کی موت فیض کی موت ہے!! اگر تجھے تو انتقام
نے اندھا کر دیا...... چند ہی لمحہ بعد تو بھی قانون کی آہنی گرفت میں ہو گی۔
...... اس خونی کارگذاری سے تو اپنی دانست میں فیض کو اپنا بنا رہی تھی!!!
لیکن یہ نہ سمجھ کہ شہلا کی موت تجھے فیض کے دل سے قریب کر دے.....
[illegible]

آگے بڑھ کر فیض کو پکڑ کر کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن فیض حقارت سے دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا
خبردار! یہ خونی ہاتھ مجھے چھونے نہ پائیں ——— تیری یہ خونی نظریں مجھے
جلائے ڈالتی ہیں..... گنہگار عورت تجھ میں یہ جرات..... اس جرم کا
ارتکاب کرنے کی ہمت تجھ میں کہاں سے آئی...... بے رحم..... سفاک۔
سنگدل ناگن۔ فیض سے تیرا سنجوگ روحانی طور پر تو کبھی ہوا ہی نہ تھا۔ اور جو قانونی
بندھن تھا وہ بھی اس وقت منقطع ہوتا ہے...... ازدواجی قید سے تیری
آزادی کا پروانہ اور مہر کل شام تک تیرے پاس پہنچ جائیگا...... اور اب
اے مکار عورت میری نظروں سے دور ہو جا..... اس سے قبل کہ میرا جذبۂ انتقام
جوش میں آئے..... نوشگفتہ کلی کو جلا کر راکھ کرنے والے شعلے تو نے میری
زیست تباہ کر دی...... یہ کہتے ہوئے فیض بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

نشاط کچھ عرصہ خاموش ٹکٹکی باندھ کر فیض کو بیٹھی دیکھتی رہی دفعتہً وہ
ایک وحشیانہ انداز سے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور غصہ و حقارت سے چیخ کر بولی

"تمہارے ایک لفظ نے مجھے ازدواجی قید سے آزادی دیدی۔ تمہارے
ایک جھٹکے نے شادی کی زنجیریں توڑ دیں..... تمہارے ایک اشارے
نے امیدوں کا محل مسمار کر دیا...... خوب کیا...... اچھا کیا.....
تمہارا بھی کوئی خواہش مند نہیں ہے..... میں جانتی تھی یہی ہوگا......
میں جانتی تھی شہلا کے بعد تمہاری بے اعتنائی بھی میری رقیب بنے گی"

وہ مجنونانہ انداز سے زور زور سے ہنسنے لگی..... میں نے
بھی خوب انتقام لیا ہے سنا تم نے؟ تم نشاط کو ایک ادنیٰ ہستی سمجھ بیٹھے تھے۔
..... شہلا کے عشوے و غمزے تمہارے لئے سب کچھ تھے اور نشاط کا
ایثار اور قربانیاں کوئی قیمت نہ رکھتی تھیں!!! میں نے اُسے مار ڈالا تو کیا
گناہ کیا؟ کیا اس نے مجھے نہ مار ڈالا تھا؟ کیا اس نے جیتے جی مجھے خاک میں نہ ملا دیا
تم سمجھتے تھے میں خاموش رہونگی...... اپنا سب کچھ کھو کر بھی اُف نہ کرونگی؟
وہ زور سے قہقہہ لگانے لگی۔

ہاں! ہاں تمہاری محبوبہ کو میں نے ہلاک کر ڈالا...... اور تمہیں
پتہ بھی نہ چلا۔ اس وقت کیوں نہ بچا سکے؟ اس وقت کیوں نہ مدد کی؟ اس وقت
تمہاری محبت کہاں سو گئی تھی؟ تمہاری سخت جان محبوبہ پر جادو بھی کارگر نہ ہو سکا
پر زہر آخر اپنا کام کر گیا...... دیکھا تم نے نشاط کا انتقام.......
نشاط ایسی ادنیٰ ہستی نہ تھی جیسی تم سمجھ بیٹھے تھے!! میں نے تمہارے بازو پکڑ لئے
[illegible]

مجھے نہیں گھورتے؟ کیوں تیر کی طرح کمرے سے باہر نہیں نکل جاتے؟ یوں بے بس کیوں آنکھیں بند کئے پڑے ہو"

شہلا کے باپ نے بدقت اس کو فیض سے علیحدہ کیا لیکن اس نے چلتے چلتے جیب سے کوئی چیز نکال کر فیض کی جانب پھینک دی اور مجنونانہ انداز سے قہقہے لگا کر حقارت سے کہنے لگی ——— "یہ لو! تحائف بھی اپنے پاس رکھ لو"

سونے کے ہار کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ایک جھنکار کے ساتھ کمرے کے فرش پر منتشر ہوگئے۔ میں نے غور سے انھیں دیکھا میں پہچان گئی۔ یہ اسی ہار کے ٹکڑے تھے جو شہلا نے نشاط کو دیا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ پھر یکے میں مجھے شہلا کی صورت نظر آ رہی تھی۔ میں نے خوف زدہ نظروں سے نشاط کو دیکھا۔ وہ تڑپ کر شہلا کے باپ کی گرفت سے نکل گئی۔ اس نے اپنے کپڑے چاک کر ڈالے اور قہقہوں کے لامتناہی سلسلوں میں کھو گئی۔

اُف اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔!!!

میں نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ موت کا سناٹا کمرے میں طاری تھا صرف نشاط کے وحشیانہ قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔

اس خونچکاں داستان کو زمانہ گزر گیا۔ اکثر لوگوں کے ذہن سے یہ غم کی داستان عرصہ ہوا محو ہو چکی لیکن میرے دماغ میں یہ خونی واقعہ اور اس کی ایک ایک تفصیل اس طرح تازہ ہے گویا کل کی بات ہو ——— اور فیض ..... اس کے بعد مدتوں وہ بیمار رہا ——— اس کی صحت تباہ ہوگئی۔ کئی روز ہوئے میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے شاداب چہرے پر ایک پژمردگی سی چھا گئی ہے ..... افسردگی کی گھٹاؤں میں گھرا ہوا۔ ملول مضمحل۔ لاغر۔ زیست سے بیزار وہ اپنے دن پورے کر رہا ہے گویا غم نے ہمیشہ کے لئے اپنا سایہ کرلیا ہو۔

نقد و نظر

(از فصیح الدین احمد)

صاحب اور مذہب

مترجمہ عبد اللہ بٹ۔ بی۔ اے۔ شائع کردہ مکتبۂ اردو لاہور۔ قیمت ۸ر

لیونارڈ دام شف کی کتاب "ہندوستان کی موجودہ حالت" کو بٹ صاحب نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دو باب کو "راجہ اور کسان" کے نام سے شائع کیا جا چکا ہے۔ بیچ کے دو ابواب کا ترجمہ زیر نظر کتاب میں شائع ہوا ہے۔ باقی دو ابواب "بابو اور مزدور" کے نام سے جلد شائع ہونے کی توقع ہے۔

مصنف نے حکومتِ انگریزی کے ابتدائی دور پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ پھر اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ انگریزی سویلین اور سابق انگریزی سویلین کی ذہنیتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ قدیم سویلین بے باکانہ اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا۔ اور موجودہ سویلین حکومت کی پالیسی کی زنجیر کے نظام میں جکڑا ہوا ہے۔ آگے چلکر اینگلو انڈین جماعت کی یتیمانہ حالت کا خاکہ کھینچا ہے۔ انگریز اینگلو انڈین کو منہ نہیں لگاتا۔ اور اینگلو انڈین اس ہتک کا انتقام مظلوم ہندوستانی سے لیتا ہے۔ پھر آگے چلکر مشنری کارپردازیوں کا ذکر کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ مشنری نظام حکومت کا ممد اور معاون رہا ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ سویلین سے لیکر تاجر پیشہ انگریز۔ اینگلو انڈین اور مشنری سب اگرچہ الگ الگ جماعتیں ہیں مگر ہندوستانیوں کی سماجی زندگی سے عدم اشتراک اور حکومت کو مستحکم بنانا ان سب کا لائحہ عمل رہا ہے۔ ترجمہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

سنہ ۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں

مرتبہ ادارۂ ادبِ لطیف۔ شائع کردہ مکتبۂ اردو لاہور۔ قیمت ۱۲ر

یہ مجموعہ بیشتر ادبِ لطیف۔ ہمایوں۔ ساقی۔ ادبی دنیا میں شائع شدہ نظموں میں سے انتخاب کر کے شائع کیا گیا ہے۔ کتابت۔ چھپائی۔ کاغذ۔ اور ڈیزائن سب عمدہ ہیں۔

گذشتہ اشاعت میں ہم ایک اور مجموعہ کا جو حلقۂ اربابِ ذوق لاہور نے شائع کیا تھا ذکر کر چکے ہیں۔ موجودہ مجموعہ اس مجموعے سے اس معنی میں فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں شاعروں کے نام اور ان کی نظموں کے عنوان کے ساتھ ساتھ جن رسالوں میں سے نظمیں جمع کی گئیں ہیں ان کا نام بھی درج ہے۔ جدید شاعری جس سے مراد معرّا نظم ہے اس میں کافی سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آزاد۔ انصاری۔ جوش۔ مجاز۔ جذبی۔ روش۔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

سنہ ۱۹۴۲ء کی منتخب غزلیں

پنجاب سے سنہ ۱۹۴۲ء کی نظموں کے دو انتخابات جن کا ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ شائع ہونے کے بعد دہلی نے بھی کروٹ بدلی اور سنہ ۱۹۴۲ء کی منتخب غزلوں کی اشاعت ظہور میں آئی۔ پنجاب کا نیا تجربہ کچھ تعجب انگیز نہ تھا۔ اس لئے کہ پنجاب میں ادبی ذوق اور ادب نوازی کا بازار گرم ہے۔ پنجابی گھریلو زندگی میں پنجابی بولتا ہے۔ مگر اردو ادب سے جس قدر وہ دلچسپی لیتا ہے۔ اس کی آدھی دلچسپی دہلی یا لکھنؤ والوں میں نہیں پائی جاتی۔

یہ امر مزید باعثِ انبساط ہے کہ دہلی سے منتخب غزلوں کا مجموعہ دہلی کے مشہور آغا شاعر مرحوم کے گھرانے سے نکلا۔ اور ان کے صاحبزادے آغا سرخوش قزلباش نے نگارستان ایجنسی اردو بازار دلّی سے شائع کیا ہے۔ قیمت عہ

پنجاب اب عہد پارینہ کو فراموش کر چکا۔ وہ نئے نظریوں اور نئے زاویوں سے زندگی کے مطالعہ کی تلاش کر رہا ہے۔ یہ فعل صحیح ہے یا غلط ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ ادبی شوق ہر شخص کا ذاتی حق ہے۔ جو جسے اچھا لگتا ہے۔ اسی کو سراہا کرتا ہے۔ مگر دِلّی کی قدامت اس کے پرانے گورستانوں۔ مقبروں۔ مسجدوں۔ اور گلی کوچوں کے علاوہ اُس کے اصلی باشندوں میں ابھی تک باقی ہے۔ دِلّی والا جو چٹخارہ لیکر غزل کو گاتا پڑھتا اور سنتا ہے وہ اسی کا حصّہ ہے۔ پنجاب نے اگر نظم کو دامنِ عاطفت میں لیا تو دلّی نے تغزل کو چار چاند لگائے۔

اس مجموعے میں حسب ذیل نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

نوح۔ سیماب۔ سہا۔ صفیہ شمیم۔ صفی۔ عرش۔ فراق۔ فیض جھنجھانوی۔ کیفی۔ مہر۔ مجاز۔ بخشش۔ نہال۔ وحشت۔ جذبی۔ سائل۔ جگر۔ ثاقب۔ بہزاد۔ آرزو۔ احسان۔ اثر اور حفیظ جالندھری۔

احساس کمتری

مصنفہ جناب سید محمد اختر۔ شائع کردہ مکتبۂ اردو لاہور۔ قیمت ۸ر

یہ ایک نفسیاتی قسم کی چھوٹی سی کتاب ہے جس میں (Child Psychology.) کو تجزیہ اور تحلیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ بچپن کی تربیت اور نشو و نما حقیقت میں وہ پودا ہے جو بچپن سے طفلی اور طفلی سے جوانی میں قدم رکھنے پر زیادہ بڑھتا اور جڑیں پکڑتا جاتا ہے۔ عموماً چار سال سے گیارہ سال تک کی عمر کو ایسا زمانہ مانا گیا ہے جب بچے کے دل و دماغ پر جو نقوش قایم ہو جاتے ہیں وہ دایم رہتے ہیں۔ اس لئے اس عمر میں صحیح تربیت بہت ضروری ہے۔ چونکہ اس پر بچے کی آیندہ زندگی کا دارومدار رہتا ہے۔ بچپن کی پڑی ہوئی عادتیں آگے چلکر مزید پختہ ہوتی جاتی ہیں مگر بدلتی نہیں۔

یہ کتاب والدین اور استادوں کے لئے بڑی مفید ثابت ہوگی۔

حیات غوثی — مصنفہ حضرت غوث علی شاہ صاحب قادری چشتی۔ مدونہ شاہ احمد ابن عربی۔ مجوزہ خلف الصدق غوث علی شاہ صاحب۔ مطبوعہ [illegible] پریس۔ چار مینار حیدرآباد دکن۔ (بیت النور چنچل گوڑا حیدرآباد دکن)

یہ حضرت شاہ صاحب قبلہ کا کلام ہے۔ جو نعتوں، رباعیوں، سلاموں پر مشتمل ہے۔ تھوڑا سا حصہ کلام فارسی کا بھی ہے۔ شاہ صاحب کا کلام اچھا ہے مگر من حیث شعر بہت اونچے درجے کا نہیں لیکن چونکہ انھوں نے اپنے کلام میں ہمارے پیارے رسول کی [illegible] میں نہایت خلوص۔ عجز اور انکسار کے ساتھ نذر عقیدت پیش کی ہے اور [illegible] میں وہ سوز اور اضطرار پیدا ہوگیا ہے جو آنحضرت کے سچے پرستاروں کی اصل شان [illegible] حق بھی یہ ہے کہ خدا اور رسول کی شان میں جب بندہ دل سے کچھ عرض کرتا ہے تو [illegible] اس قدر محویت اور مستی طاری ہوجاتی ہے اور اس کے کلام وہ خوبیاں پیدا ہوجاتی جس سے انسانی دل و دماغ نہیں بلکہ اس کی روح بہرہ ور ہوتی ہے۔

اپنے ناظرین کو شاہ صاحب کے فارسی کلام سے محظوظ کرنے کے لئے نمونۃً ایک فارسی غزل پیش کی جاتی ہے:-

[illegible] عاشق شیدا کہ دلدارے دگر دارم ۔۔۔ بت غبار دیگر لالہ رخسارے دگر دارم
آئینہ و آئینہ بین، آئینہ رخسارم ۔۔۔ چہ گویم حال خود رہنگر بازارے دگر دارم
منم و منم قلب و منم جان و منم جاناں ۔۔۔ بہر ہر مرتبہ شانے و اقرارے دگر دارم
[illegible] کار من از کفر و ایمان شما یاراں ۔۔۔ کہ ہر ہر لفظ تصدیقے و اقرارے دگر دارم
[illegible] بگویم یا انا الحق طرفہ منصورم ۔۔۔ سرے دیگر زبانے دیگر و دارے دگر دارم
[illegible] صورت مجنوں پریشاں حال آشفتہ ۔۔۔ گہے در گیسوئے لیلے گرفتارے دگر دارم
[illegible] در بیخودی باخود گہے در باخودی بیخود ۔۔۔ مے و مستی و دیگر طرفہ خمارے دگر دارم

بہ شکل بت کمال اللہ عجب دریائے عرفانم
بہ شکل غوثیم انداز گفتارے دگر دارم

[illegible]سی — از نفیس خلیلی۔ ناشران تاج کمپنی لمیٹڈ۔ ریلوے روڈ۔ لاہور

خلیلی صاحب نے رسول کریم کی سوانح حیات کو تین حصوں میں تقسیم [illegible] بچپن، شباب، نبوت اور تینوں کو تین مختلف عنوانوں سے یعنی قدسی، بشر [illegible] کے ساتھ شائع ہونگی۔ جن میں قدسی پہلی قسط ہے۔ جسے بشکل نظم پیش کیا گیا ہے

[illegible]ق — از اختر انصاری صاحب بی اے۔ بی ٹی۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۱۶۰ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت عہ شائع کردہ مکتبہ اردو لاہور۔

یہ اختر انصاری کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف [illegible] میں شائع ہوتے رہے ہیں اور اب کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔

[illegible] صاحب کو میں ۱۹۲۰ء سے جانتا تھا جب یہ مشن کالج دہلی میں داخل ہوئے تھے۔ اس کے [illegible] خدا جانے کہاں اور کیسے غائب ہوگئے۔ اس وقت یہ نرے اختر تھے۔ رسالوں میں [illegible] کی نظمیں اور افسانے لکھنے کا اتفاق ہوا مگر کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ یہ وہی مشن کالج کے فرسٹ ایئر کلاس والے اختر ہونگے۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں دہلی کے کمپنی باغ میں ایک نمائش ہو رہی تھی۔ نمائش میں جانے کا میں بہت شوقین ہوں۔ جب تک نمائش ہوتی ہے میں روزانہ جایا کرتا ہوں۔ اسلئے کہ وہاں چہل قدمی کے ساتھ نفیس قسم کی تفریح بھی ہوجاتی ہے۔ ایکدن میں نمائش کا چکر لگا کر واپس آنے والا تھا کہ نمائش کے اندر عین دروازے کے سامنے چند نئی شکلیں آتی دکھائی دیں۔ میرے ساتھ مجاز اور ساغر بھی تھے۔ وہ انکو دیکھ کر ٹھٹکے۔ میں چونکہ ان نواردوں سے متعارف نہ تھا اس لئے چند قدم دور ٹھیر گیا سامنے میں ان میں سے ایک نوجوان جن کا قد درمیانی جسم ذرا بھاری سر پر گھنے بال جن پر چھلوں کا شبہ ہوتا تھا عینک لگائے ننگے سر منہ میں لمبا سا پائپ دبائے پتلی سی چھڑی ہلاتے ہوئے میرے نزدیک آئے کہنے فصیح صاحب کہئے اچھا آگے بڑھا۔ یہ وضع قطع سے بالکل کوئی آرٹسٹ معلوم ہوتے تھے۔ مجھے چند لمحے تامل رہا۔ پھر میں نے آہستہ آہستہ آپ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ اتنے میں انھوں نے خود یاد ماضی کو تازہ کرتے ہوئے اپنا اسم گرامی بتایا۔

اس تمام تمہید کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جب مجھے زیر نظر کتاب ریویو کیلئے ملی اور میں نے سرورق کو الٹ کر دیکھا تو صلاح الدین احمد صاحب ایڈیٹر ادبی دنیا نے جو اختر انصاری صاحب کے افسانوں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اس پر نظر پڑی۔ انکا پہلا جملہ یہ ہے۔ "اختر انصاری نوجوانوں کا آرٹسٹ ہے" اس جگہ کو پڑھکر میری آنکھوں کے سامنے اختر صاحب کا وہی حلیہ آگیا جس طرح میں نے نمائش میں انھیں دیکھا تھا۔ اور پہلی نظر میں ان کو ایک آرٹسٹ سمجھا تھا۔

میں نے اختر صاحب کے چند افسانے پڑھے۔ ان کے افسانوں کے کردار ایک مہذب تعلیم یافتہ۔ با اخلاق دکھائی دیتے ہیں۔ بے شرمی۔ بے حیائی یا عریانی جنکو ادب جدید کا زیور سمجھا جاتا ہے ان کے ہاں مفقود ہے۔ یہ اپنے کرداروں کی تخلیق میں بالکل اس نقاش کی طرح قلم فرسائی کرتے ہیں جو کسی موڈل کا خاکہ اس طرح تیار کرتا ہے کہ صرف اس کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جو اسے نمایاں کرنے منظور ہوتے ہیں۔ یہ اسکے وارڈروب۔ اسکی ڈائری۔ یا اس کی کلب میں کسی اخباری رپورٹر کی حیثیت اس کے پیچھے پیچھے نہیں پھرتے۔ انکے افسانوں میں ڈرامائی کیفیات نہیں ہوتیں۔ انکا افسانہ بہت آہستہ آہستہ چلتا ہے۔ محیر العقول کارناموں سے ان کی کہانی پاک ہوتی ہے۔ ان کی زبان بھی ستھری اور [illegible]

نئی راہیں — مرتبہ قمر تسکین۔ ناشر حلقہ احباب ترقی پسند۔ لاہور۔ قیمت مجلد مع گرد پوش عہ

نئی راہیں اصل میں پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں اختر اورینوی۔ بیدی۔ علی عباس حسینی۔ میرزا ادیب۔ اختر انصاری۔ سدرشن۔ کرشن چندر۔ [illegible] وحید عزیز کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہ افسانے بھی ملک کے مختلف رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں اور اب کتابی شکل میں شائع کئے جا رہے ہیں۔

اس قسم کی کوششیں قابل تحسین ہیں کیونکہ ہر افسانہ نویس عموماً اتنی زحمت اٹھانی پسند نہیں کرتا کہ اپنے افسانوں کو جمع کرکے شائع کرائے۔ اور ایسی حالت میں ایک قصہ رسالے میں شائع ہوجانے کے بعد وہ افسانہ ہمیشہ کیلئے فراموش کردیا جاتا ہے۔ لیکن اس قسم کے انتخابات اگر ملک میں شائع ہوتے رہے تو اچھے اچھے افسانے جو اردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہیں تلف ہونے سے بچ جائیں گے۔

عالمِ شباب کی لالچ اور دل آویزی سے
لبریز
سوشل کامیڈی
ہند پکچرز کا
انمول شاہکار
کلجگ
ادا کاران
ستارہ۔ کمار۔ نذیر۔ انورادھا۔ آزوری
گوپ۔ تجید وغیرہ
دلفریب رقص اور سحر آفریں نغمے
ڈائرکٹر نذیر کی زیر ہدایت تیار ہوا
(جو)
"سندیسہ" اور "سوسائٹی" جیسی تصویریں تیار کر سکتے ہیں
عنقریب رٹز سینما کشمیری گیٹ میں دکھایا جائیگا
جاری کردہ: جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز۔ دھلی۔ لاہور۔ کراچی
بمبئی سینے ٹون کا رومانی شاہکار
سویرا
ادا کاران
شوبھنا سمرتھ۔ ارون۔ یعقوب۔ نرملا کماری
کیسری وغیرہ
جمعہ ۲۳ اپریل سے
جگت سینما میں
چل رہا ہے!!
باسدیو پکچرز۔ دھلی، لاہور، کراچی
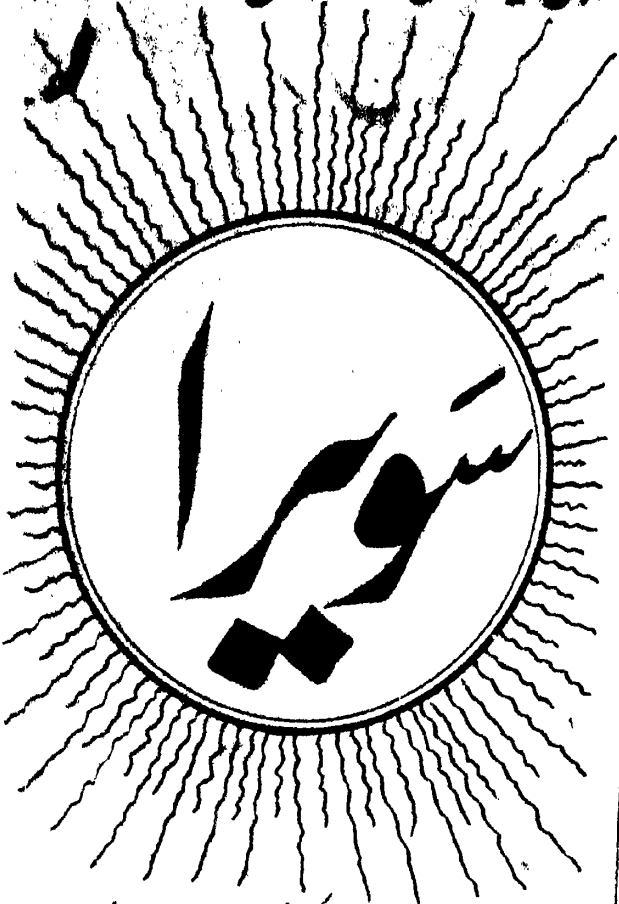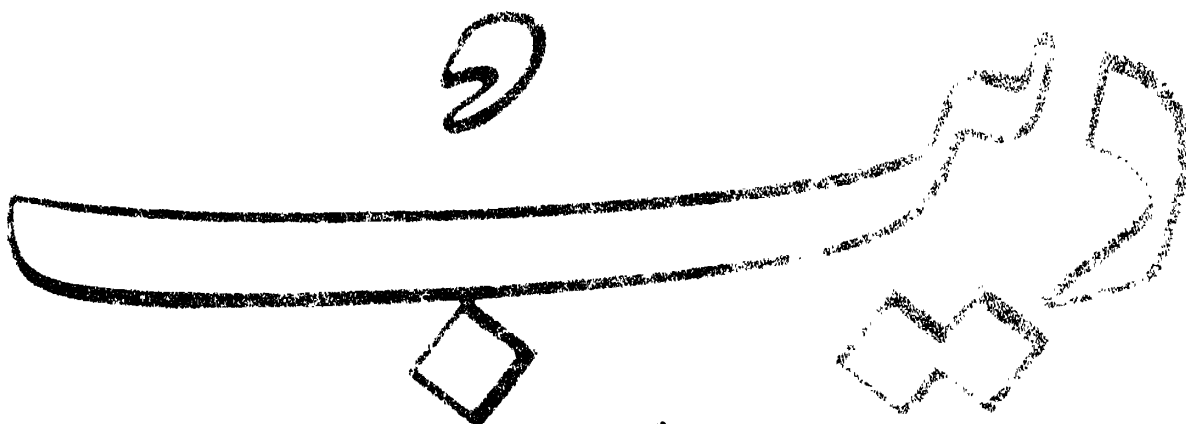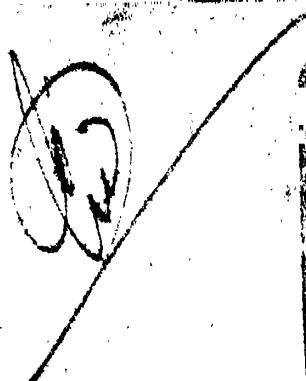
ادیب
عکس علامه دکتور
سر محمد اقبال
بحالتِ نماز
در جامعه قرطبه
سجدۀ یک مسلم
در قرطبه پس از
چهار صد سال
(اندلس)
قیمت فی پرچه
ایک روپیه
چندۀ سالانه
روپیے
جلد ۵
ماہ جون سنه ۱۹۳۳
نمبر ۲

نشانی » فلم کا ایک سین

« پونجی » کا ایک منظر

فلم « پونجی » میں منورما

« نشانی » کا ایک منظر

چندہ سالانہ:۔ علاوہ محصول ڈاک دس روپئے
قیمت فی رسالہ:۔ ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ادیب

اڈیٹرز:۔ سید محمد ارتضیٰ واحدی — فصیح الدین احمد ایم، اے — آنسہ نجمہ تصدق، ایم، اے، بی، ٹی

جلد ۵ | جون ۱۹۴۳ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

پیشِ لفظ

از فصیح الدین احمد

رسالوں میں پیش لفظ کا دستور نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ضرورت ہو تو اس
، استعمال میں کوئی قباحت بھی نہیں معلوم ہوتی۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں دہلی میں منشی ذکا اللہ صاحب مرحوم۔ ماسٹر پیارے لال صاحب
وم۔ ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم صاحبان نے ایک ادبی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔
سوسائٹی کے افراد موجودہ ٹاؤن ہال دہلی کی چھت پر شام کے وقت جمع ہوتے اور
ادلۂ خیالات اور علمی مباحثے کیا کرتے تھے۔ یہ حلقہ صرف ہم ذوق حضرات تک
رود تھا۔ بعد میں ان ہی لوگوں کی سعی سے ایک دار المطالعہ بھی قائم ہوگیا۔ جس نے
ہ عرصہ بعد کتب خانے کی شکل اختیار کرلی۔ ٹاؤن ہال سے منتقل ہو کر اب کتب خانہ د
ن عمارت میں چلا گیا جہاں کسی زمانے میں شیر، بھیڑیئے رکھے جاتے تھے اور جہاں
ج کل آنریری مجسٹریٹ اجلاس کیا کرتے ہیں۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں دہلی کے بازار چاندنی چوک سے گذرتے ہوئے لارڈ ہارڈنگ
لی وائسرائے ہند کے جلوس پر جو بم پھینکا گیا تھا اُس سے سلامتی سے بچ نکلنے کی خوشی میں
ں کے رئیسوں۔ حکاموں اور ملک کے والیانِ ریاست نے کچھ رقم اِس نیت سے جمع کی کہ
رڈ ہارڈنگ کا مجسمہ تیار کرلیا جائے لیکن لارڈ ہارڈنگ نے اس امر سے اتفاق نہیں کیا۔ انکی رائے
ں کہ روپیہ ذاتی یادگار پر خرچ کرنے کی بجائے کسی رفاہِ عام کے کام پر صرف ہونا چاہیئے۔
انچہ ایک لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے ہارڈنگ لائبریری کی عمارت تعمیر ہوئی۔ اور دہلی
لک لائبریری اس میں سنہ ۱۹۱۶ء میں منتقل ہوگئی۔ ہارڈنگ لائبریری کی منتظمہ کمیٹی کا صدر
ی کمشنر دہلی ہوتا ہے۔ چنانچہ جب مسٹر ایونز سابق ڈپٹی کمشنر لائبریری کے صدر تھے تو انہوں
ہ لائبریری کی تاریخ سے واقف ہونے کے بعد یہ مشورہ دیا کہ پرانی ادبی سوسائٹی کو دوبارہ زندہ
جائے۔ اِس لئے ستمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو دہلی کے علمی و ادبی ذوق رکھنے والے حضرات کا ایک جلسہ
ڈنگ لائبریری دہلی میں منعقد ہوا۔ اور دہلی لٹریری سوسائٹی کی بنیاد از سرِ نو ڈالی گئی۔
ں سوسائٹی کے صدر اور سکریٹری لائبریری کے صدر اور سکریٹری قرار پائے۔ رائے بہادر ڈاکٹر
ام کشور سابق وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی اور پرنسپل مشتاق احمد صاحب زاہدی نائب
صدر منتخب ہوئے۔ مزید یہ طے پایا کہ سوسائٹی کے جلسے حسب ضرورت ہر ماہ منعقد
کئے جائیں۔ جلسوں میں جو مقالے یا نظمیں پڑھی جائیں انکی نقل پہلے سے سکریٹری
کے پاس بھیج دی جائے۔

دو سال تک کامیابی کے ساتھ یہ سوسائٹی اپنا کام کرتی رہی۔ اور اتوار [illegible] ۱۹۲۳ء
کو اس کا تیسرا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت آنریبل سر موریس گوائر سابق چیف
جسٹس آف انڈیا نے کی۔ جلسے میں ممبران سوسائٹی کے علاوہ دیگر علم دوست حضرات نیز
مسٹر ہیلی ڈپٹی کمشنر۔ مسٹر ایونیر سکریٹری چیف کمشنر دہلی سینیر سب جج اور دیگر حکام ضلع
بھی شریک تھے۔

جلسے میں حسب ذیل مقالے پڑھے گئے :-

(۱) پروفیسر محمد مجیب صاحب ایم اے آکسن = تاریخ کی تعلیم (ہمیں افسوس ہے کہ اس مضمون کی نقل اکثر یاد دہانیوں کے باوجود ہمیں میسر نہ آسکی اِس لئے شائع نہیں کی گئی۔)

(۲) خواجہ سرور حسن صاحب بار۔ ایٹ۔ لا = بغداد کی علمی فضیلت

(۳) خانصاحب مولوی علی احمد جعفری صاحب = ابتدائی تعلیم

(۴) مسٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو ووڈ۔ پرنسپل دہلی پولیٹیکنک = صنعتی تعلیم

(۵) حضرت خواجہ حسن نظامی = میں دہلی ہوں

شب کو مشاعرہ سر سید رضا علی ایم۔ ایل اے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ حسب ذیل شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

(۱) آغا سرخوش قزلباش صاحب (۲) نخشب صاحب جارچوی
(۳) مولانا ماہر القادری صاحب (۴) اسرار الحق صاحب مجاز بی، اے
(۵) پنڈت بالمکند صاحب عرش ملسیانی بی، اے (۶) کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی پی، سی، ایس
(۷) علامہ سیماب اکبر آبادی

سہ پہر کو لالہ رام روپ صاحب رئیس اعظم دہلی کی طرف سے ایک پر تکلف ایٹ ہوم
دیا گیا جس میں کم و بیش ڈھائی سو مہمان شریک تھے۔

۲۹ مارچ پیر کے دن دہلی لٹریری سوسائٹی کا زنانہ جلسہ منعقد ہوا جسکی رپورٹ آپکو شعبۂ خواتین
میں ملیگی۔ میں محترمہ حمیدہ سلطانہ بیگم صاحبہ ادیب فاضل کا ممنون ہوں کہ انہوں نے جلسے کو کامیاب بنانے میں

جناب صدر!

ہمارے بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ آج کل جبکہ دنیا توپوں کی گرج سے گونج رہی ہے اور جنگ نے تباہی اور بربادی کو ہر طرف عام کر دیا ہے۔ ہم ان مسائل پر غور کرنے کیلئے جمع ہوئے ہیں جو خالص تہذیبی اور تعمیری مسائل ہیں۔ در حقیقت تعمیر انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اس لئے دائمی اور پائیدار چیز ہے۔ اسکے برعکس تخریب کا جوش وقتی ہوتا ہے اور جلد گذر جاتا ہے۔ اس کے بعد انسان پھر اپنے تعمیری مشغلوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اسلئے ہمیں اس وقت کے حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ غالباً یہی چیز لٹریری سوسائٹی ہارڈنگ لائبریری دہلی کے کارکنوں کے پیش نظر تھی۔ جو انہوں نے آج کے اجتماع میں ہمیں ایسے مسائل پر غور کرنے کا موقعہ دیا۔ جو تمام تر ہماری تہذیب اور تمدن سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں انہیں انکے اس فیصلہ پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اس موقع پر ہماری خوشی اور بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے صدارت کے لئے بھی اس شخص کو منتخب کیا ہے جس کا شمار دنیا کے بہترین ماہرین تعلیم میں ہے۔ اور جس کی اصابت رائے ہماری قومی زندگی کے دو بڑے شعبوں یعنی تعلیم اور قانون میں ہماری رہبری کر رہی ہے۔ مجھے اپنی بے بضاعتی کا احساس قدرتی طور پر اس موقع پر بہت زیادہ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ سمجھتے ہوئے کہ میرا شمار بھی تعلیمی کام کرنے والوں میں ہے۔ خواہ اس کام میں میرا حصہ کتنا ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو میں اپنے خیالات کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی جرات کر رہا ہوں۔

ابتدائی تعلیم کا مسئلہ دنیا کے اُن مسائل میں سے ہے جن پر گذشتہ پچاس سال میں ہر ملک کے سوچنے والے دماغوں نے کافی غور و فکر کیا ہے۔ اور اسی وجہ سے آج ابتدائی تعلیم کے مسائل نے دنیا کے جدید علوم میں ایک مستقل علم کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

دنیا میں انسان جس وقت سے متمدن ہوا اور علم نے انسانی معاشرت میں رواج پایا بچوں کی تعلیم کا مسئلہ لوگوں کے سامنے آیا۔ اُنہوں نے اپنے وسائل اور ذرائع کے پیش نظر بہتر سے بہتر تعلیمی طریقوں پر عمل کیا۔ لیکن جوں جوں دنیا تمدن میں آگے بڑھتی گئی تعلیم کے نظریے بھی بدل گئے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی میں جب سائنس کو فروغ حاصل ہوا اور اسکی بدولت تلاش اور جستجو انسانی مطمح نظر کی عام خصوصیت بنی تو تعلیمی مسائل نے بھی چولا بدلا۔ اور قرون وسطیٰ کے تعلیمی تجربات اور طریقوں کی جگہ اس تعلیم نے لی جو آج کل "نئی تعلیم" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔

نئی تعلیم کی تمام خصوصیات بیان کرنا میرے موضوع سے باہر ہے۔ میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اس کا مطمح نظر بچے کی نفسیات کی روشنی میں اور سماجی حالات کے پیش نظر نئے تعلیمی تجربے کرنا اور ان تجربوں کی بنیاد پر تعلیمی طریقے قائم کرنا ہے۔ چونکہ اس تعلیم کا مرکز "بچہ" ہے اس لئے اس کی توجہ سب سے پہلے اس عمر کی طرف ہوتی ہے جہاں سے بچے کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے یعنی ماں کی گود اور گھر کا ماحول۔ ہمارے ملک میں ابتدائی تعلیم کا زمانہ چھ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے اس سے پہلے ہم بچوں کی تعلیم کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں کرتے لیکن یورپ اور امریکہ میں اس عمر کے بچوں کے لئے بھی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے جسے نرسری سکول کہتے ہیں۔ یہ عرض کرنے سے پہلے کہ ابتدائی تعلیم کا مقصد کیا ہے اور اس کی تنظیم کن اصولوں پر ہونی چاہیئے میں آپ کے سامنے ابتدائی تعلیم کی تاریخ کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کروں گا۔

تاریخ کے قدیم دور میں ہمیں کسی جگہ ابتدائی تعلیم کا کوئی متعین پروگرام نہیں ملتا۔ ارسطو نے معاشرت کا جو دستور العمل تیار کیا تھا اس میں بھی عام ابتدائی تعلیم کے نظام کا کوئی ذکر نہ تھا۔ چونکہ اس وقت کی سوسائٹی میں امیروں اور رئیسوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس لئے تعلیم بھی صرف انہی کے بچوں کیلئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ ہر امیر اپنے بچہ کیلئے ایک اتالیق رکھتا تھا جو بچہ کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

قرون وسطیٰ کے شروع میں ہمیں یورپ میں عام تعلیم کے مدرسے ملتے ہیں لیکن اس وقت چونکہ مذہب کو اقتدار حاصل تھا۔ اس لئے مدرسوں میں صرف مذہبی گیت سکھائے جاتے تھے اور اسی وجہ سے یہ مدرسے "Song school" کہلاتے تھے۔ اس کے بعد گیارہویں اور پندرھویں صدی عیسوی کے درمیان جب یورپ میں تجارت نے فروغ پایا اور تجارتی شہر وجود میں آئے تو ان شہروں میں حساب کتاب اور لکھنا سکھانے کے مدرسے بھی جاری ہوگئے۔ یہ مدرسے "Writing school" کہلاتے تھے۔ اسی زمانہ میں جرمنی میں جرمنی زبان سکھانے کی تعلیم نے رواج پایا۔ یہ مدرسے "German school" کہلائے۔ جرمنی کی تقلید میں یورپ کے تجارتی شہروں کے مدرسوں میں بھی دیسی زبان کی تعلیم رواج پانے لگی۔ لیکن یہ ورنیکلر سکول صرف شہروں تک محدود تھے۔ قصبوں اور گاؤں میں تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔

سترھویں صدی سے یورپ میں تاریخ کا دور جدید شروع ہوتا ہے اور یورپ کو جو ترقی نصیب ہوئی وہ اسی دور میں ہوئی۔ یہ زمانہ یورپ میں ایک عام ذہنی بے چینی کا زمانہ تھا

اور اس دور میں وہاں ایسے مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے معاشرت کے تمام رائج الوقت طریقوں کے خلاف آواز اُٹھائی۔ طریقہ تعلیم کی مخالفت بھی شروع ہوتی بحث ۱۶۹۲ء میں ہنگری میں ایک شخص Comenius پیدا ہوا جس نے ورنیکلر تعلیم کی ضرورت کو سب سے زیادہ محسوس کیا اور عوام کیلئے شہروں قصبوں اور گاؤں میں ابتدائی تعلیم کے انتظام کی حمایت کی لیکن اس دور میں یورپ والوں کا ذہن انقلاب کی منزل سے گذر رہا تھا اس لئے نئے خیالات کی پوری پوری ترویج ممکن نہ تھی۔ البتہ جب ہیجانی کا وہ دور گذر گیا اور دماغ کو سکون کے لمحے میسر آئے تو پھر معاشرت کی تنظیم کی طرف توجہ ہوئی۔ اس وقت "روسو" ابتدائی تعلیم کا علمبردار تھا۔ یہ ۱۷۱۲ء میں فرانس میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے کیمینیس کے ورنیکلر سکولوں کی طرفداری کے ساتھ ہی ساتھ بچے کے حقوق کی حمایت میں بھی آواز اُٹھائی۔ قرون وسطیٰ میں تعلیم کا مقصد تمام تر یہی رہا تھا کہ بچے کو مدرسے میں آئندہ زندگی کے لئے تیار کیا جائے۔ اس کی موجودہ زندگی سے تعلیم کو کوئی سروکار نہ تھا تعلیم ایک داخلی چیز تھی۔ جو کسی نہ کسی طرح بچے کے دماغ میں پہنچائی جاتی ہے۔ خواہ وہ اسے قبول کرنے کیلئے تیار ہو یا نہ ہو۔ اس میں نہ اسکی ذہنی صلاحیتوں کا خیال رکھا جاتا تھا، نہ اُس کے شوق کا جبر و تشدد تعلیم کی امتیازی خصوصیت تھی۔ اسی وجہ سے تعلیم بچے کے ذہنی اور جسمانی نشوونما میں مدد پہنچانے کے بجائے رکاوٹ بن گئی تھی۔ "روسو" وہ پہلا انقلابی معلم تھا جس نے دنیا کو بتایا کہ ابتدائی تعلیم بچے کی فطرت کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اور تعلیم دیتے وقت مدرس کے سامنے بچے کی جبلت، اس کے رجحان، اس کے میلان اور اس کی رغبتیں ہوں نہ کہ بڑوں کی ضروریات اور اُن ضروریات کے مطابق ترتیب دیا ہوا نصاب۔ اسی وجہ سے "روسو" نے تجویز کیا کہ تعلیم کھیلوں کے ذریعہ دی جائے تاکہ بچے کیلئے وہ ایک حقیقی اور بامعنی چیز ہو۔ اور بچہ اسے رغبت سے حاصل کرے۔ درحقیقت "روسو" نے بچے کو تعلیم کا مرکز مان کر اُس طریقہ تعلیم کی بنیاد رکھ دی جسے آج ہم "نئی تعلیم" کہتے ہیں۔

"روسو" کے بعد ۱۷۴۶ء میں ایک اور انقلابی مدرس پیدا ہوا جس کا نام پسٹالوزی (Pestalozzi) تھا۔ اُس نے بھی "روسو" ہی کے قائم کئے ہوئے نظریئے پر اپنے فکر کی بنیاد رکھی، ابتداءً اپنے ملک کی صنعتی حالت کو درست کرنے کے سلسلہ میں اُس نے صنعتی تعلیم کو عوام میں رواج دینے کی کوشش کی لیکن بعد کو ابتدائی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور ورنیکلر مدرسہ کے ہر مضمون کی تعلیم کو بچے کی نفسیات کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔ پسٹالوزی کے نظریئے اور اس کے طریقے سب سے پہلے پرشیا (Prussia) میں رائج ہوئے۔ اور اُسکی قوم نے ان کو اپنی معاشرتی اصلاح کے پروگرام میں داخل کر لیا بعد کو انگلستان اور امریکہ بھی اس سکیم پر چلنے لگے۔ اس طرح پسٹالوزی کے نظام کو عام مقبولیت حاصل ہو گئی اور ابتدائی تعلیم صرف امرا کا حصہ نہ رہی بلکہ عوام بھی اس سے مستفید ہونے لگے۔ انیسویں صدی کے آغاز تک پسٹالوزی کے مدرسے یورپ میں عام طور پر رواج پا چکے تھے۔

پسٹالوزی کے بعد کے تعلیمی مفکروں میں فروبل کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے یہ جرمنی میں پیدا ہوا۔ اور پسٹالوزی ہی کے عقائد کا علمبردار بن کر تعلیم کے میدان میں آیا۔ ۱۸۳۷ء میں اس نے اپنے طریقے کو عام کیا۔ اُس نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ ابتدائی مدرسوں میں بچے اپنے ہاتھ سے کام کریں۔ اور اس ہاتھ کے کام کو تعلیم کا مرکز بنایا جائے چنانچہ کنڈر گارٹن سکول اسی اصول پر قائم ہوئے۔

فروبل کی تعلیم کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ بچہ کو معاشرتی حالات سے الگ نہ رکھا جائے بلکہ مدرسہ میں جہاں تک ممکن ہو تمام وہ حالات پیدا کر دیئے جائیں جو مدرسے سے باہر سماج میں پائے جاتے ہیں اور پھر مدرسہ کے اس ماحول کے ذریعہ بچہ کی ایسی تربیت دی جائے کہ وہ آئندہ سماج کا ایک مفید فرد ثابت ہو۔ فروبل کے اصولوں کو موجودہ نظام تعلیم کی جان سمجھنا چاہیئے۔ ہمارے موجودہ تعلیمی مفکروں میں "جان ڈیوی" اور "میڈم مانٹے سوری" دونوں انہیں اصولوں پر کام کر رہے ہیں۔

جدید دور کے تعلیمی رجحان کی ایک اور بڑی خصوصیت بھی ہے اور وہ جمہوریت کا اصول ہے۔ دنیا نے جمہوریت کو موجودہ معاشرت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اور جمہوریت رائے اور عمل کی آزادی پر مبنی ہے۔ انسانی معاشرت میں جمہوریت کے اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت میں تعلیم کا کیا مقصود ہو۔ اور یہیں ہماری ابتدائی تعلیم کا مقصد بھی معین ہو جاتا ہے۔ اگر ہم بچے کو سوسائٹی کا ایک زندہ رکن سمجھتے ہیں تو ہمیں تعلیم میں بھی جمہوریت ہی کے اصولوں کو اساس بنانا ہوگا۔ یعنی نظام تعلیم میں فکر اور عمل کی آزادی بچے کے لئے ضروری چیز ہوگی۔ لیکن بچے کو شخصی آزادی دینے کے ساتھ ہی ساتھ اس کی شخصیت کو سوسائٹی کے مفاد کے تابع بنانے کی بھی کوشش کرنی ہوگی تاکہ شخصی نشوونما کے ساتھ ساتھ اُس میں معاشرتی جذبات بھی اُبھریں اور ان تمام ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو جو سوسائٹی اس پر عائد کرتی ہے۔

شخصیت کے نشوونما کے لئے ہمیں ہر بچے کے امکانات اور صلاحیتوں پر جداگانہ نظر رکھنی ہوگی۔ اور انہیں انفرادی ضروریات کے مطابق اسکو تعلیمی موقع بہم پہنچانے ہونگے ساتھ ہی اجتماعیت کا احساس پیدا کرنے کیلئے مدرسہ کو سماج کا ایک چھوٹا نمونہ بنانا پڑے گا۔ جہاں انہیں مل جل کر کام کرنے کا موقع ملے۔ کھیل کے میدان میں بچوں کا جمع ہونا۔ آپس کے تحریری اور تقریری مقابلوں کیلئے یکجا ہونا۔ عملی کام میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا۔ تفریحی مشغلوں کے لئے مل کر بیٹھنا۔ مدرسہ کے انتظام میں مل جل کر مدد دینا۔ ایسی چیزیں ہیں جو بچوں میں اجتماعی احساس پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ایسی فضا میں وہ ضبط، ہمدردی، رواداری، سچائی اور پاکی کے عملی سبق سیکھ سکتے ہیں۔ اس کوشش کے سلسلہ میں مدرسوں میں بوائے سکاؤٹ، جونیئر ریڈ کراس اور فرسٹ ایڈ کی تحریکیں بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔

میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا یہ مغربی مفکروں کے نظریات تھے۔ اور آج دنیا میں ابتدائی تعلیم کے یہی مقاصد تسلیم کئے جاتے ہیں اور انہیں پر عمل ہو رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارا ملک عملی میدان میں غالباً سب سے پیچھے ہے۔ ہمارے یہاں شروع زمانہ ہی سے ابتدائی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہ کی گئی۔ قدیم ہند میں ہمیں ریاست کی طرف سے مرتب کیا ہوا کوئی باقاعدہ نظام تعلیم نہیں ملتا۔ یہاں بھی چونکہ مذہب کو اقتدار حاصل تھا اس لئے تعلیم پنڈتوں اور پجاریوں کے ہاتھ میں رہی اور اس کا مقصد صرف یہ رہا کہ آئندہ زندگی میں طالب علم ایک کامیاب پنڈت اور پروہت بن سکے اس تمام دور میں تعلیم کی یہ خصوصیت رہی کہ مذہبی جماعت کے افراد کے سوا کسی دوسرے کو تعلیم دینے کا حق نہ تھا اور نہ اونچے طبقہ کے سوا آبادی کے کسی دوسرے طبقہ کو تعلیم حاصل کرنے کا استحقاق حاصل تھا تعلیم مندروں اور دھرم شالاؤں میں دی جاتی تھی یہ اور ایک مخصوص طبقہ کی میراث تھی۔ عہد وسطیٰ میں جب مسلمانوں کی اس ملک میں حکومت قائم ہوئی تب بھی عام ابتدائی تعلیم کو ریاست کی طرف سے کوئی مدد نہ ملی۔ مندر اور دھرم شالاؤں کے ساتھ ساتھ مسجدیں اور خانقاہیں بھی تعلیم کی مرکز بن گئیں۔ لیکن ان سب تعلیم گاہوں کی خصوصیت ایک ہی تھی یعنی تعلیم کو بچہ کی اصل زندگی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور اس لحاظ سے ایشیا اور یورپ دونوں ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے۔

مسلمانوں کی حکومت کے بعد ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور آیا۔ اس زمانہ میں بھی تعلیم کا وہی حال رہا جو صدیوں سے چلا آتا تھا۔ البتہ اس دور میں جو عیسائی مبلغ اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے ہندوستان آئے۔ انہوں نے جا بجا ابتدائی تعلیم کے مدرسے جاری کئے اور اس طور پر عوام میں تعلیم کی ابتدا کی۔ کمپنی کی حکومت کے بعد جب ہندوستان برطانوی تاج کے زیر حکومت آیا تو تعلیم کو حکومت نے اپنے پروگرام کا ایک جزو قرار دیا۔ یہاں تک کہ اب ابتدائی تعلیم تمام تر حکومت ہی کی نگرانی میں چلتی ہے لیکن آج بھی یورپی ملکوں کے مقابلہ میں ہماری تعلیم بالکل بے جان ہے ہمارے یہاں نہ مدرسوں کا مطمح نظر اتنا بلند ہے اور نہ کام کے پورے پورے موقع انہیں حاصل ہیں۔ ہمارا ابتدائی تعلیم دینے والا مدرس عام طور پر بہت معمولی استعداد رکھتا ہے۔ وہ زمانہ کے حالات سے بہت کچھ بے خبر ہے۔ اسے بہت کم معلوم ہے کہ دنیا تعلیم کے میدان میں کہاں سے کہاں پہنچ چکی۔ تعلیمی نظریے کس طرح بدل چکے۔ اور تعلیمی طریقوں میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی ملکی اور قومی ضروریات کیا ہیں۔ اور ان کا اس کے پیشے سے کیا تعلق ہے۔ اس کی کل علمی کائنات تعلیم دینے کے وہ چند اصول ہیں جو اس نے اپنے ٹریننگ کے زمانہ میں سیکھے تھے۔ اور اب ان پر بھی کما حقہ عمل نہیں کرتا۔ مدرس کی اس بے پرواہی کی ذمہ داری بعض دوسرے حالات پر بھی ہے۔ اسے تنخواہ اتنی کم ملتی ہے کہ معاش کی فکر اس کا دامن نہیں چھوڑتی۔ اور وہ سکون اور دلجمعی کے ساتھ اپنے کام کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ پھر سماج میں اسے وہ عزت اور مرتبہ حاصل نہیں ہے۔ جس سے وہ یہ محسوس کرے کہ واقعی سماج اسے اپنا محسن سمجھتی ہے۔ اور سماج کو اس کے کام کی ضرورت ہے۔ اسکے علاوہ جس ماحول میں وہ کام کرتا ہے وہاں عام طور پر ناواقفیت اور جہالت چھائی ہوئی ہے۔ نہ عوام کو تعلیم سے دلچسپی ہے نہ خواص کو۔ یہ حالات بذات خود مدرس کے حوصلوں کو پست کرنے کیلئے کافی تھے۔ ان پر مستزاد معائنوں کا انتظام ہے۔ معائنہ کرنے والے حکام مدرس کے ساتھی، ہمدرد، رہبر اور مددگار بننے کی بجائے نکتہ چین بنکر مدرسہ میں آتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدرس اپنے تحفظ کی خاطر زیادہ ضابطہ کو پورا کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اور یہی ہمارے موجودہ نظام تعلیم کی سب سے بڑی بے بضاعتی ہے۔ مدرس کا کام اپنے آپ کو ہر موقع پر حق بجانب ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ بچہ کو سمجھنا اور اس کی سچی رہبری کرنا ہے ہمارے مدرسوں کے ان حالات نے تعلیم کے ساتھ بچہ کی دلچسپی کو بہت کم کر دیا ہے۔ چونکہ مدرسہ کی فضا بچہ کے فطری مطالبات کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اس لئے اسے مدرسے کے ساتھ وہ محبت پیدا نہیں ہوتی جو گھر کے ساتھ ہوتی ہے۔ حالانکہ مدرسہ اس کا دوسرا گھر ہے۔ استاد اس کے دوسرے ماں باپ ہیں اور جماعت کے ساتھی اسکے بھائی بہن ہیں۔ اب ان حالات میں کہ نہ سرپرستوں کو تعلیم کی ضرورت کا احساس ہے اور نہ بچوں کو مدرسہ کے ساتھ دلچسپی، ہم کسی بہتر نتیجہ کی کیا توقع کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے والے لڑکوں کی تعداد آٹھ فیصدی ہے اور لڑکیوں کی صرف تین فی صدی۔ مجموعی طور پر اگر تناسب لیا جائے تو ساڑھے سات فیصدی آبادی تعلیم یافتہ ہے

ابتدائی تعلیم پر ہمارا بہت سا روپیہ ضائع ہو رہا ہے۔ طالب علموں کو جبراً مدرسہ میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ اور یہاں ایک ایک جماعت میں کئی کئی سال رہ کر بسا اوقات اسی حالت میں مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں جس حالت میں وہ یہاں آئے تھے۔ ہندوستان میں ابتدائی منزل میں چوہتر فیصدی طلبہ ایسے ہوتے ہیں جو اس طرح قبل از وقت تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ کے شہر میں بھی ۱۹۳۵ء میں یہ تعداد چہتر فیصدی تھی اور اب بھی پچپن فیصدی ہے۔ جو بچے لکھنا پڑھنا سیکھ بھی جاتے ہیں ان کی سیرت میں وہ ہمہ گیری اور شخصیت میں وہ تنوع نہیں پیدا ہوتا جو آئندہ زندگی کے لئے ضروری ہے۔

یہ حالات اس وقت تک نہیں بدل سکتے جب تک مدرس اور سرپرست دونوں اپنی اپنی ذمہ داری کو پورے طور پر محسوس نہ کریں۔ مجھے یہاں مدرسوں سے کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے۔ البتہ سرپرستوں کی خدمت میں ضرور یہ گذارش کرونگا کہ وہ اپنی ذمہ داری کا بوجھ بھی مدرسہ ہی کے کاندھوں پر نہ رکھیں۔ بچہ مدرسہ میں جتنا وقت گذارتا ہے اس سے تین گنا زیادہ وقت گھر پر گذارتا ہے۔ اگر اس وقت میں اس کے اخلاق کی نگرانی نہ کی گئی تو ظاہر ہے کہ مدرسہ کی تعلیم و تربیت سب رائیگاں گئی۔ جب تک مدرسہ کو سرپرستوں کا اشتراک عمل حاصل نہ ہوگا تعلیم کی بے اثری دور نہیں ہو سکتی۔

بچہ کی تربیت کے سلسلہ میں ایک اور بہت ضروری چیز جس میں استاد اور سرپرست

کا اشتراکِ عمل ضروری ہے۔ فرصت کے اوقات کا صرف ہے اور غالباً تربیت کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ بچّوں کو موقع ملنا چاہیئے کہ گھر اور مدرسہ دونوں جگہ وہ اس وقت کو آزادی کے ساتھ صرف کرسکیں۔ لیکن وقت کا مصرف مفید ہو۔ اُن کیلئے مل بیٹھنے کی جگہ ہونی چاہیئے۔ پڑھنے سُننے کیلئے کتابیں ہوں اور کھیلنے کا سامان ہو۔ ساتھ ہی اگر اُستاد اور سرپرست بچّہ میں یہ شوق پیدا کردیں کہ وہ اپنے لئے کوئی تفریحی مشغلہ مقرر کرے جسے (Hobby) کہتے ہیں۔ اور اس ہابی کیلئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تو بچّہ کا وقت نہایت کار آمد طریقہ پر گذر سکتا ہے۔ اور دماغ ہر طرح کے بُرے خیالات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

بچّہ کی ابتدائی تربیت میں ایک اور چیز بھی ہے جس میں مدرس کو سرپرستوں کی امداد کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ بچّہ کی گھر کی تربیت اور خاندانی حالات اور وہ ماحول جس میں وہ مدرسہ کے باہر اپنا وقت گذارتا ہے۔ بسا اوقات اس کے اندر بعض ایسی نفسیاتی گتھیاں پیدا کردیتے ہیں کہ ان کو اگر سلجھایا نہ جائے تو تربیت کا کام قطعاً ناممکن ہوجاتا ہے۔ مثلاً بعض بچّے چوری کرنے لگتے ہیں۔ بعض جھوٹ بولتے ہیں بعض شرمیلے ہوتے ہیں اور بعض میں سینہ زوری ہوتی ہے۔ ان اخلاقی بُرائیوں کے اسباب اکثر و بیشتر گھر کی فضا اور مدرسے کے باہر کے ماحول میں ملتے ہیں۔ ان کی اصلاح کیلئے سرپرستوں کو اُستادوں کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ ان کی مدد کے بغیر ان پیچیدگیوں کا حل ناممکن ہے۔

میں اخیر میں پھر یہ عرض کروں گا کہ ہمارا نظام تعلیم مدت سے اصلاح کا محتاج ہے۔ اگر ہمارے پڑھے لکھے سرپرستوں نے اس طرف توجہ نہ کی اور حکومت اور اُستادوں کا ہاتھ نہ بٹایا تو یہ خرابیاں بڑھتی جائیں گی۔ اور اس سے ہماری قومی زندگی کو جو نقصان پہنچے گا اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

کلامِ ماہرؔ

(جناب ماہرالقادری صاحب)

غزل

رحمت کو اُن کی جوش میں لانے کی دیر ہے
یعنی سرِ نیاز جھکانے کی دیر ہے

پینے کی دیر ہے نہ پلانے کی دیر ہے
ساقی کے بس نگاہ اُٹھانے کی دیر ہے

پروانے آہی جائیں گے کھنچ کر بہ جبرِ عشق
محفل میں صرف شمع جلانے کی دیر ہے

وہ بھی تڑپ نہ جائیں تو اس عاشقی پہ خاک
مجھ سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے

جامِ شراب، مست گھٹا، مطرب و بہار
سب آچکے ہیں آپ کے آنے کی دیر ہے

چلمن کی بندشوں میں وہ شاید نہ رُک سکیں
ماہرؔ کے صرف شعر سنانے کی دیر ہے

دکن کی برسات

ہوائیں مسکراتی جارہی ہیں   گھٹائیں لڑکھڑاتی جارہی ہیں
بہ عنوانِ تراوشں نرم بوندیں   پکھاوج سی بجاتی جارہی ہیں

دلِ پُر درد کی دیرینہ چوٹیں
اُبھر کر کام آتی جارہی ہیں

چمن کا پتّہ پتّہ دُھل رہا ہے   اندھیرے میں اُجالا گھل رہا ہے
کسی بدمست دوشیزہ گھٹا کا   سرِ کہسار جوڑا کھل رہا ہے

خوشی ماحول پر چھائی ہوئی ہے
کہ پھولوں میں زمانہ تل رہا ہے

پپیہا اک قیامت ڈھا رہا ہے   بڑے اونچے سُروں میں گا رہا ہے
ارے یہ گرمیٔ کیفِ مسرت   گھٹاؤں کو پسینہ آرہا ہے
بہت ہلکی پھواریں پڑ رہی ہیں   کہ جیسے عطر چھڑکا جارہا ہے

میں خود ہوں اپنے تیروں کا نشانہ
کوئی میری غزل کو گا رہا ہے

جگر میں درد پایا جارہا ہے   مجھے شاید ستایا جارہا ہے
نقابِ رُخ اُٹھایا جارہا ہے   وہ نکلی دھوپ سایا جارہا ہے
رواں اس غم میں ہیں شبنم کے آنسو   کلی کو کیوں ہنسایا جارہا ہے
مریضِ غم کو آکر دیکھ جاؤ   کہ تم پر حرف آیا جارہا ہے

سُناتے ہو کسے روداد ماہرؔ
وہاں تو مسکرایا جارہا ہے

غزل

وہ ہنس ہنس کے وعدے کئے جارہے ہیں
فریبِ تمنّا دیئے جارہے ہیں

ترا نام لے کر جئے جارہے ہیں
گناہِ محبت کئے جارہے ہیں

مرے زخمِ دل کا مقدر تو دیکھو
نگاہوں سے ٹانکے دیئے جارہے ہیں

نہ کالی گھٹائیں نہ پھولوں کا موسم
مگر پینے والے پیئے جارہے ہیں

تری محفلِ ناز سے اُٹھنے والے
نگاہوں میں تجھ کو لئے جارہے ہیں

ابھی ہے اسیری کا آغاز ماہرؔ
ابھی تو فقط پر سیئے جارہے ہیں

صنعتی تعلیم

(از مسٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ووڈ پرنسپل دہلی پولی ٹیکنک)

ہمارے ملک میں اور دوسرے ملکوں میں بھی صنعتی تعلیم تین اداروں کے ہاتھوں میں ہے۔ یعنی سکول، کالج یا پھر کارخانوں کے مالک۔ انہی تینوں کے سایئے میں تعلیم پاکر وہ نوجوان نکل رہے ہیں جو بعد کو دستکار، فورمین یا انجینیر بن کر اپنے فرائض انجام دینگے۔ دستکار پرائمری سکول، صنعتی سکول یا حکومت کی طرف سے قائم کی ہوئی ٹکنیکل ٹریننگ سکیم کی پیداوار ہے۔ فورمین صنعتی ہائی سکولوں سے آتا ہے اور انجینیر یونیورسٹی، ٹکنیکل کالج یا پھر پولی ٹیکنک کی پیداوار ہوتا ہے۔ یہ ادارے ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ پرائمری سکول کا ایک لائق لڑکا کسی ٹکنیکل ہائی سکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کرسکتا ہے۔ وہاں گیارہ سال کی عمر کے بعد چھ سال کا نصاب پورا کرکے سترہ سال کی عمر میں کسی ٹکنیکل کالج کے شعبہ انجینیرنگ میں یا پولیٹیکنک یا یونیورسٹی میں داخل ہوسکتا ہے۔ یونیورسٹی کا تعلق زیادہ تر تعلیم اور تحقیق سے ہوتا ہے۔ اور پولیٹیکنک میں صنعتوں کے انتظام اور نگرانی کا کام سکھایا جاتا ہے۔

اس طرح ہمارے طالب علم تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک فورمین۔ دوسرے انجینیر یا نگراں اور تیسرے ریسرچ کے طلبا۔ انجینیر آخری دو اداروں سے مہیا ہوتے ہیں۔ مگر ان تینوں اداروں میں اپنے مخصوص امتحانات ہوتے ہیں۔ انکا نصب العین تعلیمی طور پر قوم اور عوام کا مفاد ہونا چاہیئے۔

ایک ایسے لڑکے کے لئے جو قابلیت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ ہر قسم کی صنعت کھلی ہوئی ہے جس سے وہ اپنے حوصلے اور خواہش کے مطابق کام لے سکتا ہے۔ جب کوئی لڑکا ٹکنیکل ہائی سکول سے نکلتا ہے۔ اور ایسا ہی ایک سکول ہم دلی میں کھول رہے ہیں تو عام طور پر مختلف صنعتوں پر مزید ٹریننگ اور کام سیکھنے کے لئے ٹکنیکل کالج یا پولیٹیکنک میں چلا جاتا ہے جہاں وہ اس قابل بن جاتا ہے کہ مختلف صنعتوں میں فورمین نگراں اور انجینیر کے اہم فرائض انجام دے سکے۔ ظاہر ہے کہ آج کل موجودہ حالات میں ایک ایسے شخص کی کس قدر ضرورت ہے جو مختلف صنعتوں میں مشینوں اور مزدوروں سے کام لیکر موجودہ ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرسکے۔

ٹکنیکل سکول میں لڑکے گیارہ سال کی عمر میں داخل ہوتے ہیں۔ اور تین سال تک ہائی سکول کی قسم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ یہاں تعلیم کا پہلو زیادہ عملی ہوتا ہے۔ تین سال پورے کرکے ایک لڑکا اگر یہ سمجھتا ہے کہ صنعتی تعلیم کے لئے اس کی طبیعت موزوں نہیں ہے تو کسی تعلیمی ہائی سکول میں منتقل ہوسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح تین سال پورے کرکے ایک لڑکا ایک تعلیمی ہائی سکول سے نکل کر ٹکنیکل ہائی سکول میں داخل ہوسکتا ہے بشرطیکہ جگہ خالی ہو۔ نو عمری میں داخلے سے یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ اوائل عمری سے جب کہ ان میں قدرتی طور پر بہت لچک ہوتی ہے۔ ہاتھوں سے کام کرنے کے اور اس میل کچیل کے عادی ہوجاتے ہیں جو چہرے اور جسم پر جاتا ہے۔ باقی تین سال میں ان کی تعلیم پچاس سے ساٹھ فی صدی تک پیشہ سے متعلق مضامین پر مشتمل ہوتی ہے۔ مثلاً انجینیرنگ سائنس۔ انجینیرنگ ڈرائنگ۔ عملی چوبی کام۔ انجینیرنگ ورک شاپ۔ رنگائی۔ کتائی۔ چھپائی وغیرہ وغیرہ۔ اور ان میں سے جو کام بھی وہ پسند کریں اپنے لئے منتخب کرسکتے ہیں۔

سکول کی تعلیم ختم کرنے پر انہیں ایک سرٹیفکیٹ ملے گا جس کی بنا پر وہ دوسری قسم کی تعلیم حاصل کرنے کے مستحق ہونگے۔ یہ سرٹیفکیٹ ہر ادارے کا اپنا مخصوص سرٹیفیکیٹ ہوتا ہے مگر جوں جوں ہندوستان میں اور ٹکنیکل ہائی سکول کھلیں گے یہ بھی ممکن ہوسکے گا کہ ان سکولوں میں باقاعدہ نظام کے ساتھ امتحانات ہوا کریں اور بالکل اسی صورت سے جیسے کہ میں آپ کے سامنے تشریح کروں گا اور جس کے لئے پولیٹکنک طلباء کے لئے بھی زور دونگا۔

پولٹیکنک میں لڑکے سترہ سال کی عمر کے بعد داخل ہوتے ہیں۔ اس پانچ سال میں یا تو وہ پورے وقت کی تعلیم سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ یا اگر کسی صنعت میں کام کررہے ہیں تو صرف مقررہ اوقات میں مثلاً ہفتہ میں چودہ یا سات گھنٹے۔ دن میں ایسے لڑکوں کو یا تو کارخانہ داروں سے سمجھوتہ کرکے تعلیم کا وقت مقرر کیا جاتا ہے یا پھر شام کو تعلیم دی جاتی ہے۔ جب انہیں بالکل فرصت ہو۔ پہلی صورت میں یہ فائدہ رہتا ہے کہ لڑکا دن بھر کے کام سے خستہ و چور نہیں رہتا۔ انگلستان میں خود میرے کالج میں یہ سکیم بہت کامیاب ثابت ہوچکی ہے۔ صرف ایک ہی فرم جو عملی اقدام کے شروع میں پندرہ لڑکوں کو ہفتہ میں ایک دن بھر کے لئے بھیجتی تھی۔ بعد کو سو لڑکے فی ہفتہ ایک دن کے لئے بھیجنے لگی۔ آگے بڑھ کر جب میں نے کالج اور ان لڑکوں کی پڑھائی تعلیم کی میعاد پانچ سال کی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان کو اس دن کی مزدوری بھی ملتی تھی اور اگر

ان کی اچھی رپورٹ ہوتی تھی تو اُن کو تعلیم کی فیس بھی دی جاتی تھی۔ یہ پانچ سال کا کورس دو حصّوں میں تقسیم تھا۔ ایک تین سال کا، دوسرا دو سال کا۔ پہلے حصّہ تعلیم کے اختتام پر ایک سرٹیفکیٹ اور اسی طرح دوسرے کے اختتام پر ایک دوسرا سرٹیفکیٹ ملتا تھا۔ پورے کورس کے ختم پر تین سال اور پانچ سال بعد باقاعدہ ڈگری بھی جو آئندہ انٹرمیڈیٹ اور بی، اے کی ڈگری کے برابر سمجھی جاتی تھی۔

اگر مدراس کا ایک کارخانے کا مالک کسی ایسے شخص کو ملازم رکھنا چاہتا ہے جس نے دہلی کے کسی کارخانے میں تعلیم حاصل کی ہے تو اُس شخص کو ایسا سرٹیفکیٹ پیش کرنا پڑیگا جسکی اہمیت مدراس میں بھی اسی قدر ہو جتنی دلی میں۔ یعنی جس کا سرٹیفکیٹ آل انڈیا ہونا چاہیئے۔ اگر بمبئی میں کسی کارخانے کے مالک کے سامنے بنارس، کلکتہ یا مدراس کے فارغ شدہ امیدوار ہوں تو اسے ان مقامات کی مختلف ڈگریوں اور سرٹیفکیٹوں میں کوئی خاص امتیاز نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ان کی اہمیت بہرحال برابر ہوگی۔ ان باتوں سے قطعاً یہ نہ سمجھا جائے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ سب کا ایک ہی امتحان بھی ہو۔ البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ معیار ایک ہو۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں صرف امتحانات کے نتائج کی بنا پر سرٹیفکیٹ دے دینا عملی طور پر کچھ زیادہ مفید بات نہیں ہے۔ اور خصوصاً جہاں تعلیم کا پہلو بالکل عملی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ امتحان کی خاطر ایک لڑکا زبانی سب کچھ طوطے کی طرح رٹ لے۔ پرچوں کے جواب بھی صحیح صحیح دیدے۔ اور اس کے بعد سب کچھ بھول جائے۔ سرٹیفکیٹ کے ساتھ یہ شرط ہونی چاہیئے کہ جس لڑکے کو دیا جائے اس کا کام کلاس اور لیبریٹری میں بھی اچھا رہا ہو۔ پولیٹیکنک میں جو طالب علم داخل ہوتا ہے اسکا شمار صنعتی تعلیم میں ہوگا۔ کیونکہ وہ اپنے وقت کا پانچواں یا چھٹا حصّہ پولیٹیکنک کی ہدایات اور تعلیم پر صرف کرتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس عرصہ میں اسے نئی نئی مشینیں چلانے کا کام سیکھنے اور تجربات کرنے اور بہترین تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اس کے لئے جس بات کی زیادہ ضرورت ہے وہ ہے علمی اور لیبوریٹری میں عملی تعلیم۔ خصوصاً یہ ضروری ہوگا۔ ایسے طالب علم کیلئے جو پولی ٹیکنیکل ہائی سکول سے نکلا ہو۔ اور جس نے سکول کے آخری تین سال تک ہفتہ میں چھ گھنٹے کسی ورک شاپ میں عملی کام کیا ہو۔ یہ لڑکا کسی فیکٹری میں جانے سے پہلے ایک اچھا مستری بنجائیگا عملی سرٹیفکیٹ پولیٹیکنک کے اُستاد پہلے، دوسرے اور چوتھے سال کی تعلیم کے بعد امتحان لے کر طالب علموں کو دیا کرینگے۔ ان امتحانات کے نتائج ہی پر طالب علموں کو تیسرے اور پانچویں سال کی جماعتوں کے لئے ترقی دی جائے گی۔

اگر انجنیرنگ کورس کے لئے تمام وقت کے بجائے مخصوص اوقات میں تعلیم حاصل کرنی مطلوب ہو تو ایسی صورت میں کسی ورک شاپ میں عملی تعلیم پر بھی کافی وقت صرف کرنا ہوگا۔ پھر یہ طالب علم تیسرے یا پانچویں سال کے بعد کسی صنعت میں داخل ہونے کا مجاز ہوگا۔ چونکہ اب ایک ڈگری بھی اس کے پاس ہوگی اس لئے اسکی وقعت اور اہمیت اور زیادہ ہوگی۔

ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ مقررہ اور مخصوص اوقات کا طریقۂ تعلیم بہتر ہے ہر چند کہ ایسی بھی صورتیں ہوتی ہیں جن میں انجنیرنگ کیلئے ڈپلوما سکیم کا طریقہ ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ ڈپلوما انہیں اصولوں پر دیا جائیگا جن پر مقررہ اوقات کی تعلیم کے سرٹیفکیٹ دیئے جائینگے۔ یہ سرٹیفکیٹ آل انڈیا سرٹیفکیٹ ہونگے۔ ایک ڈپلوما کے طالب علم کے لئے بہترین لیبوریٹری اور اعلیٰ درجہ کی مشین مہیا ہونی چاہیئے۔ کم مایہ اداروں کو اس کورس کی بآسانی ذمہ داری نہ لینی چاہیئے۔

قطعی اور فیصلہ کن طور پر تو ہم نہیں کہہ سکتے مگر اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ سرٹیفکیٹ کورس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے فورمین اور چارج مین تیار ہوں جو صنعتوں میں منیجری اور انتظامی امور بخوبی انجام دے سکیں۔ ایک ایسے فرد کیلئے معلومات کے ساتھ جسمانی چستی اور پھرتی بھی ضروری ہوگی۔ تاکہ جوں ہی اسے احکام ملیں وہ انتہائی تیزی سے ان پر عمل کر سکے۔ اور دستکاروں تک انہیں پہنچادے۔ پھر اسکی ترقی کی راہ کھلی ہوئی ہے۔

منیجر کو خود ایک اچھا عملی انسان ہونا چاہیئے۔ ایسے لوگ زیادہ تر اُونچے طبقے سے آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جوں جوں ان کی انتظامی ذمہ داریاں بڑھیں انکی عملی صلاحیت اور ہوشیاری میں کمی واقع ہو جائے۔ مگر انہیں بہرحال کارخانوں کا تجربہ ہوتا ہے اور دراصل یہی ایسی جگہوں کیلئے مناسب اور موزوں بھی ہوتے ہیں ایک ایسا طالب علم جس نے سارے وقت کا ڈپلوما کورس پورا کیا ہو منیجری یا انتظامی جگہ تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اگر اسے تجارتی تعلیم بھی ملی ہو جو اسکے کورس میں ضرور شامل ہونی چاہیئے تو فیکٹری کا کچھ عرصہ تجربہ کرنے اور وہاں کے حالات اور طریقۂ کار سے باخبر ہونے کے بعد وہ فروخت اور نکاس کے کام کیلئے نہایت موزوں ہوگا۔ بلاشبہ یہ بھی تجارت و صنعت کا بہت اہم پہلو ہے۔

کچھ ایسی صنعتیں بھی ہوتی ہیں جن میں اتنی زیادہ چابکدستی اور ہوشیاری کی ضرورت نہیں ہوتی جیسی انجنیرنگ میں ہوتی ہے۔ مثلاً شکر کی صفائی۔ صابن اور سرکہ بنانا۔ یا چمڑا بنانے کا کام۔ ایک ایسی صنعت کے اوورسیر کے لئے صرف اسی قدر کافی ہوگا کہ اُس نے ہائی سکول چھوڑنے کے بعد ایک یا دو سال باقاعدہ ٹیکنیکل یا معلوماتی تعلیم حاصل کی ہو۔

ایسی صنعتیں جہاں کثیر تعداد میں اشیاء تیار کی جاتی ہوں وہاں کام کرنے کیلئے مخصوص تعلیم سے زیادہ بنیادی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر جو شخص کپڑے کی صنعت میں رنگائی کے کام کے لئے جائیگا اُس کیلئے صنعتی کیمیا (انڈسٹریل کیمسٹری) جاننا ضروری ہوگا۔ چمڑے کی صفائی اور رنگائی اور صابن کی صنعت میں جانے والے کو بھی یہی صنعتی کیمیا سیکھنی ہوگی۔

بہرحال ہر صورت میں خواہ ایک شخص انجینیرنگ کی پوری وقت کی تعلیم حاصل کرے خواہ کپڑے کی صنعت یا صابن، شکر، چمڑے وغیرہ کی صنعت سیکھے۔ اسے تعلیم کے اختتام پر ایک آل انڈیا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوگا۔

بعض ... آخر میں آئیے دیکھیں کہ یونیورسٹی میں جو باقاعدہ طور پر انجینیرنگ کی جماعتیں ہیں۔ وہ دوسرے ٹیکنیکل شعبوں سے کس حد تک مختلف ہیں۔ ان کے درمیان ایک بڑی حدِ فاصل قائم کرنا شاید مناسب ہوگا۔ لیکن میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ فرق اسی قدر ہے کہ ایک جگہ تو انجینیرنگ کی تعلیم تمام اصولوں کے ساتھ بحیثیت ایک مضمون کے دی جاتی ہے اور دوسری جگہ ... مثلاً ٹانچسٹر میں اس طور پر تعلیم دی جاتی ہے۔ جس کا مخصوص صنعتوں سے عملی تعلق ہوتا ہے۔ یہ طریقہ تعلیم اپنی نوعیت سے پولیٹیکنک یا کالج کے طریقہ تعلیم سے قریب ہوجاتا ہے۔ امتحانات کے پراسپکٹس میں ٹکنیکل شعبوں کے لئے ڈگری کے معیار اور ان ٹیکنیکل کالج کی ڈگریوں میں جن کا اُوپر میں نے تذکرہ کیا ہے۔ ایک قریبی رابطہ ہونا چاہیئے۔

یونیورسٹی کی انجینیرنگ ڈگری کے لئے ضروری ہے کہ مضمون کے متعلق زیادہ وسیع معلومات ہونی چاہیئے۔ اور تجربہ اور ریسرچ کے کافی مواقع فراہم ہوں۔ اس میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ اگر یہ کام بسہولت انجام پاتے رہیں۔ اس میں ایک گریجوایٹ کے لئے فوری طور پر تو اقتصادی یا مالی فائدہ نہیں ہوتا مگر ایسے گریجویٹ کا شمار یقیناً صنعت کے لیبوریٹریوں میں تحقیقی کام کرنے والوں میں کیا جاتا ہے۔ جو آئندہ چل کر صنعت کے منتظمین ہوں گے۔

سُلطان حیدر علی والیٔ میسور

مشہور فرانسیسی جنرل موسیولالی جو سُلطان کی فوج میں بڑا عہدہ دار تھا لکھتا ہے ... کی صحت اکثر خراب رہتی تھی جس کی طرف سے وہ ہمیشہ غفلت برتنے پر مجبور تھا۔ ملکی انتظامات، چاروں طرف سے دشمنوں کی یورش اور کام کرنے کا شوق اسے موقع نہیں دیتا تھا کہ وہ اپنی صحت کی طرف توجہ کرے۔ اُسے چیچک نکل چکی تھی چھوٹے بڑے دانے اکثر اسکی جلد پر نمودار ہوجایا کرتے تھے۔ فرانسیسی ڈاکٹر اور مقامی حاذق الحکما کی رائے تھی کہ سلطان کا خون خراب ہے۔ وہ چند روز آرام کرے اور خون کی خرابی کا علاج کرے۔ مگر اسکی نوبت کبھی بھی نہیں آئی۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ سُلطان کا کس مرض میں انتقال ہوا؟ سلطان کی کمر میں سرطان کا پھوڑا نکل آیا تھا۔ یہی خوفناک پھوڑا جان لیوا ثابت ہوا اور یہ چراغ گُل ہوگیا۔ ... خون کی خرابی ... کی شکل میں نمودار ہوتی تھی۔ گرمی کے موسم میں چیچک، خسرہ، پھوڑوں، پھنسیوں، داد، خارش ... زور ہے مشہور عالم سائنٹی فک طریقے سے قیمتی بجلی کی مشینوں پر بنی ہوئی صافی ان خوفناک بیماریوں ... کے خطرے کو بھی روک دیتی ہے۔ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے مچھلیاں پانی کے بجائے خشکی میں ... خون صاف کرنے کی صافی سے بہتر دوا نہیں مل سکتی۔
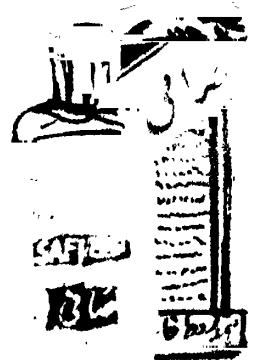
غزلیات

جناب نخشب جارچوی

(۱)

شکایت بھی کہیں اُلفت میں منہ پر لائی جاتی ہے
مدد اے ضبطِ غم دل سے زباں شرمائی جاتی ہے

یہ کہہ کر طبیعت ہجر میں بہلائی جاتی ہے
فغاں آساں ہے لیکن دور تک رسوائی جاتی ہے

مجھے اس کم نگاہی نے تری پامال کر ڈالا
مگر مجھ پر وہی پہلی نظر ٹھہرائی جاتی ہے

جھجک کر گفتگو کرنا ہے اپنا راز کہہ دینا
اسی نازک سے پردے میں تمنا پائی جاتی ہے

[illegible] وہی [illegible] ہر اک [illegible] وہی جلوہ
[illegible] میں محبت چھائی جاتی ہے

غمِ ہستی بجز تمہیدِ عشرت کچھ نہیں ہوتا
[illegible] دل کی خاطر زندگی تڑپائی جاتی ہے

[illegible] پنہاں
[illegible] جاتی ہے

[illegible] عشق [illegible] آخر [illegible] روی ٹوٹا
[illegible] سے تحریک [illegible] جاتی ہے

[illegible] شرحِ آرزو کر
[illegible] جاتی ہے

[illegible] مجھ کو رلائے گا نخشب
[illegible] اُن کی بھی آنکھوں میں نمی سی پائی جاتی ہے

(۲)

ابھی [illegible] کے آثار پائے جاتے ہیں
[illegible] وہ آئے جاتے ہیں

جو کیف بن کے زمانے پہ چھائے جاتے ہیں
وہ گیت سازِ رگِ جاں پہ گائے جاتے ہیں

فریبِ عشق پہ جو ہنستے ہیں وہ کیا جانیں
یہ دھوکے سوچ سمجھ کر ہی کھائے جاتے ہیں

حریمِ ناز ہے یہ جلوہ گاہِ طور نہیں
یہاں نظر ہی میں دل آزمائے جاتے ہیں

وہ آ رہے ہیں نہ آئیں گے یہ یقیں ہے مگر
ہم اپنی بزمِ تصور سجائے جاتے ہیں

ابھی اُمید ہے ایفائے عہد کی مجھ کو
ابھی سے تارے یہ کیوں جھلملائے جاتے ہیں

وہ کہتے ہیں مرے اشعار سُن کے اے نخشب
غزل کی آڑ میں شکوے سُنائے جاتے ہیں

(۳)

محبت میں [illegible] حد کا کس کو ہوش رہتا ہے
[illegible] کچھ [illegible] سر و پا دوش رہتا ہے

کوئی دانستہ اُن کے روبرو بے ہوش رہتا ہے
وہ جب تک سامنے رہتے ہیں کس کو ہوش رہتا ہے

[illegible] شوق [illegible] ہوش رہتا ہے
[illegible] خراب ہوش رہتا ہے

کوئی اُن کو سمجھ بھی لے تو پھر سمجھا نہیں سکتا
جو [illegible] جاتا ہے وہ خاموش رہتا ہے

[illegible]
اسی کو وہ [illegible] ہیں جو بے ہوش رہتا ہے

ازل ہی سے ہے تحریکِ جنوں پر حسن آمادہ
کہ ہر گل نظر آتا کھولے ہوئے آغوش رہتا ہے

مقامِ عشق میں نخشب کہاں یہ [illegible]
نہ میں بے ہوش رہتا ہوں نہ مجھ کو ہوش رہتا ہے

میں دِلّی ہُوں!

ہارڈنگ لائبریری کی ادبی سوسائٹی کے سالانہ جلسے میں حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کا مقالہ جو ۲۸ مارچ ۱۹۴۳ء کو پڑھا گیا

جلسے کے صدر چیف جسٹس فیڈرل کورٹ سر مارس گائر تھے۔ دلی کے انگریز حکام بھی موجود تھے۔ انگریز یاموں ہائی صاحب۔ وصدر کو مخاطب کرکے، ہندوستانی بھائی صاحبان، (حاضرین کو مخاطب کرکے) خواجہ صاحب نے کہا میرے باپ دادا ساڑھے سات برس سے دلی میں رہتے ہیں۔ اس لئے مجھے حق ہے کہ میں کہوں کہ میں خود دلی ہوں۔ اس لئے کہتا ہوں کہ میں دلی ہوں

میں دلی ہوں۔ ہندوستان سے بولتی ہوں۔ میں ہندو ہوں۔ میں ترک ہوں میں افغان ہوں۔ میں مغل ہوں۔ اور اب میں انگریز بھی ہوں۔ میں آرین قوموں کا دل ہوں میں ایران و یونان و ترکستان و توران و عرب کا بازو ہوں۔

میں دُنیا کا ایک نامی شہر ہوں۔ اُجڑتی ہوں پھر بس جاتی ہوں۔ ویران ہوتی ہوں۔ پھر آباد ہو جاتی ہوں۔ میں جمنا کے کنارے بستی ہوں۔ میری ہی نسبت اکبر الہ آبادی نے کہا ہے ؎

مری نظروں میں اب کچھ رنگ دہلی جم نہیں سکتا
وہی مٹی کے تودے ہیں وہی جمنا کا پانی ہے

مری حرکت میں برکت ہے

دنیا کے سب شہر ایک جگہ گڑے رہتے ہیں مگر میں حرکت میں رہتی ہوں کیونکہ حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ اور میری اتنی زیادہ عمر ہونے کا راز بھی یہی ہے کہ میں حرکت کرتی رہتی ہوں۔ میری حرکت شرق و غرب کی حرکت نہیں ہے۔ بلکہ شمال و جنوب کی حرکت ہے۔ یعنی میں کبھی جنوب میں آباد ہوتی ہوں اور کبھی شمال کی طرف حرکت کر کے آباد ہو جاتی ہوں۔ اور پھر جب حرکت میں آتی ہوں تو شمال سے جنوب کی طرف حرکت شروع کرتی ہوں۔

آج کل میں شمال سے جنوب کی طرف چل رہی ہوں۔ اور جب کوے بگلے بن جائینگے۔ اور جب بگلے مچھلیاں کھا کر اپنے دیس کو چلے جائیں گے تو میں جنوب کی طرف اور بڑھونگی۔ اور ایک ایسا لباس اختیار کرونگی کہ میرا شناخت کرنا مشکل ہو جائیگا اور کسی کی طاقت اور مجال نہ ہوگی جو مجھ سے کہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

(تو جیسے چاہے کپڑے پہن لے۔ میں تو تیرے قد کے انداز سے پہچان لیتا ہوں کہ تو کون ہے) کیونکہ آئندہ زمانے میں میرا لباس نہ ترکی ہوگا۔ نہ افغانی۔ ہندو ہوگا نہ مسلمانی۔ انگریزی ہوگا نہ جاپانی۔ بلکہ میں آسمانی رنگ کا جوڑا پہن لونگی۔ اور چہرے پر گھونگٹ ڈال کر کہونگی ؎

خسرو غریب است و گدا افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہرِ خدا سوئے غریباں بنگری

بیچارہ خسرو تمہارے شہر میں آن پڑا ہے۔ کیا ممکن ہے کہ تم مجھ جیسے غریبوں کی طرف بھی نظر اُٹھا کر دیکھ لو۔

چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات

میں چار دن کی چاندنی بھی ہوں۔ اور شاہجہاں کے جشن ماہتابی کو دیکھ چکی ہوں اور اندھیری رات بھی ہوں۔ چاند سی صورتوں کو اپنی گلیوں میں ٹھوکریں کھاتے دیکھا ہے میں نے اندرپت کے پُرانے قلعہ میں سری کرشن جی کو دیکھا تھا۔ ان کی چاند سی صورت۔ موہنی مورت دیکھ رہی تھی۔ راجہ یدھشٹر کا [illegible] شاہی دربار تھا سارے ملک کے چھوٹے بڑے راجہ جمع تھے۔ جراسندھ کے سپہ سالار ششوپال نے سری کرشن جی کی شان میں گستاخی کی۔ اور کرشن جی کے چکر سے سر کٹوایا۔ جوئے کی بازی ہوئی۔ مہابھارت

...یم یہیں سے شروع ہوئی۔ پھر محمود غزنوی گھوڑوں کی ٹاپوں سے خاک ... چھاتی کو روندتا ہوا متھرا چلا گیا۔ پھر پرتھی راج کی فوج نے لال کوٹ قلعہ ... قطب الدین ایبک شہاب الدین غوری کے ترک غلام سے لڑائی لڑی ... جیت گیا۔ اس نے قطب مینار بنایا۔ اور غلام بادشاہت کا سکہ چلایا ... ت میں جنوب میں تھی۔

غلام خاندان کے آخری بادشاہ کیقباد نے لوک ہری نام کا محل مجھے شرق میں جمنا کے کنارے بسایا۔ اس کو خلجی نے مارا۔ اور علاء الدین خلجی ... کی طرف قطب مینار کے قریب مجھے سری نام سے آباد کیا۔ جسکو مسلمان ... تھے۔ کیونکہ لفظ "سری" یعنی پاک شہر کے مطلب کو نہ سمجھتے تھے۔

اس کے بعد تغلق آئے اور سری سے بہت دور جنوب میں جاکر تغلق آباد ... مجھے آباد کیا۔ اور جمنا کے کنارے ایک قلعہ کوٹلہ ... کے نام سے بنا کیا۔ پھر لودھی آئے اور انہوں نے سری کو رونق دی اور میں دور دور تک ...

تیمور آیا اور فیروز شاہ کے کوٹلے کے سامنے افغانوں سے لڑائی ہوئی۔ پھر ... لودھی پانی پت میں بابر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور بابر کے بیٹے ہمایوں کو شیر شاہ نے بھگا دیا۔

پھر شیر شاہ نے اندرپت کے پرانے قلعہ کو بنیاد سے اٹھایا۔ اور "دین پناہ" ... ایک مسجد اور مکانات بنوائے۔

ہمایوں ایران سے واپس آیا تو میں شمال کی طرف چل رہی تھی۔ وہ بھی پرانے ... ٹھیرا۔ اور شیر شاہ کے بنائے ہوئے "شیر منڈل" سے گر کر مرگیا۔

ہمایوں کا بیٹا اکبر آگرے میں رہا۔ جہانگیر لاہور میں مرا۔ مگر یہ دونوں بھی میری ... ادی کی رونق بڑھاتے رہے۔ پھر جہانگیر کا بیٹا شاہجہاں آگرے سے میرے ہاں آیا۔ اور ... نے کہا۔ جنوب سے چل اور شمال میں آ۔ میں آگے بڑھی اور شاہجہاں آباد کے نام سے ... بس گئی۔ شاہجہاں نے میرے اندر لال قلعہ بنایا۔ جامع مسجد بنائی اور مجھے خوب آراستہ کر دیا۔

میری گود میں جامع مسجد بن چکی۔ تو میر عمارت نے شاہجہاں کو خبر دی اور کہا ... لاکھوں بلیاں پاڑ میں ہیں۔ ہزاروں پتھر مسجد کی تعمیر سے بچے ہوئے صحن میں ہیں۔ دو ہفتے میں صاف ہو جائیں گے۔ تو حضور وہاں جاکر جمعہ کی نماز ادا فرمائیں۔

شاہجہاں نے خفا ہو کر کہا کہ آج بدھ ہے پرسوں جمعہ کو ہم وہاں نماز پڑھیں گے۔ ابھی انتظام شروع کرو۔ وزیر اور میر عمارت نے بادشاہ کے تیور دیکھکر ہاتھ جوڑے۔ اور عرض کی۔ جہاں پناہ کے اقبال سے پرسوں تک صفائی ہو جائیگی۔ شاہجہاں نے حکم دیا کہ ہماری ہندو مسلمان رعایا اور فوج کے ہندو مسلمانوں کو خبر دیدو کہ ہم نے مسجد تیار ہو جانے کی خوشی میں پاڑ کا سامان اور بچے ہوئے پتھر انعام دیئے۔ سب آئیں اور لوٹ کر لے جائیں۔ یہ سنتے ہی ہندو مسلمان دوڑ پڑے۔ اور ایک رات اور دو دن میں ساری مسجد اور اس کے اطراف صاف ہو گئے۔ اور گھر گھر شاہجہاں کی فیاضی کی دھوم مچ گئی۔

میں دیکھتی تھی کہ اگر پاڑ کھولنے اور صاف کرنے اور اٹھوانے کی مزدوری دی جاتی تو سامان کی قیمت سے بڑھ جاتی۔ اس انعام کے طفیل بہت جلدی کام ہوا اور بہت بڑا نام ہوا۔

۱۸۵۷ء میں انگریز بادشاہ ہوئے۔ میرے اندر انہوں نے تخت بچھایا۔ کلکتے اور شملے بھی جاتے تھے مگر راجدھانی مجھ ہی کو سمجھتے تھے۔

آخر ۱۹۱۱ء میں بادشاہ نے مجھے راجدھانی کا جوڑا پہنایا۔ اور میں میم صاحب بن گئی۔ اور بہت کی ملکہ بھی کہی جانے لگی۔

عادت پڑ گئی۔ اور میں شاہجہانی حد سے پھر جنوب کی طرف بڑھی۔ اور انگریزوں نے مجھے ۹ کروڑ روپیہ کے خرچ سے ... کہتے کہ شاہجہانی دہلی سے ملی ہوئی ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ شمال سے پھر جنوب کی طرف حرکت کی۔

میری لوٹ

مجھے تیمور نے لوٹا۔ نادر شاہ نے لوٹا۔ احمد شاہ درانی نے لوٹا۔ مرہٹوں نے لوٹا۔ مگر انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں زیادہ نہ لوٹا۔ البتہ اپنی زبان کی ڈکشنری میں لفظ "لوٹ" شریک کر لیا۔

میں صوبہ ہوں

کہتے ہیں میں ہند کا پایۂ تخت بھی ہوں اور صوبہ بھی ہوں۔ یہاں ایک چیف کمشنر حکومت کرتے ہیں جن کا درجہ گورنر کی برابر ہے۔ مگر میرا صوبہ دوسرے صوبوں کے ضلعوں سے بھی چھوٹا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کالے حبشی کا نام کافور رکھ کے ہند کیا کو دیغ کا خطاب دیا ہے۔

پنجاب کی لونڈی

دل کی بات زبان پر آئے بغیر نہیں رہتی۔ میں ہوں تو ایک صوبہ اور پایۂ تخت مگر درحقیقت نہ میں صوبہ ہوں نہ پایۂ تخت ہوں۔ کیونکہ مجھے پنجاب کی باندی ۱۸۵۸ء سے بنا دیا گیا ہے۔ میرے بچے حسرت سے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ اور ان کی روٹی پنجاب کے سامنے رکھدی جاتی ہے۔

کہنے کو راجدھانی ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ راجدھانی پنجاب ہے۔ اور میں اسکی لونڈی باندی اور داسی ہوں۔ کیوں نہ ہو۔ کبھی کے دن بڑے۔ اور کبھی کی بڑی رات۔

میرے حدود اربعہ پوچھو تو آج کل یہ ہیں۔ شمال میں وہ پہاڑی جہاں سے ۱۸۵۷ء میں انگریزی فوج کا تھانہ میرے اندر آئی تھی۔

جنوب میں پرانی دہلی کے کھنڈر۔ فیروز شاہ کا کوٹلہ۔ پرانا قلعہ۔ ہمایوں کا مقبرہ۔ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیأ رحمۃ اور گوشہ غرب و جنوب میں نئی دہلی کی نئی عمارتیں اور باغ۔

غرب میں صدر بازار۔ قرول باغ کی بڑی آبادی۔ مشرق میں لال قلعہ اور سلیم گڑھ اور جمنا دریا۔

اندر پریڈ کا میدان۔ نئے نئے پارک اور جامع مسجد اور اُردو بازار۔ اور چاندنی چوک اور گھنٹہ گھر اور یہ ہارڈنگ لائبریری جہاں آج میرے بچے جمع ہوئے ہیں۔ اوپر آسمان۔ نیچے زمین۔ آسمان زمین کے بیچ میں بجلی کے تار اور ہوائی جہازوں کی غوں غاں اور دوڑ۔ گھنٹہ گھر اور ہارڈنگ لائبریری کے پاس کمیٹی گھر ہے جہاں ہندو مسلمان اور انگریز جمع ہو کر کہتے ہیں۔ دلّی کی اولاد سے رہنے کا ٹیکس لو۔ کھانے کا ٹیکس لو۔ پینے کا ٹیکس لو۔ پہننے کا ٹیکس لو۔ یہ روٹی کھائیں تو کھولاؤ ٹیکس۔ یہ پانی پئیں تو کھولاؤ واٹر ٹیکس۔ یہ تماشہ دیکھنے جائیں تو کھولاؤ ٹیکس۔٥

یہ لوگ لال چمڑے کی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو منہ چڑاتے ہیں۔ آستین چڑھا کر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔٥

میرے اندر مولوی، پنڈت، پادری بھی رہتے ہیں۔ اور وہ سب بھی لال کرسی والوں کی طرح آپس میں لڑا کرتے ہیں۔

میرے بازاروں میں دکان دار ہیں۔ جنکو مجبور کیا جاتا ہے کہ سات دن میں ایک دن دکانیں بند رکھا کرو۔٥ وہ کہتے ہیں مندا ایسا ہے کہ ہر دن دکان بند رہتی ہے۔ ہمارا ایک دن کیوں برباد کرتے ہو۔ مگر یہ لال کرسی والے خفا ہوتے ہیں۔ اور مار مار کر سو جانے کو کہتے ہیں۔ اور میرے بچوں کو لاچار سونا ہی پڑتا ہے اور جب وہ سو جاتے ہیں تو میں بھی بولتے بولتے چُپ ہو جاتی ہوں۔ مگر مجھے چُپکا کون رہنے دیتا ہے۔ جوں ہی زبان روکتی ہوں۔ آوازیں آتی ہیں بڑی بی ذرا اپنا پچھلا حال تو سناؤ۔ کہ تم نے یہاں کیا کیا دیکھا؟

بڑی بی کا لفظ سُنکر مجھے غصہ آجاتا ہے۔ میری عمر ہی کیا ہے؟ دلّی کے ایک شخص ہر سال شادی کیا کرتے تھے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو جواب دیا۔ جب نکاح کے بعد زنانے مکان میں آرسی مصحف کے لئے جاتا ہوں تو عورتیں کہتی ہیں۔ بوا پردہ کر لینا لڑکا اندر آتا ہے۔ لڑکے کا لفظ سُنکر میں بڑھاپے کو بھول جاتا ہوں۔ اور میرے اندر جوانی پیدا ہو جاتی ہے۔

پس مجھے بھی جو بڑی بی کہتا ہے تو یہ بات مجھکو بری معلوم ہوتی ہے۔ اور میں چاہتی ہوں کہ ہر شخص مجھکو نئی نویلی دُلہن کہا کرے تاکہ میرے اندر جوانی پیدا ہو۔

جب شیر شاہ افغان نے ہمایوں بادشاہ سے مجھے چھین لیا۔ اور شیر بازار میں گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا تو گلی میں دو بڑھیا عورتیں کھڑی تھیں۔ شیر شاہ کی سفید ڈاڑھی دیکھی تو ایک نے دوسری سے کہا۔ بوا دلّی کو دولھا تو ملا مگر بڈھا ملا۔ شیر شاہ نے بھی یہ بات سُن لی۔ اس لئے ذرا سینہ تان کر چلنے لگا۔ یہ حالت دیکھی تو دوسری بڑھیا نے ہنس کر کہا۔ ہاں بوا وہ بُڈھا بھی ہے اور نقّال بھی ہے۔ جوانوں کی نقل کرتا ہے۔

میں پچھلی کہانی سُناتی ہوں اور کہتی ہوں کہ جب راجہ پرتھی راج اور اُن کے ساتھی شہاب الدین محمد غوری کے ہاتھ سے تھانیسر کے میدان میں مارے گئے تو اُن کی باقی بچی ہوئی فوج میرے پاس آگئی اور میں نے لال کوٹ قلعہ میں اُن کو جگہ دے دی۔

ایکا ایکی خبر سُنی کہ شہاب الدین غوری کا ترک غلام قطب الدین ایبک فوج لیکر آیا ہے۔ لال کوٹ کی فوج نے خوب مقابلہ کیا۔ مگر قسمت کی ہار کو سنبھالنا کس کے بس کی بات ہے۔ ایبک نے لال کوٹ لے لیا۔ اور میں صدیوں کے لئے مسلمانوں کی لونڈی بن گئی۔

ایبک کے بعد شمس الدین التمش ترک بادشاہ ہوا۔ پھر غیاث الدین بلبن ہوا پھر بلبن کا پوتا معز الدین کیقباد کے نام سے سُلطان ہند بنایا گیا۔ یہ اپنے باپ بغرا خاں حاکم بنگال سے لڑنے پر آمادہ ہوا۔ مگر خدا کے نیک بندوں نے باپ بیٹے میں صلح کرا دی تو کیقباد نے "کے لوک ہری" محل بنوایا۔ اور جمنا دریا کے کنارے عیش کرنے لگا۔ جلال الدین خلجی نے عیاشی کی خبر سُنی تو فوج لیکر دلّی میں آیا اور بچارے کیقباد کو کمبل میں لپیٹ کر جمنا دریا میں پھینک دیا۔ اور خود بادشاہ بن گیا۔ جلال الدین خلجی کو اس کے بھائی کے لڑکے علاء الدین خلجی نے مار ڈالا۔ اور میرا مالک بن بیٹھا۔ علاء الدین خلجی مرا تو اُس کے چھوٹے بیٹے قطب الدین خلجی نے اپنے بڑے بھائی خضر خاں

٥۔ یہ ٹیکس میونسپل کمیٹی دہلی نے نہیں لگایا۔ امپرومنٹ ٹرسٹ نے لگایا ہے۔ خواجہ صاحب کو شکایت یہ کرنی چاہیئے کہ کمیٹی نے اس آمدنی کی طرف توجہ کیوں نہیں کی (واحدی)

٥ لال چمڑے کی کرسیاں پُرانی بات ہیں مدت سے چمڑے کا رنگ سبز ہو گیا تھا۔ اور اب تو سیدی کرسیاں ہیں۔ سبز کرسیوں کو اگست ۱۹۴۲ء میں آگ لگانے والوں نے آگ لگا دی (واحدی)

٥ تاکہ مالدار دکانداروں کے غریب ملازم ہفتہ میں ایک دن آرام اُٹھائیں (واحدی)

جا کر تخت حاصل کرلیا۔ اور بادشاہ ہوجانے کے بعد گجرات کے ایک ہندو شخص پر ایسا فریفتہ ہوا کہ سب کچھ اُس کے حوالے کر دیا۔ اس لڑکے نے موقع دیکھ کر قطب الدین خلجی کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن گیا۔ اس کو ملتان کے گورنر غیاث الدین تغلق نے مغلوب کیا۔ اور میری فصیل کے سامنے ایسی خوں ریز لڑائی ہوئی کہ خون کے نالے بہنے لگے۔ آخر ہندو لڑکا مارا گیا۔ اور تغلق کی بادشاہی ہوگئی۔ غیاث الدین تغلق ایک مکان میں دب کر مرگیا۔ تو اس کا بیٹا محمد تغلق بادشاہ ہوا۔ وہ مرا تو فیروز شاہ تغلق بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد لودھی خاندان کی حکومت ہوئی۔ پہلے بہلول لودھی بادشاہ ہوا۔ پھر سکندر لودھی۔ پھر ابراہیم لودھی۔ ابراہیم لودھی کو مغل بادشاہ بابر نے پانی پت کے میدان میں قتل کر دیا۔ اور میرا نکاح مغلوں سے ہوگیا بابر کے بیٹے ہمایوں کو شیر شاہ نے نکالا تو میں نے شیر شاہ سے نکاح کرلیا پھر اسکے بیٹے سلیم شاہ سے میری شادی ہوئی۔ دونوں کی ڈاڑھیاں لمبی تھیں اور دلّی والے کہتے تھے کہ ڈاڑھی شیر شاہ کی بڑی یا سلیم شاہ کی۔ یہ کہاوت اردو زبان میں آج تک بولی جاتی ہے۔

ہمایوں پھر آیا اور شیر شاہ کے افغانوں کا سپہ سالار ہیمو بقال ہمایوں کے مرنے پر دلّی پر چڑھ دوڑا اور مجھے جیت کر اپنا نام بکرماجیت رکھا۔ ہمایوں کا بیٹا اکبر پنجاب میں تھا۔ ہیمو اس سے لڑنے پنجاب کی طرف گیا۔ پانی پت میں لڑائی ہوئی۔ اکبر کی فوج سے شکست کھائی۔ اور مارا گیا۔ اکبر نے اپنے باپ ہمایوں کا ایک بڑا شاندار مقبرہ میرے اندر بنوایا۔ اکبر کے بعد جہانگیر بادشاہ ہوا۔ پھر شاہجہاں پھر اورنگ زیب۔ جہانگیر بھی باہر رہا۔ اور عالمگیر اورنگ زیب بھی۔ اور شاہجہاں بھی آگرے میں رہا۔ اورنگ زیب کے پوتے جہاندار شاہ اور فرخ سیر میرے اندر رہے ان کے بعد محمد شاہ بادشاہ ہوا۔ اس کے وقت میں نادر شاہ ایران سے آیا اور میرے بچوں کا قتل عام کیا۔ پھر محمد شاہ کے بیٹے احمد شاہ کے زمانے میں پونا کی مرہٹہ حکومت کے سردار پیشوا نے اپنے بیٹے بسواس راؤ اور اپنے بھائی کے بیٹے بھاؤ کو تین لاکھ فوج کے ساتھ بھیجا۔ اور ان دونوں نے مجھے خوب لوٹا۔ اور قتل عام بھی کیا۔ اس کے بعد ان دونوں کی پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی سے لڑائی ہوئی جس میں یہ دونوں مارے گئے۔ اور مرہٹوں کی تین لاکھ فوج کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ ابدالی دلّی میں آیا۔ اور اس کی فوج نے بھی میرے بازاروں کو لوٹا۔ اور لوٹ مار کر قندھار چلا گیا۔ میدان خالی دیکھ کر انگریزوں کا جنرل لیک یہاں آیا۔ اور اس نے مرہٹوں کو نکالا پھر شاہ عالم بادشاہ کی لڑائی بکسر بہار کے میدان میں انگریزوں سے ہوئی۔ شاہ عالم نے شکست کھا کر پٹنے میں انگریزوں سے صلح کرلی اور ہندستان کی دیوانی یعنی وزارت ایسٹ انڈیا کمپنی یعنی انگریزوں کو مل گئی۔ جو ایک لاکھ روپے مہینہ شاہ عالم کو دیتی تھی۔ اور شاہ عالم میرے لال قلعہ میں رہتے تھے۔ ملک خدا کا تھا۔ حکم کمپنی بہادر کا تھا۔ اور شاہ عالم آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کے بیٹے اکبر ثانی کا بھی یہی حال رہا۔ اکبر ثانی مرے تو سراج الدین بہادر شاہ ابوظفر تخت نشین ہوئے جو ۱۸۳۷ء میں بادشاہ ہوئے تھے اور ۱۸۵۷ء تک لال قلعہ میں نام چار کی بادشاہی کرتے رہے۔

۱۸۵۷ء کی ۱۱ مئی کو انگریز کمپنی کی فوج نے انگریزوں سے بغاوت کی اور میرٹھ چھاؤنی سے دلّی میں آئی اور بہادر شاہ کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ سوائے پنجاب کے ہندستان کی سب چھاؤنیوں کی انگریزی فوجیں باغی ہوگئیں۔ اور ۱۱ مئی سے ۱۴ ستمبر تک دلّی میں یہ باغی فوجیں انگریزی فوجوں سے لڑتی رہیں۔ ۱۴ ستمبر کو باغیوں نے شکست کھائی۔ ۱۹ ستمبر کو بہادر شاہ لال قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں آئے اور وہاں گرفتار ہوئے۔ اُن کے بیٹے پوتے جو باغی فوجوں کے افسر بنے تھے ہڈسن صاحب کی گولیوں سے مارے گئے۔ اور اُن کے سر کاٹ کر بہادر شاہ کے سامنے رکھے گئے۔ بہادر شاہ کے خلاف لال قلعے میں مقدمہ چلا۔ جس میں بہادر شاہ مجرموں کی طرح انگریز ججوں کے سامنے کھڑے ہوتے تھے۔ آخر ججوں نے جلا وطنی کی سزا دی اور بہادر شاہ اپنی ملکہ زینت محل اور اپنے بیٹے جواں بخت کے ساتھ مجھ سے ہمیشہ کیلئے جدا ہوکر برما کے شہر رنگون میں بھیج دیئے گئے۔ جہاں وہ کئی سال زندہ رہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں جیسی بے رحمیاں باغی فوج نے انگریزوں اور انکی عورتوں اور بچوں کے ساتھ کی تھیں اس سے زیادہ بے رحمیاں انگریزوں کی اس فوج کے ہاتھوں دلّی والوں نے برداشت کیں جو فاتحانہ دلّی میں داخل ہوئی تھی۔ ہزاروں بیگناہ بھی پھانسیوں پر چڑھا دیئے گئے۔ بہادر شاہ کی اولاد میری گلیوں میں بھیک مانگتی نکلتی تھی تو مجھے رونا آتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے آدھی رات کا وقت تھا۔ دلّی والے سب پڑے سوتے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہ ایک مصیبت زدہ شہزادہ دلّی کی جامع مسجد اور لال قلعے کے بیچ میں کھڑے ہوکر دردناک آواز میں یہ اشعار پڑھ رہا تھا ؎

اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی انکے خاک ہوئے
ذات معبود جاودانی ہے — باقی جو کچھ کہ ہے یہ فانی ہے
صبح دم طائران خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

بہادر شاہ بادشاہ کے ایک نواسے مرزا قمر سلطان بہت خوبصورت تھے۔ غدر سے پہلے بن سنور کر گھوڑے پر سوار ہو کر لال قلعے سے چاندنی چوک میں آتے تھے تو سب بازار والے ان کی صورت اور شان دیکھنے کے لئے دکانوں سے اُتر اُتر کر جمع ہو جاتے تھے۔

غدر کے بعد دیکھا کلو خواص کی حویلی سے ایک اندھا فقیر سورج چھپنے کے بعد نکلتا تھا۔ لمبا قد۔ لمبی ڈاڑھی۔ پھٹے ہوئے کپڑے۔ ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا پیالہ۔ پھٹے ہوئے بانس کی لکڑی کے سہارے ٹٹولتا ہو۔ سڑک پر آتا تھا۔ اور ایک دردناک صدا میں کہتا تھا۔ "یا اللہ ایک پیسے کا آٹا دلوا دے۔ تو ہی دے گا۔ تو ہی دلوائے گا۔ ایک پیسہ کا آٹا دلوا دے"۔ نیک دل لوگ اُس کے پیالے میں پیسے ڈالتے تھے، آٹا ڈال دیتے تھے۔ اور وہ کلو خواص کی حویلی سے جامع مسجد تک جاتا تھا اور پھر اُلٹا چلا آتا تھا۔ مگر کسی کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ یہ وہی قمر سلطان ہے جس کی پیاری صورت اور شان و شوکت دیکھنے کے لئے دلی کے لوگ چاندنی چوک میں ٹوٹ پڑتے تھے۔

جو لوگ میری کہانی سننے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں وہ اپنی اچھی صورت اور اپنی حکومت اور اپنی دولت اور اپنی شان و شوکت پر ناحق گھمنڈ کرتے ہیں۔ میں نے اپنے اندر ہزاروں برس سے بے شمار تماشے دیکھے ہیں۔ مگر وہ تماشے کٹ پتلی کے تماشے تھے۔ پردہ گرا تو کچھ بھی باقی نہ رہا۔

میں دلی ہوں۔ میں دلی تھی۔ میں دلی رہوں گی۔ کوئی مجھے دہلی کہتا ہے کوئی مجھے کہتا ہے "دلی" الگ اور "لی" الگ کہتا ہے۔ یعنی دل چھین لیے والی۔ گورے لوگ مجھے انگریزی میں لکھتے ہیں تو "ڈل ہی" لکھتے ہیں۔ خبر نہیں اس ہی کا کیا مطلب ہے اگر میں دل ہی ہوں تو کوئی مجھے بتائے کہ میں کیسا دل ہوں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دل ہوں تو ٹوٹا ہوا غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا۔

آج میرے اندر چوڑی چوڑی سڑکیں بھی ہیں ہری ہری گھاس کے پارک بھی ہیں۔ بجلی کے قمقمے بھی ہیں۔ تماشے گھر بھی ہیں۔ مال و اسباب سے بھری ہوئی اونچی اونچی دکانیں بھی ہیں۔ مگر مجھ غریب کو کوئی اپنے ہاتھ میں نہیں لیتا۔ اگر میں "دل" ہوتی تو میرے دلدار بھی ہوتے۔ میرے خریدار بھی ہوتے۔ اور میں ہارڈنگ لائبریری کے جلسے میں یہ شعر پڑھتی

ع

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

پھر کہتی :-

بے کل ہے ہائے کیسا دل جاتی رہی ہے اس کی کل
باقی نہیں آرام میں اس کی بدولت ایک پل
تھامے سے یہ تھمتا نہیں جاتا ہے ہاتھوں سے نکل
دارم دلے اما چہ دل صد گونہ حرماں در بغل

دہلی

(تضمین برغزل اُستاذی فصیح الملک حضرت داغ دہلوی مرحوم و مغفور)

(از علامہ سیماب اکبرآبادی)

گرامی حضرات! لٹریری سوسائٹی دہلی کے سالانہ جلسہ کی پہلی نشست میں میرے محترم حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے "دہلی کی کہانی دہلی کی زبانی" بڑے دلگداز انداز اور دلچسپ اسلوب میں بیان کی تھی لیکن مجھے نیاز مندانہ شکایت ہے کہ خواجہ صاحب نے جہاں مختلف ارباب کمال کا ذکر کیا۔ وہاں شعرا کا نام برائے نام بھی نہیں لیا۔ یعنی دہلی نے یہ نہیں کہا کہ میری گود میں اُدبا اور شعرا بھی تھے۔ حالانکہ دہلی کی عظمت مرحوم کی یاد اور دہلی کی تاریخی۔ ادبی علمی لسانی اور عمرانی حیثیت کو محفوظ رکھنے کی سب سے بڑی کوشش دہلی کے شعرا نے ہی کی ہے۔ اور دہلی کی ٹکسالی زبان نیز محاورے صرف شعرا کے کلام میں ہی اب تک محفوظ ہیں۔

بہرحال اب داستانِ دہلی فصیح الملک جہاں اُستاد حضرت داغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے سنئے اور اس پر میری تشریح ملاحظہ فرمائیے (سیماب اکبرآبادی)

اے فصیح الفصحا، اے ہمہ دانِ دہلی
شاعرِ نغز بیاں عظمت و شانِ دہلی
خالقِ شعر و ادب رُوحِ روانِ دہلی
بُلبُلِ گلکدۂ خُلد نشانِ دہلی
آج روتے ہیں تجھے پیر و جوانِ دہلی
ڈھونڈتی ہے تجھے چشمِ نگرانِ دہلی
سچ کہا تو نے یہ اے مرثیہ خوانِ دہلی
"یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی"
"تھا مرا نام و نشاں، نام و نشانِ دہلی"

لکھنؤ پہنچا کوئی شیوہ بیانِ دہلی
ہوئی رنگون میں کچھ گرم فغانِ دہلی
بٹ گئی چار طرف جنسِ گرانِ دہلی
رہ گیا نام ہی دہلی کا ازآنِ دہلی
منتشر ہو گئے سب ناموَرانِ دہلی
بن گئے وقت کے بیٹے پدرانِ دہلی
الغرض ہو گیا تاراج جہانِ دہلی
لے گئے لُوٹ کے سب شوکت و شانِ دہلی
"پوربی پھلے اُڑاتے تھے زبانِ دہلی"

اب کہاں ہے وہ، جو دہلی کی تھی پہلی صورت
نہ وہ شُہرت و تمکیں نہ وہ رومانیت
نہ وہ رنگینیٔ خلوت نہ شکوہِ جلوت
نہ وہ محفل نہ وہ ساقی نہ وہ دورِ عشرت
دلّی والوں کو تھی دُنیا میں عجب فوقیت
نئے ایوانوں میں رہنے کی تھی ان کو عادت
جنتِ کہنہ میں ممکن ہی نہیں ان کی کھپت
"دلّی والوں کے لئے تازہ بنے گی جنّت"
"لے گئے سر پہ ملک تحفہ مکانِ دہلی"

باغ دہلی میں جب اقبال کی تھی فصلِ بہار
غنچہ و گُل میں تھا مہتاب و ثریا کا وقار
ہر مکاں خلد تھا ہر ایک گلی تھی گلزار
خاک کے ذرّوں سے تھی بارشِ رنگ و انوار
برگ اور بار میں کیا کیا تھے نمو کے آثار
قطرے قطرے میں تھی جولانیٔ ابرِ کہسار
ہائے وہ دن کہ نہ تھا سرنگنی سے سروکار

"رشکِ شمشاد تھا ہر خوش قد و ہر خوش اطوار"
"سروِ آزاد تھا ہر ایک جوانِ دہلی"

وہ مکاں جن کے دریچے بھی تھے حورونکے عذار
اور وہ بام وہ در، جلوہ بکف ضو بکنار
گوہر و لعل و جواہر کا وہ ہر سُو انبار
جگمگایا ہوا ماحول، فضائیں بیدار
نظر افروز لبِ نہر چراغانِ بہار
صاف شفاف وہ سڑکیں، وہ درختوں کی قطار
قاف در قاف تھا آئینہ ہر راہگذار
عارضِ صاف تھا ہر ایک مُصفّا بازار
چشمِ پُر جلوہ تھی ہر ایک دُکانِ دہلی

آئے دہلی کی طرف زندہ دلانِ پنجاب
سمٹ آیا اسی گوشے میں جہانِ پنجاب
مہ رُخ و ماہ جبیں ماہ وشانِ پنجاب
جانِ پنجاب ہی کھنچ آئی بجانِ پنجاب
کوئی شاعر کوئی مردِ ہمہ دانِ پنجاب
کہیں صنّاع، کہیں نغمہ گرانِ پنجاب
گرمیٔ بزم تھے آتش نفسانِ پنجاب
"گرمِ ہنگامہ ہوئے لالہ رُخانِ پنجاب"
گُل کھلائے ہیں نئے تو نے خزانِ دہلی

ہمیں دہلی کی سنانی ہے وہ رودادِ شباب
اور پھر قصۂ افسردگیٔ دورِ خراب
پھر تغیّر کے بتانے ہیں ہمیں کچھ اسباب
سازِ بشکستہ کو لانا ہے قریبِ مضراب
وہ سرافرازی و سطوت کا چمکتا ہوا خواب
وہ نظارے کا فریب اور نگاہوں کا سراب
پھر اس اندھیر کا فطرت سے بھی لینا ہے جواب
اس سے بڑھکر کوئی محشر میں نہیں طولِ حساب
بس یہی ہوگا کہ ہم اور بیانِ دہلی

جامع مسجد دہلی ہے بہت رفعت مند
اس کے ہونے سے ہوا ذوقِ عبادت کا دوچند
خلد میں روح رہے شاہجہاں کی خورسند
کیا عمارت ہے دل افروز، دل آرا، دل بند
انقلاباتِ جہاں سے اسے پہنچے نہ گزند
یہ دعا عرش پہ اللہ کو بھی ہوگی پسند
رفعتِ مسجدِ اقصیٰ سے ہو اس کا پیوند
یا خدا مسجدِ جامع کا رہے نام بلند
کعبے والے کہیں وہ آئی اذانِ دہلی

یاد دہلی کی وہ مرحوم فضا آتی ہے
یاد کیا آتی ہے ماضی کی، بلا آتی ہے
جھومتی اور گرجتی جو گھٹا آتی ہے
نوحہ زن، نوحہ گر و نوحہ سرا آتی ہے
خون میں ڈوبی ہوئی موجِ ہوا آتی ہے
بُوئے بربادیٔ خاکِ شہدا آتی ہے
نہ فقط خاک سے آوازِ بکا آتی ہے
آسماں پر سے بھی نوحے کی صدا آتی ہے
کیا فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی

ہے ادب فطرتِ دہلی میں ازل سے پنہاں
کبھی خالی نہ رہا اہلِ ادب سے یہ مکاں
میرؔ و غالبؔ و آزردہ گئے سُوئے جناں
سائلؔ و بیخودؔ و شاعر تو ہیں موجود یہاں
نام لیوا یہ ترے آج ہیں مشہورِ جہاں
وہی دہلی کی فصاحت، وہی دہلی کی زباں
بہ ادب عرض کروں گا کہ غلط تھا یہ گماں
میرؔ و غالبؔ و آزردہ سے پھر لوگ کہاں
داغؔ اب ہیں یہ غنیمت ہمہ دانِ دہلی

بغداد کی علمی فضیلت

از خواجہ سرور حسن صاحب بار ایٹ لا

۱۹۳۹ء کی گرمیوں میں میں بغداد گیا۔ اس وقت تک میں علم و فضل کے اس قدیم گہوارے سے بہت کم واقف تھا۔ ہندوستانی سکول اور یونیورسٹی کی تعلیم کی بنا پر یونان کی عظمت اور روم کی شان و شوکت سے بہت کافی واقف ہو چکا تھا۔ لیکن اسکی ہم پلہ بلکہ شاید اس سے بھی بڑھی چڑھی ہوئی ایشیائی تہذیب کے مرکز مثلاً چین، ایران، عرب کے متعلق مجھے کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ میرے بچپن کے زمانے میں بانو کالج کے کتب خانوں میں ان ملکوں کے متعلق معلومات کا بہت کم ذخیرہ موجود تھا اور یا ہم میں جو ذہنیت پیدا ہو رہی تھی اسکی وجہ سے اس قسم کے لٹریچر کو تلاش کرنے اور پڑھنے کی بہت کم خواہش پائی جاتی تھی۔ لیکن جب کوئی شخص کسی نئے شہر یا ملک میں جاتا ہے تو اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ جب میں بغداد گیا تو اس کے شاندار ماضی کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کا شوق پیدا ہوا۔ اب انگریزی زبان میں ممالک عربیہ پر کافی لٹریچر موجود ہے کیونکہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب ترکی سلطنت پاش پاش ہو گئی اور عربی ممالک کا مغربی قوموں سے براہ راست تعلق پیدا ہوا یا یوں کہئے کہ عرب کا مغربی اقوام سے تصادم ہوا تو انگریز مصنفوں نے عربوں کے متعلق زیادہ فراخ دلی کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ ان مصنفوں میں سب سے زیادہ مشہور مصنف ایچ۔ جی۔ ویلز ہے جو نہایت آزادی سے اس بات کا معترف ہے کہ لاطینی ذرائع سے نہیں بلکہ عربوں کے توسل سے ہماری اس جدید دنیا نے طاقت اور علم کے تحائف حاصل کئے۔ اور اس طاقت اور علم کا سرچشمہ بغداد تھا۔ بغداد سے میری مراد وہ بغداد ہے جو اپنے وجود کے آغاز سے چند صدیوں تک باقی رہا۔

اس عظیم الشان شہر کی بنیاد خاندان عباسیہ کے دوسرے خلیفہ منصور نے ۷۶۲ء میں ڈالی۔ منصور کی سلطنت بحر الکاہل کے کنارے سے لیکر دریائے جیحون تک پھیلی ہوئی تھی۔ قدیم شہر کا جس کا نام اس کے آباد کرنے والے کے نام پر دار السلام رکھا گیا تھا۔ اب نشان نہیں ملتا۔ لیکن یہ یقینی امر ہے کہ یہ شہر دجلہ کے داہنے یا مغربی کنارے پر واقع تھا۔ دراں حالیکہ جدید بغداد اس دریا کے بائیں یا مشرقی کنارے پر آباد ہے۔ قدیم بغداد کے محلات مساجد یا کالجوں کا موجودہ بغداد میں کوئی پتہ نہیں۔ لیکن اسکی تنگ اور پیچ در پیچ گلیوں اور اس کے پرانے بازاروں کی نئی دوکانوں سے یہ اب بھی "امن کا شہر" معلوم ہوتا ہے اس سے بھی مغرب اور مشرق کا وہی تصادم ظاہر ہوتا ہے جو دہلی میں موجود ہے۔ یہ ایسے لوگوں کا شہر ہے جو مہذب اور شائستہ، صاف دل اور دیانتدار ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان انقلابات زمانہ کے باوجود جن میں سے انہیں گذرنا پڑا ہے اب بھی قابل تعریف ہیں۔ شاید منصور کے زمانہ کی آخری نشانی جو اب بھی موجود ہے وہ امام ابو حنیفہ کا مقبرہ ہے۔ جنہوں نے اسلام میں اس فقہ کی بنیاد ڈالی جسکے ماننے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ امام ابو حنیفہ ان چار آدمیوں میں سے تھے جنکو منصور نے بغداد کی تعمیر کے نگرانی کے لئے مقرر کیا تھا۔ یہ دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر دفن ہیں۔

شہر بغداد کی تعمیر کے ساتھ اسلامی تاریخ کا جو دور شروع ہوتا ہے وہ درحقیقت طاقت کو یکجا کرنے اور سلطنت کی توسیع کا دور ہے۔ جنگ کے بعد امن اور اسکے ساتھ انتظامات کا دور دورہ ہوتا ہے۔ تجارت کو فروغ ہوتا ہے۔ نئے نئے قوانین اور ادارے ظہور میں آتے ہیں۔ لوگ سیاحت اور معلومات حاصل کرنے کیلئے نکلتے ہیں۔ منصور کے عہد میں ایسے خوشگوار حالات مہیا ہو گئے جو ان چیزوں کی ترقی کے ضامن تھے۔ منصور کے پوتے ہارون رشید کا دور بغداد کی مالی خوشحالی کا دور تھا۔ پھر اسکے بعد اسکے پڑپوتے مامون رشید کے زمانہ میں شہر اپنے پورے عروج پر تھا۔

عرب میں تعلیم زبانی دی جایا کرتی تھی اور یہ طریقہ تعلیم وہاں اسلام کے آغاز سے ایک سو سال تک جاری رہا۔ تعلیم کے جویا اور متلاشی، عالم و فاضل لوگوں سے استفادہ کرنے کی غرض سے طویل سفر اختیار کرتے تھے۔ اور یہ سفر و سیاحت اسلامی طریقہ تعلیم کا ایک مخصوص و نمایاں پہلو تھا۔ یہ سلسلہ جب تک کتابیں نہیں لکھی گئیں اسوقت تک جاری رہا بغداد کی تعمیر سے قبل مدینہ۔ کوفہ اور بصرے میں فلسفہ اور قواعد کے مدرسے قائم تھے۔ مگر عرب کی دنیا ایک مرکزی تعلیم گاہ کی محتاج تھی۔ بغداد نے اس کمی کو پورا کیا۔ یہاں دور دراز ممالک مثلاً مشرق میں ترکستان اور مغرب میں اسپین سے طالب علم کھنچ کھنچ کر آنے لگے۔ یہ تعلیم یونانی زبان میں دی جاتی تھی۔ جسے یورپ کے عیسائیوں نے

ے ہاں سے خارج کردیا تھا ۔ ایسے میسوپوٹیمیا کے یہودیوں اور نیشوریا کے یعقوبی عیسائیوں
ہ عربوں تک عربی زبان میں پہنچایا ۔ ان میں اسلامی ممالک لے آہستہ آہستہ آرامی زبان
رد کر باہمی گفتگو اور ادبی سرگرمیوں کے لئے عربی زبان اختیار کرلی ۔ ان اقوام کے مشاہیر
ار میں بہت مقبول تھے ۔ جہاں آزاد خیالی کو کافی دخل تھا ۔ زرتشتوں نے بھی اسلام سے
ے کے علوم عربوں تک پہنچائے ۔ منصور کے عہد میں یونانی مسودوں کی بڑی شدومد سے تلاش
شروع ہوئی ۔ بغداد میں ایک شاندار لائبریری قائم ہوئی اور ہارون رشید نے ایک دارالترجمہ
بنیاد ڈالی ۔ ارسطو اور گیلن اور افلاطون بطلیموس ، اقلیدس اور آرشمیدس کے
جم ہوئے ۔ یہ سب کچھ نویں صدی میں ہوا جبکہ سارے یورپ میں جہالت کی تاریکی
ائی ہوئی تھی ۔

ایک حیثیت سے مامون کا عہد حکومت دنیا کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے
وں کہ دراصل اسی زمانہ میں موجودہ سائنس کی داغ بیل پڑی ۔ جسکی بنیاد پر یورپ اور
یکہ کے ماہرین سائنس نے سائنٹفک تحقیقات اور معلومات کا یہ شاندار قلعہ تعمیر کیا ۔
یرے پاس اتنا وقت ہے اور نہ وہ آلات ہیں جنکی بنا پر میں بغداد کے سائنسدانوں
تحقیقات اور ایجادات کو تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرسکوں ۔ بہرحال میں
قصار کے ساتھ ان کے تجربات و تحقیقات کے چند ایسے نتائج پیش کرتا ہوں جو بآسانی
ذہن نشین ہوسکیں ۔ بطلیموس کے میزانوں پر نظر ثانی کی گئی تسلیم کیا گیا کہ زمین گول ہے
وقت بقول برٹرم طامس خود یورپ والے اس بات کو ماننے میں دشواری
س کر رہے تھے ۔ یہ گولی اتنی بڑی تھی کہ نگل نہ سکتے تھے ۔ زمین کی گولائی ناپنے کی
کوشش کی گئی ۔ عربی ہندسوں کا پہلے پہل استعمال کیا گیا ۔ غالباً یہ ہندسے خود عربوں
ایجاد تو نہ تھے یہ انہوں نے ہندستان سے لئے تھے جبکا خود انہوں نے "ہندسہ" نام
دیا ۔ لیکن "صفر" تو یقیناً انہی عربوں کی اختراع ہے ۔ خود برٹرم طامس کی زبان
یہ کہنا مناسب ہوگا کہ "عربوں کے موجودہ تمدن پر جو احسانات ہیں ان میں "صفر"
اختراع حد درجہ اہمیت رکھتی ہے ۔ کیونکہ یہ وہ سنگ بنیاد ہے جس پر موجودہ ریاضی اور
حساب کی عمارت کھڑی ہے ۔ اور ہمارے روزانہ استعمال میں آنے والے اعداد و شمار اسی
پر ہیں ۔ قدیم اقوام یعنی خود یونانی تک اعداد و شمار سے محروم تھے ۔ وہ اعداد کی
بجائے کام لیتے تھے ۔ اعداد کی ابتدا کا پتہ ہمیں دسویں صدی کی عربی تصانیف
چلتا ہے ۔ یہ چیز یورپ میں اس وقت پہنچی جبکہ عرب میں ڈھائی سو سال قبل
جاری تھی ۔ ایک اور مغربی مصنف کا کہنا ہے کہ یہ عطیہ سائنس کے لئے اسی قدر
ہمیت رکھتا ہے جس قدر ادب کے لئے حروف ابجد ۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جس نے
قدیم عمارات پر تاریخ رومن میں درج دیکھی ہے ۔ وہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ کیسا اچھا
ہوتا اگر کیمیا کے ماہرین اپنے نتائج تقسیم اور علم نجوم کی کے ماہرین جمع الجمع اس طور
پر دیا کرتے ۔

کیمیا میں بھی عربوں کی تحقیقات دنیا کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں ۔ ویلز کا
کہنا ہے کہ انہوں نے دھات کے اور بہت سے دوسرے قسم کے تکنیکل آلات ، مرکبات
رنگ ، رقیق ، چھاننے اور صاف کرنے کے طریق ، ایلسنس[1] اور شیشے ایجاد کئے ۔ انہوں نے
تجرباتی سائنس کے سلسلہ میں ایسے طریقے وضع کئے ۔ جنکی بنا پر عالم بحر و بر پر اقتدار
حاصل کرنے اور خود اپنے شاندار مستقبل کی تعمیر کے لئے انسان کے سامنے موجودہ طاقتوں
کے دروازے کھل گئے ۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یورپ کو کاغذ اور دائرہ بنانے اور ناپنے کا آلہ
بھی عربوں سے ملا ۔ مخصوص عربی الفاظ مثلاً الجبرا ۔ الکوہل ۔ کیمیا (کیمسٹری) نادرہ ۔ زینتہ
زیرو سائنس کی لغت میں داخل ہوگئے ۔

بغداد نے طب کے فن میں جو ترقی کی ہے یا اضافہ کیا ہے ۔ اس کا حوالہ
پروفیسر براؤن کی مشہور و معروف کتاب "عربی طب" میں ملتا ہے ۔ گیلن کا جو ترجمہ عربی
میں ہوا ہے اس کا تو میں ذکر کر ہی چکا ہوں ۔ ہارون کے دور میں بغداد کے ہسپتال میں
ہندستان کے ماہرین طب موجود تھے ۔ یونانی اور ہندستانی طب کے اختلاط و
تصادم سے جو نتائج برآمد ہوئے انہی پر یورپ کی موجودہ طب کا دارومدار ہے ۔ عربی
عمل جراحی خود بہایت ترقی یافتہ صورت میں تھا ۔ یہ بڑے سے بڑے آپریشن بیہوشی
کی دوائیں سنگھا کر کرلیا کرتے تھے ۔ عرب آنکھ کے امراض کے علاج میں خاص طور پر
مہارت رکھتے تھے اور عینک کے شیشوں کا تو ان کو موجد کہنا چاہیئے ۔ پاگلوں کے
نفسیاتی علاج کے قوانین ، طبیبوں کا سند یافتہ ہونا ، اوزان و پیمائش کے قواعد و
اسناد کے اصول سب بغداد میں جاری تھے ۔

یہ تو دراصل ایک بہت سرسری جائزہ بغداد کی اس ذہنی اور معاشرتی
ترقی کا ہے جس کے لئے قدیم بغداد مشہور ہے ۔ میں نے بہت سے مشہور و معروف
مورخوں کا تذکرہ نہیں کیا ۔ جن کی بعض تصانیف متعدد جلدوں میں ہیں ۔ نہ ان فلسفیوں
شاعروں اور نثر نگاروں کا ذکر کیا ہے جن کی تحریروں نے عربی ادب کو دنیا کے ادبیات
کی صف اول میں جگہ دلائی ہے ۔ نہ ان خاندانوں کے متعلق کچھ کہا جو امام ابوحنیفہ کے
متعلق تھے ۔ جن کا اسلامی قانون کے اصول و ضوابط کی ترتیب میں نمایاں ہاتھ ہے ۔
ملک ابن انس ، شافی محمد اور یوسف یہ سب بغداد کی پیداوار تھے ۔

اب میں بغداد کے اس دور کی ذہنی اور علمی ترقی کی خصوصیتوں کو رچرڈ کوک
کے الفاظ میں یوں یکجا کروں گا ۔ "یہ وہ دور تھا جب انفرادی کوششیں اور صلاحیتیں خوا

[1] ٹروج

ان کا اظہار معاملات وواقعات میں ہو یا صناعی میں۔ یا علمی و مذہبی کاوشوں میں بہر حال دُنیا آہستہ آہستہ ان باتوں کو تسلیم کر رہی تھی۔ ہر جانب مدرسے کھُل گئے تھے خود بغداد میں ہر لڑکا پڑھنا اور لکھنا جانتا تھا۔ مدرسہ عموماً مسجد میں ہوتا تھا اور جو چاہتا تھا وہاں کی تعلیم سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ ایک خصوصیت اسکے ساتھ ساتھ یہ تھی کہ معلم کو درس و تدریس کے سلسلہ میں کافی آزادی تھی۔ کوئی معلم بھی مسجد میں مدرسہ قائم کرسکتا تھا۔ بشرطیکہ وہ لڑکوں کو پڑھنے کی طرف راغب کرسکے۔ یہ ایک عام قاعدہ تھا کہ معلم مدرسہ سے کچھ کماتا نہیں تھا۔ اس لئے وہ اور پیشے اختیار کرسکتا تھا۔ خاص خاص اور مشہور عالموں کی البتہ تلیفہ وقت یا مسجد کے منتظمین کی طرف سے تنخواہیں مقرر تھیں۔ تعلیم یا ذاتی رائے کے اظہار کے سلسلہ میں صرف ایک قاعدہ سختی سے برتا جاتا تھا۔ اور وہ اس تعلیم یا اظہار رائے کے حقوق کا تحفظ تھا۔ اس کا تقریر اور تحریر دونوں پر اطلاق ہوتا تھا۔ ہرچند کتابیں بڑی محنت اور کاوش سے ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ پھر بھی بغداد میں نسبتاً سستی ملتی تھیں۔ بغدادی کتب فروشوں کی بے شمار دکانیں تھیں۔ باب بصرہ کے قریب سوق الوراقین ہی میں کوئی ایک سو سے زیادہ کتابوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں دن کے اکثر اوقات میں علم دوست نوجوان اور پڑھنے لکھنے کے شوقین لوگ یکجا جمع ہوا کرتے تھے۔ علم سے افادہ کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس کی تشریح و اشاعت کے لئے وسیع پیمانے پر ایک پبلک موجود تھی۔ حوصلہ مند ادیب، سائنس کی تحقیقاتوں کے شیدا اور مذہبی مبلغ کو خاطر خواہ حوصلہ افزا حالات ملتے تھے۔

بغداد کی تقلید اور اسلامی ممالک میں بھی کی گئی۔ اسی زمانے میں دوسری اسلامی ممالک میں بھی علم کے بڑے بڑے مرکز قائم ہوگئے۔ جن میں سمرقند۔ شیراز۔ قاہرہ اور قرطبہ خاص طور پر مشہور تھے۔ ایک حیثیت سے ان میں قرطبہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ کیونکہ قرطبہ کی یونیورسٹی ان ماہرین تعلیم سے مالا مال تھی۔ جن کی روایات سے اکسفورڈ اور پیرس نے فائدہ اُٹھایا۔ اکسفورڈ سے نکلا ہوا مشہور عالم روجر بیکن کی (جو تیرھویں صدی میں گذرا ہے) تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں ایک یوروپین سے زیادہ ایک عرب رُوح جلوہ گر تھی۔

لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ یہ دراصل بغداد کی شمع کی روشنی تھی جس نے یورپ سے جہالت کی تاریکی دُور کی ہے۔ اور اس کے دامن کو علم و تمدن سے مالا مال کردیا۔

جب ہم موجودہ یوروپ اور امریکہ کے علمی خدمت کرنے والوں اور سائنس دانوں کے کمالات اور کارناموں کا اعتراف کریں تو ہمیں نہیں فراموش کرنا چاہئیے کہ بغداد نے بھی ابتدا میں دُنیا کو کیا کچھ نہیں دیا۔

اُردو جرنلزم

(از واحدی)

میرے مکان سے ایک مکان چھوڑ کر تیسرا مکان ہے، میں نے ہوش سنبھالا تو
مکان میں اخبار اشرف الاخبار کا دفتر دیکھا۔ اخبار کے مالک محمد مرزا خاں تھے۔ ان کی اتنی
ی کہ محلہ والے انہیں نوح کہنے لگے تھے۔ یہ مشہور تھا کہ محمد مرزا خاں کے کان میں حضرت شاہ
العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اذان کہی تھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ
کے فرزند تھے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے جب فتاویٰ عالمگیری تیار کرائی ہے تو
ت شاہ ولی اللہ قریب قریب فارغ التحصیل ہو چکے تھے اور کچھ طالب علمانہ حصہ کتاب فتاویٰ
یری کی تیاری میں لیتے تھے۔ ان باتوں سے محمد مرزا خاں کی عمر کا اندازہ لگا لیجئے۔ صرف دو واسطے
مرزا خاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے درمیان تھے۔ محمد مرزا خاں کب سے اخبار اشرف الاخبار
لتے تھے۔ میں نہیں جانتا۔ میرے سامنے تو اشرف الاخبار کے چند سال گزرے۔ غالباً ۱۸۹۹ء
محمد مرزا خاں کا انتقال ہو گیا اور اخبار پھر نہ چل سکا۔ اس زمانہ میں اور اخبار بھی نکلتے تھے
ری مزے اشرف الاخبار کی عمر کے اور اشرف الاخبار کی طرز کے۔ مثلاً ایک اخبار اکمل الاخبار
جسے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے خاندان کے کوئی بزرگ نکالتے تھے۔ شاید حکیم غلام رضا خاں
الاخبار بعد میں مسیح الملک مرحوم کی ادارت میں بھی جاری رہا۔ ایک اخبار افضل الاخبار تھا یہ
اعظم خاں سے مرزا عبدالغفار کے زیر اہتمام نکلتا تھا۔ لیکن یہ اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار
م عصر تھا ہم عمر نہ تھا۔ اشرف الاخبار کے زمانہ میں نئی طرز کے اخباروں کی بھی ابتدا ہو گئی تھی
پیسہ اخبار لاہور۔ البشیر اٹاوہ۔ وکیل امرتسر۔ اور پرانی طرز کے اخبار بھی اشرف الاخبار کے
نے کے اور اشرف الاخبار کے بعد کے اور اشرف الاخبار سے پہلے کے اشرف الاخبار کے
میں موجود تھے۔ یہ پرانی طرز کے اخبار بہت کم ضخامت کے بہت تھوڑی تعداد میں چھپتے تھے
خاص اخبار کی بابت میری معلومات نہیں ہے لیکن عموماً اخبارات کا اس زمانہ میں کام فقط
ا کہ کسی امیر، رئیس، راجہ، نواب کے ہاں کوئی شادی غمی ہوئی اور اخبار نکل آیا۔
یں راجہ، نواب کے ہاں کی خبر بھی نمایاں کر کے چھاپ دی گئی۔ اور اور خبریں بھی ادھر
ل چھپ گئیں۔ ایک آدھ قصیدہ۔ ایک آدھ مدح یا ہجو بھی درج ہو گئی۔ اس
لے راجہ، نواب کے ہاں جا پہنچے۔ راجہ نواب کے مہمان رہے۔ انعام اکرام لیا
آئے۔ اور اخبار پھر ایسی ہی ایک خبر کے انتظار میں ملتوی کر دیا [illegible]

مالک محمد مرزا خاں سقط بہت جایا کرتے تھے۔ جب تک اشرف الاخبار نکلتا رہا ہندستان میں
مستقلی پیسہ چلتا رہا۔ محمد مرزا خاں بہت وجیہ اور نورانی شکل کے آدمی تھے۔ لوگ ہر اعتبار
سے ان کا اثر قبول کر سکتے تھے۔ گورا بھبوکا رنگ۔ برف جیسی سفید ڈاڑھی۔ سفید براق کپڑے
لمبا چغہ۔ مغلئی بلند ٹوپی۔ بلند قد و قامت۔ ہاتھ میں جریب۔ جدھر گزر جاتے انسان کا جی
چاہتا کہ تعظیم کو کھڑا ہو جائے۔ سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں کا بھی ایک اخبار تھا جسکا
نام سید الاخبار تھا۔ یہ ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا تھا۔ یعنی ہندستان میں لیتھو کی چھپائی شروع ہوتے
ہی۔ اس لئے معلوم اخباروں میں اسے اُردو کا پہلا اخبار سمجھنا چاہیئے۔ سرسید احمد خاں نے اردو کا سب
سے پہلا رسالہ نکالا تھا تہذیب الاخلاق۔ سرسید احمد خاں کے بڑے بھائی نے اُردو کا سب سے پہلا
اخبار نکالا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق سے مدتوں پہلے۔

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر بھی اخبار نکالتے تھے اسکا
نام "اُردو اخبار" تھا۔ اور اس کا سنہ پیدائش ۱۸۳۶ء ہے۔ ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رائے نے
لاہور سے "کوہ نور" جاری کیا۔ اسی سال گوجرانوالہ سے "گلزار پنجاب" اور سیالکوٹ سے "خورشید عالم"
جاری ہوئے۔

میرا خیال ہے کہ مولوی محمد باقر اور سید محمد خاں اور اکمل الاخبار کے مالک حکیم غلام رضا خاں
تو اخبار کے ذریعہ کیا کماتے ہونگے لیکن عام طور سے اس زمانہ کے اخباروں کا ایک ہی وطیرہ تھا۔
نئی طرز کے اخباروں نے بھی شروع شروع ریاستوں کے چکّر لگائے مگر پھر یہ چکّر معیوب سمجھے جانے
لگے۔ اب نہ ویسے رئیس ہیں اور نہ ویسے اخبار نویس۔ اخباروں سے پہلے رئیسوں کے ہاں
چلتے پھرتے اخبار بشکل انسان روزانہ شام کو حاضر ہوا کرتے تھے۔ رئیسوں کو دوسرے مشاغل
سے فرصت ہوتی تھی تو ان زندہ اخباروں سے وہ دن بھر کی خبریں بھی پوچھ لیا کرتے تھے۔ آج
سے پچیس برس پہلے تک ان زندہ اخباروں کی یادگار ایک شخص موجود تھا۔ داستان گوئی دلّی
میں میر باقر علی پر ختم ہو گئی۔ افسانے رسالوں میں ہر مہینے بے شمار چھپ جاتے ہیں۔ بولتا ہوا
اخبار اس شخص کے بعد پیدا نہیں ہوا۔ آج ہر شخص از سرتاپا خبر بن گیا ہے۔ میں نے تو
اشرف الاخبار سے زیادہ پرانا اخبار نہیں دیکھا۔ اشرف الاخبار تینتالیس چوالیس برس پہلے
بند ہوا تھا۔ ممکن ہے پچاس برس نکلا بھی ہو۔ اور سو برس پہلے کے اخباروں میں شمار کیا جا سکتا
ہو۔ لیکن میرے محترم دوست ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایم اے، پی ایچ ڈی (کینٹب)
نے اپنے ایک فاضلانہ مقالہ میں سو برس پہلے کے صرف دو اخباروں کا ذکر کیا ہے۔ ایک کا نام تھا
"اخبار دہلی" اور دوسرے کا نام "نور مشرقی"۔ ڈاکٹر صاحب نے اشرف الاخبار کا ذکر
نہیں کیا۔ اس لئے میں اپنے دعوی پر اصرار نہیں کرتا۔ میں ریسرچ نہیں کر رہا۔ میرے مضمون
میں تحقیق، تلاش اور محنت کو دخل نہیں ہے۔ یہ تو دیکھی دکھائی سنی سنائی باتیں ہیں۔
[illegible]

منقد بیں قلم اٹھائیں گے۔ وہ مجھ سے زیادہ معتبر شخص کی تحریر ہوگی اور عالمانہ اور محققانہ بھی ہوگی۔ ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں کہ یہ دونوں اخبار ہفتہ وار تھے۔ ان میں بادشاہ کی صحت اور بادشاہ کی مصروفیات کا حال شائع ہوا کرتا تھا۔ بادشاہ کی غزلیں ہر اشاعت میں چھپتی تھیں ان اخباروں کے مطالعہ سے مغلیہ دارالحکومت کی معاشی زندگی اور دلچسپیوں کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔ اور پتہ چل سکتا ہے کہ مغلیہ دربار جو کبھی بڑی شان و شوکت کا وارث تھا سو برس پہلے اس کی حالت کس درجہ پست ہوگئی تھی اور نامساعد حالات میں آخری مغل تاجدار کو اپنا نمائشی وقار برقرار رکھنے کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے تھے۔

ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں کہ "اخبار دہلی" سلیقہ سے مرتب کیا جاتا تھا۔ اسکا معیار بلند تھا۔ وہ تبصروں میں غیر جانب داری سے کام لیا کرتا تھا۔ یہ اخبار اپنے وقت کی فصیح اردو لکھتا تھا۔ جسے پڑھکر زبان چٹخارے لیتی تھی۔

"ڈاکٹر قریشی نے اخبار دہلی کے جون ۱۸۳۷ء سے فروری ۱۸۳۸ء تک کے پرچے دیکھے ہیں جو دہلی کے سابق چیف کمشنر سر جان لامس (؟) بجہانی کے پاس تھے۔ ان اشاعتوں میں چار بڑے واقعات کو مع رسوم و آداب کے پوری تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک اکبر شاہ ثانی کی رحلت۔ دوسرے بہادر شاہ ثانی کی تخت نشینی۔ تیسرے اور چوتھے برطانوی سپہ سالار اعظم اور گورنر جنرل کی آمد۔

"استاد شہ" ملک الشعرا ذوق کا کلام بھی اس اخبار میں چھپا کرتا تھا۔ لیکن ذوق کے ہمعصر اور اردو کے سب سے بڑے شاعر غالب کے کلام کی طرف سے بے اعتنائی برتی جاتی تھی۔ دہلی کے نام نہاد اور بے بس بادشاہ کا تذکرہ ہمیشہ محبت و احترام کے ساتھ کیا جاتا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل دہلی بادشاہ کو پرانی عظمت کی نشانی سمجھتے تھے۔ بادشاہ کی غزلوں میں دلّی کی فضا پر اس وقت جو پستی اور مایوسی طاری تھی اس کا عکس پایا جاتا ہے۔ ہر غزل سوز و گداز سے پُر ہے۔

"اخبار دہلی" برطانوی نظام حکومت کے بعض اقدامات پر موقر لہجے میں نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ بعض اعتراضوں سے ناراضگی کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ جو ۱۸۵۷ء میں انتہا کو پہنچ گئے۔ دہلی میں انگریز جتنے اُس وقت موجود تھے ان کی معاشی زندگی کے دلچسپ پہلوؤں پر بھی اس اخبار نے روشنی ڈالی ہے۔ شام کو بگھیوں میں سوار ہوکر نکلنا کشتی چلانا۔ اور مچھلیوں کا شکار، ان کی دل پسند تفریحیں تھیں۔ یورپین آبادی کی معاشی دلچسپیوں اور تفریحوں میں افسر اور ہندو امرا بہت حصہ لیا کرتے تھے۔ اور یہ دونوں بہت ہر دلعزیز تھے۔ ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں ضیافتوں میں میزبان خواتین بے دریغ روپیہ صرف کرسکتی تھیں۔ زندگی کی بے مزگی اور یکسانیت کو دور کرنے کیلئے کبھی کبھی بازیگر کا تماشہ یا ناچ بھی ہو جاتا تھا۔"

چھپا کرتا تھا۔ ترکی، ایران اور حیدرآباد دکن کی خبروں کے سوا دوسرے ممالک کی خبریں بہت مختصر ہوتی تھیں۔ اس اخبار کی زبان کسی قدر پرانی تھی۔ "نورِ مشرقی" میں ایک اور اخبار "نورِ مغربی" کا بھی ذکر پایا جاتا ہے۔ "نورِ مغربی" اور "نورِ مشرقی" کے درمیان چشمک رہتی تھی غالباً ایک دوسرے کی ضد میں نکلتے تھے۔

بہرحال پچھلی صدی کے آخر اور موجودہ صدی کی ابتدا میں "اللخبار" یا "الاخبار" کے اخباروں کا خاتمہ ہوگیا۔ اور اردو جرنلزم نے دورِ شیرخوارگی سے دورِ طفلی میں قدم رکھا۔ آج جس پایہ کے اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں ان کے مقابلہ میں موجودہ صدی کے ابتدائی جرنلزم کو میں طفلی ہی سے تعبیر کرسکتا ہوں۔ موجودہ صدی کی ابتدا میں روزانہ اخبار اردو کے صرف دو تھے۔ ایک لاہور کا "پیسہ اخبار" اور دوسرا لکھنؤ کا "اودھ اخبار"۔ رسالوں میں لاہور کا "مخزن" بہت دن بعد کانپور سے "زمانہ" نے جنم لیا۔ پھر اُس کے کافی عرصہ بعد الہ آباد سے "ادیب" نکلا۔ ہفتہ وار اخباروں کی تعداد البتہ کافی تھی۔ موجودہ صدی کی ابتدا میں ہفتہ وار اخبار ہی اخبار سمجھے جاتے تھے۔ مجھے سب سے پہلے جس اخبار کی زیارت ہوئی وہ "البشیر" اٹاوہ تھا۔ میرے والد اٹاوہ کے قریب ملازم تھے۔ وہ "البشیر" خریدتے تھے۔ اور پڑھکر مجھے بھیج دیتے تھے۔ "البشیر" جیسا آج ہے ویسا ہی پچاس برس پہلے بھی تھا۔ آج کے اخباروں میں بھی وہ شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اور پچاس برس پہلے کے اخباروں میں بھی اُس کا شمار ہوتا تھا۔

اُردو جرنلزم میں انقلاب مولانا ظفر علی خاں نے کیا۔ ان کے بعد مولانا ابوالکلام کا نام لیا جاسکتا ہے۔ پھر مولانا محمد علی مرحوم کا۔ ان تینوں بزرگوں کی بدولت اردو جرنلزم بہت بلندی پر پہنچ گئی۔ انہوں نے اعلیٰ پایہ کے اخبار ہی نہیں نکالے۔ بلکہ اخبار ان کے پڑھنے والوں میں ایک انقلاب بھی رونما کردیا۔

ان کی ڈگر پر چلنے والے آج بہت سے اخبار نظر آتے ہیں اور اُردو جرنلزم روز بروز ترقی پذیر ہے۔ لیکن جو معیار انگریزی اخباروں کا ہے اُس تک اُردو اخبار ابھی نہیں پہنچے ہیں۔ حالانکہ ہندستان کی دوسری زبانوں کے اکثر اخباروں نے وہ معیار حاصل کرلیا ہے۔ اسکی وجہ یا تو اُردو اخبار پڑھنے والوں کی بدمذاقی ہے یا اُردو نویسوں کی بے زری اور کم علمی۔

جدید اُردو نثر کا سنگ بنیاد کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں رکھا گیا تھا۔ اور بنگالی نثر نے اُردو نثر کے بعد ترقی کی طرف قدم اُٹھایا۔ لیکن کہتے ہیں کہ بنگالی نثر، ادب اور صحافت دونوں میدانوں میں اُردو سے آگے بڑھ چکی ہے۔ اور انگریزی کا مقابلہ کررہی ہے۔

(باقی آئندہ)

عشرتِ تنہائی

از جناب اسرار الحق صاحب مجاز۔ بی، اے (علیگ)

میں کہ میخانۂ اُلفت کا پُرانا میخوار
محفلِ حُسن کا اک مطربِ شیریں گفتار
ماہ پاروں کا ہدف زہرہ جبینوں کا شکار
نغمہ پیرا و نواسنج و غزلخواں ہوں میں

کتنے دلکش مرے بتخانۂ ایماں کے صنم
وہ کلیساؤں کے آہو وہ غزالانِ حرم
ہیں ہمہ شوق و محبت وہ ہمہ لُطف و کرم
مرکزِ مرحمتِ محفلِ خوباں ہوں میں

موجزن ہے مئے عشرت مرے پیمانوں میں
یاس کا درد ہے کم تر مرے افسانوں میں
کامرانی ہے پرافشاں مرے رومانوں میں
یاس کی سعیِ جنوں خیز پہ خنداں ہوں میں

میرے افکار میں مہتاب کی طلعت غلطاں
میری گفتار میں ہے صبح کی نزہت غلطاں
میرے اشعار میں ہے پھولوں کی نکہت غلطاں
اوجِ گلزار ہوں میں جانِ گلستاں ہوں میں

لاکھ مجبور ہوں میں ذوقِ خود آرائی سے
دل ہے بیزار اب اس عشرتِ تنہائی سے
آنکھ محروم نہیں ہے مری بینائی سے
محرمِ درد و غمِ عالمِ انساں ہوں میں

کیوں نہ چاہوں کہ ہر اک ہاتھ میں پیمانہ ہو
یاس و محرومی و مجبوری اک افسانہ ہو
عام اب فیضِ مئے و ساقی و میخانہ ہو
رند ہوں اور جگر گوشۂ رنداں ہوں میں

اب یہ ارماں کہ بدل جائے جہاں کا دستور
ایک اک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک اک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب و سمور
اب یہ بات اور ہے خود چاک گریباں ہوں میں

احسان دانش

(از جناب ضیاء الاسلام صاحب بی۔ سی۔ ایس)

دگرگوں ہو جہاں تاروں کی گردش تیز ہو ساقی

دلِ ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہو ساقی

لیکن یہ غوغائے رستاخیز، یہ گردش کی تیزی آخر کیوں اور کس طرح ؟ یہ ہمارے ادب میں کس طرح داخل ہوئی ؟ ہماری زندگی کے تبدیل ہوجانے سے یا خارجی اسباب کی بنا پر۔ غدر سے پہلے اُردو شاعری کی دنیا میں ناسخ اور ذوق کا سکہ رواں تھا۔ مضمون آفرینی اور لفظی صنعتیں اُردو شاعری کی پونجی بنی ہوئی تھیں "کیا نیا مضمون پیدا کیا ہے کیسا مضبوط شعر کہا ہے کیا صنعت ہے" الحسم کی داد پر شاعر پھولے نہ سماتے تھے۔ ایک تالاب میں سب لوگ جمع تھے۔ اسی پانی سے غسل کرتے تھے اور اُسی پانی کو پیتے تھے۔ لیکن مطمئن تھے اور اپنی شاعری پر نازاں۔ غدر کے بعد زمانہ پلٹا۔ زمین اور آسمان نئے روپ میں نظر آنے لگے۔ سماج کا رنگ بدل گیا۔ گھر گھر اس زلزلہ کا اثر ہوا۔ کچھ لوگ ماتم میں مبتلا ہوگئے۔ کچھ لوگ کمر باندھکر تعمیر کی طرف رجوع ہوئے۔

اب غالب اقلیم سخن میں نغمہ سنج تھے۔ انہوں نے پرانی محفلیں بھی دیکھی تھیں اور پرانی محفلوں کی بربادی بھی۔ انہوں نے یاس انگیز فلسفیانہ خیالات کو جو انکے گرد و پیش تھے شاعری میں جذب کرلیا۔ انہوں نے جدتِ خیال اور جدتِ الفاظ سے اُردو کے دامن کو بھرا لیکن انکی شاعری کشمکشِ حیات کے طوفانوں سے تنگ آکر فلسفیانہ بیخودی کی طرف راغب ہوئی۔ اس میں انکو تسکین ملی بیخودی کا افیون بندِ غم سے انسان کو کچھ عرصہ کیلئے تو آزاد کرہی دیتی ہے۔ یہ دور بھی ختم ہوا۔ داغ نے ایک بڑے سرکل سے اپیل کی۔ انہوں نے زندگی کی شورش کو مے و مینا، رندی و سرشاری، رنگینی و شوخی سے خوشگوار بنانا چاہا۔ وہ زندگی کو یہ کہہ کہکر بہلا گئے کہ

تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام

تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا

کسی نے تعریف کی تو پھر اور دل کے داغ دکھلانے لگے کہ

کیجے گا قتل ہم کو تو قربان جائینگے

پر سر کے ساتھ آپ کے احسان جائینگے

ہر چند آج کل سے زیادہ ہے سادگی

تیور یہ کہہ رہے ہیں کہ مہمان جائینگے

حالی نے اس فضا میں آنکھ کھولی۔ اب سرزمینِ بارِ منت دہاں کئے ہوئے" زمانہ گذر چکا تھا۔ لیکن دل کی بیتابی کا کوئی علاج نہ بیخودی کی افیون کرسکی۔ نہ وعدۂ فردا۔ اب خودداری کی نشو و نما کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گرد و پیش کا جائزہ لینے کی اہمیت ظاہر ہونے لگی۔ چنانچہ جو شاعری کو ہوش آیا تو درد کی وجوہات پہ غور ہونے لگا۔ سماج کے مرض کی تشخیص کی کوشش ہونے لگی۔ شاعری اس دور سے بھی گذرتی رہی یہاں تک کہ

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد

ایک سحر کار شاعر آپہنچا اور اُس نے اعلان کیا کہ

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے

شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے

اور ذوقِ عمل زندگی اور خودی شاعری کے ذریعہ فکرِ انسانی کو بلند کرنے لگیں۔ ان لوگوں کا زمانہ ختم ہوا جو

چشمِ آدم سے چھپاتے تھے مقاماتِ بلند

کرتے تھے روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

اب

زمانے کے انداز بدلے گئے

نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

اُردو شاعری کو اقبال نے ایک آتشِ خاموش سے آنچ دیکر کندن کر دیا۔ اسکا روپ بدل دیا۔ شاعری زندگی کی نئی شاہراہوں پہ چلنے لگی۔ ہر طرف سے نئے نغمے سُنائی دینے لگے۔ نئے پیغام نئے جذبات پھوٹ پھوٹ کر نشو و نما پانے لگے ان ہی تحریکات اور رجحانات کی ایک پیداوار اور اس ہی بہار کا ایک خوشنما پھول احسان دانش ہیں۔

احسان نے مصائبِ زمانہ کے الم انگیز پہلو کو جس طرح روشن کیا ہے وہ اب تک ہماری شاعری میں نہیں کیا گیا تھا۔ اُن کے یہاں سانس کی جگہ آنسو۔ دل کی جگہ جذبات نے لے لی۔ وہ افلاس بیچارگی، کرب و درد، ناداری و مجبوری کے رُخ سے اس طرح نقاب اُٹھاتے ہیں کہ دل سے چیخ نکل جاتی ہے۔ ایک طرح یہ میر اور فانی کے خاندان سے ہیں۔ لیکن میر اور فانی یاس ہی کو ایک جنتی عطیہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور احسان زندگی کے مصائب سے مقابلہ کرکے اس کو رنگین اور خوشگوار بنانا چاہتے ہیں۔ میر اور فانی نے موت کو زندگی سے زیادہ خوشنما بناکر پیش کیا ہے۔ احسان موت کی ایک بھیانک تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس تصویر کے خط و خال نمایاں کرتے ہیں اور پھر فکرِ انسانی کو دعوت دیتے ہیں کہ آبحیات کی تلاش

کرے۔ تریاق کا پتہ لگائے اور شورشِ حیات پر غلبہ حاصل کرے۔ اس تجربہ میں مشکلات بھی رہیں لیکن

یہ کفر کا فتوےٰ شاعر کی فطرت پر اثر کیا ڈالے گا
ایسے تو بہت الفاظ یہاں ہر وقت تراشے جاتے ہیں

ان کا نظریہ ہے کہ

علم اک تاب و تواں ہے زندگی کے واسطے
زندگی کے واسطے پائندگی کے واسطے
علم کے بل پر انوکھی چال چل سکتا ہے مرد
خارزاروں کو گلستاں میں بدل سکتا ہے مرد

ان کا مخاطب وہ طبقہ ہے جس کے افراد نے

دشمنوں کو ہم نشینوں سے چھپانے کے لئے
آستینیں لوٹ رکھی ہیں بہانے کے لئے

وہ فطرتِ انسان کو ظلم اور کینہ پروری سفاکی اور سنگدلی سے دور رکھنا چاہتے ہیں اور ان کے پیامِ عمل میں صداقت کو بڑی جگہ حاصل ہے۔ شرط یہ ہے کہ

دل پہ ہر دم نشۂ معصومیت طاری رہے
نیش کاوش میں صداقت کا لہو جاری رہے

یہ اُن کا عقیدہ ہے کہ

عرشِ اعظم ہے فغانِ بیکساں سے متّصل
نوسیوں کا ان کی خاموشی پہ بھر آتا ہے دل

لیکن جب وہ انتظار کرتے کرتے بے چین ہو جاتے ہیں تو یوں بھی چیخ اُٹھتے ہیں

جیوں خدائے کرم کی امید پر کب تک
حیات کو بھی قدم گیر کر دیا تو نے

اور پھر اقبال کے نرالے اور شوخ انداز میں کہتے ہیں کہ

جہاں میں مفلسی کس کی خوش اندیشی سے ہے یارب
یہ خلاقی تو آساں ہے مگر مشکل ہے رزّاقی

پھر بھی وہ بے دینی اور بے یقینی کی راہ پر ان کو نہیں ڈالتے کہتے ہیں

خدا کو پا نہیں سکتا خدا کی ذات کا منکر
نہ جب تک دل سے نقشِ ناتمامی دور ہو جائے
خدا وہ ہے کہ جسکی عظمت و جبروت کے آگے
خود انساں سجدہ کرنے کے لئے مجبور ہو جائے

درحقیقت یہی امتزاج یہی اعتدال ان کی شاعری کا طرّہ امتیاز ہے۔ "فسونِ بہار" اور "ساد ھو کی چتا" دونوں ان پر اپنا اثر کرتے ہیں۔ ان کا دل ایک آئینہ ہے جس پر ہر احساس اپنا نقش صاف صاف ڈالتا ہے اور پھر وہ نقش اُن کی شاعری میں منعکس ہو جاتا ہے۔ "پردہ" "نو عروس" "بیوہ" اور "جشنِ بیچارگی" میں وہ جس شدت سے غم کے نقوش پیش کرتے ہیں اسکی مثال اردو شاعری میں کم ملتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی "مردانگی" "بلند نظری" "اعلیٰ ظرفی" اور جرات ان کے کلام میں ایک مجاہدانہ شان پیدا کر دیتی ہے۔ وہ ستمگار مذہبی پیشواؤں کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں

دے کے جُل دُنیا کو اپنی فطرتِ ناپاک سے
وہ بنا لیتے تھے سونا مقبروں کی خاک سے
اُنکے ایمانوں میں رخنے تھے وفا میں داغ تھے
دل تھے ناقص دامنِ صدق و صفا میں داغ تھے
خانقاہوں میں دلوں کا مدعا بکتا رہا
مدّتوں ان کی دوکانوں میں خدا بکتا رہا

ایسی حالت میں وہ مکر و فریب کے خلاف جہاد کرنا فرض سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

اب تمہارا یہ طلسم ہاؤ ہو توڑوں گا میں
رازہائے خرقہ پوشی کھول کر چھوڑوں گا میں

میں احسان کی شاعری کے ارتقائی منازل سے اب تک اس کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ حدیث ادب اور "دردِ زندگی" پر میں نے جنوری ۱۹۳۵ء میں ایسٹرن ٹائمز لاہور میں ریویو کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ابھی ان کو زبان پر قدرت حاصل نہیں ہوئی۔ اور وہ اپنا مطلب بھی بعض مرتبہ صاف نہیں بیان کر سکتے۔ اس عرصہ میں اُن کے شاعرانہ شعور نے جو نشو و نما پائی اس کا ان دو قطعوں سے اندازہ ہو سکتا ہے۔

جب کسی کی یاد آ کر تملا جاتا ہے دل
جگمگا اٹھتی ہے کچھ اس حال سے بزمِ دماغ
جیسے ساون کی اندھیری رات میں اک نازنیں
صحن میں زینے سے اُترے ہاتھ میں لیکر چراغ

اور

یہ شبِ مہتاب یہ کشمیر میں ڈل کا سماں
پڑ رہا ہے پُر سکوں پانی میں عکسِ کوہسار
جیسے اک بیدین کے دل میں زباں زوری کے بعد
منعکس ہوتی ہے اکثر عظمتِ پروردگار

ان قطعات میں ان کا مفہوم حدود سے آزاد ہے اور بے پایاں وسعت اختیار کر لیا ہے۔ چار چار مصرعوں میں انہوں نے جس لطافت سے تشبیہیں پیش کی ہیں وہ انکی قدرت زبان کا پتہ دیتی ہیں۔ اب الفاظ انکے غلام نظر آتے ہیں۔ تنگنائے غزل کو انہوں نے چھوڑا نہیں بلکہ اپنایا ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک بلندی، سوز، سرور ہے۔ کہتے ہیں۔

نقاب دیدۂ خود میں سے جب سرکتا ہے | ہر ایک چیز میں حسنِ ازل جھلکتا ہے
نہیں ہے جذب اگر مجھ میں جلوۂ جاناں | زمانہ کس لئے صورت کو میری تکتا ہے
ہماری چشم تحیر کے دیکھنے والے | ٹھہر ٹھہر کہ یہ ساغر ابھی چھلکتا ہے
چمن میں بادِ صبا کی سبک خرامی سے | ہر ایک قطرۂ شبنم کا دل دھڑکتا ہے

اور

سینے کے داغ دل کو درخشاں نہ کر سکے | لاکھوں چراغ گھر میں چراغاں نہ کر سکے
سازِ طرب نشاطِ بہار و شبابِ گل | میرے سکوتِ غم کو غزل خواں نہ کر سکے
تیری نظر کے فیض سے ان مشکلوں میں ہوں | جن مشکلوں کو تو بھی اب آساں نہ کر سکے

ایک اور لطیف شعر ہے

قول گیا کہ ڈھونڈنے والے نہیں رہے | ہنگامہ کیوں وہ اب سرِ محفل نہیں رہا

ان کے مذہب شاعری میں جو وسعت اور ہمہ گیری ہے وہ بھی قابل قدر ہے۔ کہتے ہیں۔

حقیقت در حقیقت بتکدہ میں ہے نہ کعبہ میں | نگاہِ شوق دھوکا دے رہی ہے رہنما ہو کر
مرے سجدوں کی یارب ناتمامی دور ہو جائے | یہ کیا بے اعتنائی اپنے بندے سے خدا ہو کر

اور

مذاقِ عاشقی میں قائلِ دیر و حرم رہنا | اسی کو درحقیقت خامیِ ایماں بھی کہتے ہیں

حسرت موہانی کے انداز میں حضرت سری کرشن جی کی بارگاہ میں چند شعر نذر کرتے ہیں۔

سن اے مرلی منوہر جانِ جاں تصویرِ زیبائی | جگت موہن ہو تو من موہنی ہے تیری زیبائی
تری بنسی کی تانیں مضطرب جگنوں کے سینوں میں | ترے دم سے ضیاپاشی دلوں کے آبگینوں میں
تری تابانیاں ہیں صبح کے تابندہ اختر میں | تری نیرنگیاں ہیں شام کی زلفِ معنبر میں
تو وہ شے ہے زمانہ تجھ سے غافل رہ نہیں سکتا | تو وہ دولت ہے جس کو قلبِ فطرت کھو نہیں سکتا

احسان کی منظر نگاری انکے جذبۂ صداقت، قوتِ شاہدہ، تہ نشیں نظر، نزاکتِ احساس، نکتہ رس ذہن اور حیات کائنات کے جائزے نے اردو شاعری میں ایسے رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں اور ایسے بے بہا نقش تراشے ہیں جو ہمارے ادب کا سرمایہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اور ابھی ان سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ کیونکہ ان کی شاعری کا اصلی شباب ابھی آنے کو ہے جب سے

آئیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
موجِ گل کی ہمنفس بادِ صبا ہو جائے گی

غزل

حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی مدظلہ

نہ ہوگی رزم اگر، تو بزم وجہِ برہمی ہوگی
کسی صورت سے ہو دنیا تو اک دن ختم ہی ہوگی

مرن ہو جائے گا جینا، اگر صورت یہی ہوگی
سنا ہے زندگی ہی پھر مآلِ زندگی ہوگی

مجھے دنیا و ما فیہا سے کیا دلبستگی ہوگی
یوں ہی سہواً کبھی اسکی طرف آنکھ اٹھ گئی ہوگی

کہاں تک اس میں پیدا ہمت منزل رسی ہوگی
قدم اٹھتے ہی جو سمجھے کہ منزل آگئی ہوگی

فدا منشائے فطرت سے ہم آہنگی تو پیدا کر
جو تو چاہے گا پھر تجویز فطرت بھی وہی ہوگی

بقیدِ ہوش ہم تو دیکھتے ہیں حسن کے جلوے
جنہیں وارفتگی ہوگی انہیں وارفتگی ہوگی

اگر ہے تنگ سجدوں سے تو سر کو نذرِ در کر دے
جبیں جب تک ہے باقی احتیاجِ بندگی ہوگی

اسی میں خیریت ہے آگہی محدود ہے تیری
کہ اتنا ہی بڑھے گا وہم جتنی آگہی ہوگی

زمانہ گر مخالف ہے ترا بے مدعا ہو جا
نہ دل میں مدعا ہوگا نہ دنیا مدعی ہوگی

الٰہی! آسماں کب تک بنے گا مرجعِ ہستی؟
یہاں کب تک یونہی توہینِ خاکِ آدمی ہوگی

خودی والوں کو درسِ بیخودی دینا ہے لاحاصل
خودی جب حد سے گذری خود ہی عینِ بیخودی ہوگی

مری بربادیوں سے ظلم کے آثار چمکیں گے
لگی آگ آشیاں میں تو قفس تک روشنی ہوگی

اسی امید پر آجائے شاید نیند مدفن میں
کہ شامِ زندگی کے بعد پھر اک صبح بھی ہوگی

ملا انسان کو جب حوصلہ تدبیر عالم کا
مری دانست میں تقدیرِ عالم بن چکی ہوگی

مسافر جادۂ ملکِ فنا جلدی سے طے کر لے
پھر اس کے بعد مطلق زندگی ہی زندگی ہوگی

ہمیں بھی اپنی بربادی و تاراجی کا صدمہ ہے
مگر یہ سوچ کر خوش ہیں کہ ان کی تو خوشی ہوگی

وہ عالم فطرتِ تنہا کا دیکھا جائیگا کس سے
تماشائی نہ ہونگے، چاندنی چھٹکی ہوئی ہوگی

چہک لیں چہچہالیں، بول لیں ہنس لیں چمن والے
ذرا سی دیر میں پھر خامشی ہی خامشی ہوگی

نہیں اب انقلاب آباد میں مُردوں کی گنجائش
جئے گا وہ جسے حاصل مجالِ زندگی ہوگی

بچاتا پھر رہا ہے موت سے کیوں زندگی اپنی
پناہِ زندگی ہوگی تو اک دن موت ہی ہوگی

میں اے سیماب سورج بنکے چمکا ہوں اندھیروں میں
نہ ہونے سے مرے محسوس دنیا میں کمی ہوگی

کتابُ السّلف

(مُسلسل)

سلسلہ کیلئے "ادیب" ماہ مئی ۱۹۴۳ء ملاحظہ فرمائیے

از علامہ سیماب اکبرآبادی

میر بزمِ سخن حضرت میر تقی میر اکبرآبادی اعلیٰ اللہ مقامہ

آدمِ اُردو، رسولِ اوّلین شاعری — رُوح پرور، دلکشا نقشِ نگینِ شاعری
جادۂ شعر و ادب کے اے امیرِ کارواں — کھول دی فیضِ نوا سے تونے کانٹوں کی زباں
سوز کی شمعیں جلا دیں پیکرِ آواز میں — تونے دل کی آگ بھر دی شاعری کے ساز میں
دعوتِ تاب و تپش دی تونے آب و رنگ کو — گرمیٔ محفل بنایا نغمہ ہائے چنگ کو
میرِ بزمِ شاعری، تیرا مُسلّم ہے خطاب — آج تک دُنیا نہ پیدا کرسکی تیرا جواب

آگرہ کی عظمتوں کا سنگِ بنیادی ہے تُو
لکھنوی نقلاً ہے، اصلاً اکبرآبادی ہے تو

میری اس نظم میں شاعری صرف موزونیت کلام تک ہے۔ باقی حقائق ہی حقائق ہیں۔

عہد قدیم و جدید کے تمام مورخین اور عہدِ حاضرہ کے تمام نقاد متفق علیہ ہیں کہ میر تقی میر اکبرآبادی نے سب سے پہلے اُردو شاعری میں دل تک پہنچنے اور رُوح کو چھونے والے جذبات کی بنیاد ڈالی۔ میر سے پہلے سودا نے یہ زمین تیار کی تھی۔ مگر تخم ریزی فی الحقیقت میر ہی کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اب سے پہلے موزوں الفاظ کے مجموعے کا نام شاعری تھا۔ گو فیضِ رُوح القدس سے بعض قدما کے کلام میں بھی ایسے اشعار کا پتہ چلتا ہے جن میں جذباتِ حُسن و عشق سموئے گئے ہیں۔ مگر شاذ شاذ۔ یہ دولت صرف میر اکبرآبادی کی قسمت میں تھی، جس نے جذبات اور سوز و گداز کی چنگاریاں لعل و گوہر کی طرح سطحِ ادب پر بکھیر دیں۔ بہت کہا اور جتنا کہا اُس میں بہت بڑا حصہ جذباتی اور نفسیاتی شاعری کا تھا۔ میر کی نگاہ یقیناً ولی کے بعض منتخب اشعار، مرزا مظہر جانجاناں کے بعض دردمیں ڈوبے ہوئے تیر اور سودا کے بعض جذباتی نشتروں پر بہت گہری پڑی۔ یہ شعرائے قدیم چند ایسے نقوش چھوڑ گئے تھے جنکی تقلید ہی حقیقی شاعری تھی۔ مگر اُن کے خاکے اس قدر دھندلے اور خاک آلود ہوگئے تھے کہ صنعتوں اور مبالغہ آمیز شاعری کے طمطراق میں انکا نمودار کرنا دشوار تھا۔ میر اکبرآبادی کی نگاہ دوررس نے انہیں غور و تعمق سے دیکھا۔ اُن پر کبھی نہ مٹنے والی زندگی بائی۔ اور انہیں کی نشو و نما اور تہذیب و ترصیع میں مصروف ہوگئے۔ اس خصوص میں انہیں یہاں تک کامیابی ہوئی کہ بالآخر وہ ایک خاص اسلوب بیان کے مالک بن گئے۔ اور صاحب طرز کہلانے لگے۔ ان کے خیالات و احساسات میں ہم رنگی کے ساتھ ایک ایسی یکرنگی پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے کمال و کلام میں منفرد نظر آنے لگے۔ اب انکی حیثیت مقلد کی نہ رہی۔ بلکہ وہ مجتہد فن شاعری مانے جانے لگے۔ اور اُن کے بعد آنے والے شعرائے انہیں بے چون و چرا اپنا امام تسلیم کرلیا۔ یہ کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا "۔ " نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب" یہ سب اعترافات ہیں جن سے میر صاحب کا میر بزمِ سخن ہونا ثابت ہوتا ہے۔

نام و نسب

محمد تقی نام میر تخلص۔ ۱۱۳۵ھ میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ میر علی متقی والد کا نام تھا۔ جو شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی کے مریدِ خاص اور ایک باکمال و صاحبِ حال صوفی تھے۔ بیرونِ شہر متصل عیدگاہ ان کا مکان تھا۔ بعض تذکروں میں میر صاحب کے والد کا نام محمد علی اور بعض میں عبد اللہ لکھا ہے۔ اور یہ کہ علی متقی اُن کے پیر کا بخشا ہوا لقب تھا۔ بہرحال وہ علی متقی ہی کے نام سے زمانہ میں مشہور ہوئے۔ میر صاحب کے دادا اکبرآباد میں فوجدار تھے۔ پچاس برس کے سن میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اور اکبرآباد ہی میں کہیں دفن ہوگئے۔ میر صاحب کی عمر دس سال تھی کہ اُن کے والد کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور وہ بھی آگرہ ہی میں سپردِ خاک کئے گئے۔ میر صاحب سید تھے۔

سید ہیں میر صاحب درویش و درد مند — سر رکھئے انکے پانوں پہ جائے ادب ہے یہ

تعلیم و تربیت

میر صاحب کی تعلیم و تربیت آگرہ ہی میں ہوئی سات برس کی عمر میں قرآن شریف ختم کیا۔ کچھ تعلیم سید امان اللہ سے پائی۔ کچھ اپنے والد مرحوم سے سترہ برس کی عمر تک آگرہ ہی میں رہے۔ والد کے انتقال کے بعد محلہ عیدگاہ سے اُٹھ کر سید محمد باعث ہمشیرہ زادہ سید علی متقی کے مکان پر "عالم گنج" چلے آئے تھے۔ عیدگاہ اور عالم گنج دونوں محلے اس وقت تک آگرہ میں موجود ہیں۔

میر صاحب کی وطنیت

غالباً ہندستان میں پہلا شخص میں ہوں جس نے میر تقی میر کو اکبرآبادی لکھنا شروع کیا۔ ورنہ اس سے پہلے انہیں لکھنوی لکھا جاتا تھا۔ اور یہ ایک ایسی غلطی تھی جسکا ازالہ ضروری اور لازمی تھا۔ تعیین وطنیت کی تجدید پر ارباب لکھنؤ بہت چیں بجبیں ہوئے۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگوں نے بھی اظہار ناگواری کیا۔ اور مولوی عبد الحق دہلوی نے میری ایک کتاب پر ریویو کرتے ہوئے (بہ الفاظ مختلف) یہ بھی لکھدیا کہ "سیماب بعض شعرا کو اکبرآبادی بنانے کے بہت شائق ہیں"۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے خیالات محض حُسنِ ظن کہے جاسکتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میر و غالب کے علاوہ جن کا اصلی حقیقی اور آبائی وطن اکبرآباد یا آگرہ ہی تھا۔ میں نے کسی دوسرے شاعر کے اکبرآبادی ہونے پر کبھی اصرار نہیں کیا۔ "ادیب" میں مرزا عسکری لکھنوی سے بھی اس مسئلے پر بہت کچھ بحث ہوچکی ہے۔ اُن کا نظریہ

یہ تھا کہ شاعر جہاں آخر عمر میں رہتا سہتا ہو اور جہاں مرنے کے بعد دفن ہوا ہو اُسی مقام سے اسے منسوب کرنا چاہیئے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے تو مرزا داغؔ دہلوی، امیرؔ مینائی لکھنوی۔ فانیؔ بدایونی اور آزادؔ انصاری سہارنپوری وغیرہ شعرا کو "دکنی" یا حیدرآبادی لکھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ انکی آخری عمریں یہیں گذری ہے اور یہ سب حیدرآباد ہی میں مرے اور وہیں دفن کئے گئے ہیں۔ آخر میری اس گذارش پر انہیں خاموش ہو جانا پڑا۔ اور انکے اس غلط نظریے کو شکست ہوگئی۔ میرے خلف اصغر اعجاز حسین اعجازؔ صدیقی نے حال میں "بساطِ سخن" کے نام سے ایک نظم لکھی ہے جو "عالمگیر" اور "شاعر" میں چھپ چکی ہے۔ اس نظم میں ہر شاعر کے نام کے ساتھ اسکی وطنیت کا تعین بھی کر دیا گیا ہے۔ اس پر جناب شبلیؔ بی کام ایڈیٹر "عالمگیر" نے اعجاز سلمہٗ کو لکھا کہ وطنیت کا خیال نسلی تفاخر اور صوبوی یا علاقوی امتیاز کے احساس سے پیدا ہوا۔ اس لئے آپ اس کے افادی پہلو سے منکر نہ ہوں۔ میں گو اسکے خلاف ہوں۔ عرب ایران اور ہندستان میں چونکہ قومی، وطنی اور نسلی امتیازات کو خاص اہمیت حاصل ہی ہے اسلئے ان ملکوں کے شاعر اپنے نام کیساتھ وطنی نسبت بڑھا دیتے ہیں۔ ورنہ امریکہ اور یورپ کے شاعر تو اس قسم کے دم چھلوں کو پسند نہیں کرتے۔ عرب، ایران اور ہندستان میں بھی اب نا شستہ کے خیالات چھٹ رہے ہیں۔ اس لئے یہ امتیاز بھی آہستہ آہستہ اٹھ جائیگا۔ اقبال اور ظفر علی خاں چونکہ مولوی تعصب سے بہت بالا ہیں۔ اس لئے انہوں نے وطنی نسبت کا کہیں خیال تک نہیں کیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ شبلی صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شاعر آفاقی نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکے خیالات آفاقی ہوتے ہیں۔ شاعر قیدِ زبان و مکان سے بھی آزاد نہیں ہوتا۔ ایک خاص عہد میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک خاص عہد میں شہرت پاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اسکا ایک مسکن بھی ضرور ہوتا ہے۔ اور اُسی مقام یا مسکن کی نسبت سے تاریخ اُسے یاد کرتی ہے۔ "ڈاکٹر محمد اقبال ایم اے پی ایچ ڈی" کے نام سے دو ہستیاں بیک وقت پنجاب میں موجود تھیں۔ ایک اورئنٹل کالج کے پروفیسر اور ایک ڈاکٹر اقبال مرحوم۔ پروفیسر صاحب اب بھی بقید حیات ہیں۔ ان دونوں شخصیتوں میں جبکہ دونوں کا شغل محبوب "ادب" ہی ہو کون سی چیز وجہ امتیاز ہو سکتی ہے؟ صرف وطنیت ——— پروفیسر صاحب لاہوری ہیں اور ڈاکٹر اقبال سیالکوٹی تھے۔ جب ہم ڈاکٹر اقبال سیالکوٹی کہتے ہیں تو ہمارا ذہن فوراً "بانگ درا" اور "ضرب کلیم" کے مصنف کی طرف متبادر ہو جاتا ہے اور جب ہم ڈاکٹر اقبال لاہوری کہتے ہیں تو ہمارا مقصود کلام پروفیسر صاحب ہوتے ہیں۔

ہندستان کو امریکہ اور یورپ کے معیار پر دیکھنا، غلط نظری ہے۔ وہاں بعض مشہور شہروں میں اکا دکا شاعر پائے جاتے ہیں اور یہاں ہر شہر میں ۳۶ شاعر موجود ہیں۔ اس مسئلہ کے ایک دوسرے پہلو پر بھی غور کر لیجئے۔ ہمارے ملک میں جس طرح ایک نام رکھنے والے بے شمار انسان ملتے ہیں اسی طرح ایک ہی تخلص رکھنے والے بے شمار شاعر بھی ایک ہی عہد میں یا مختلف زمانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اب بھی میرؔ اجمیری اجمیر میں اور غالبؔ برہانپوری برہانپور میں موجود ہیں۔ اب اگر ان موجودہ میرؔ و غالبؔ کے ساتھ وطنیت کی قید نہ ہو تو میر تقی میرؔ اکبرآبادی اور مرزا غالبؔ اکبرآبادی میں ما بہ الامتیاز کیا ہوگا؟

قدیم تذکروں میں بھی ایک ایک تخلص کے کئی کئی شاعر موجود ہیں۔ ان کی وطنیت ہی انہیں باہم ممتاز کرتی ہے۔ خود میرؔ کے زمانے میں دو میرؔ تھے۔ میر سوز کا تخلص بھی میرؔ ہی تھا۔ لیکن جب اُنہوں نے دیکھا کہ میر تقی میرؔ کے سامنے انکی شہرت کا چراغ نہیں جل سکتا تو جلکر اپنا تخلص سوزؔ رکھ لیا۔

بسا اوقات شاعر کا وطن اسکی شہرت و سند کا سبب ہوتا ہے اور بعض اوقات شاعر اپنے وطن کی شہرت و تعارف کا باعث بن جاتا ہے۔ موہان۔ بلگرام اور کاکوری بالکل معمولی قصبے ہیں۔ لیکن ان قصبوں کو حسرتؔ، صفیرؔ اور محسنؔ کی نسبت نے آج تمام ہندستان میں غیر فانی شہرت دے دی ہے۔

بنا٫ علی ہذا میں اسی کو انسب و اولیٰ سمجھتا ہوں کہ ہر مشہور شاعر کے ساتھ اس کی صحیح وطنیت کا اظہار ضرور ہونا چاہیئے۔

میر تقی میرؔ اکبرآبادی تھے۔ یہ میر قول فیصل ہے جس کے آبا و اجداد آگرہ میں رہے اور آگرہ ہی میں دفن ہوئے۔ جو آگرہ میں پیدا ہوا۔ جس نے آگرہ میں تعلیم و تربیت پائی۔ جو آگرہ کی آب و ہوا میں پروان چڑھا۔ جو پیدا ہونے کے بعد سترہ سال تک مسلسل آگرہ میں رہا۔ اور جو آگرہ سے ہجرت کرنے کے بعد بھی متعدد مرتبہ آگرہ آکر متمکن ہوا وہ "اکبرآبادی" نہ کہلائے گا تو کیا "پشاوری" کہلائے گا۔؟

میر صاحب نے اپنے تذکرے میں یا اپنے کلام میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ وہ دہلوی یا لکھنوی ہیں مگر "اکبرآبادی" ہونے کا اعتراف اُن کے یہاں موجود ہے۔

"ہائے وہ میرؔ اکبرآبادی"

اگر میر صاحب نے کسی مصرعہ میں اپنے کو میرؔ دہلوی یا میرؔ لکھنوی لکھا ہو تو پیش کیا جائے۔ پھر لکھنؤ والوں کو کیا حق ہے کہ وہ میرؔ اکبرآبادی کو میر لکھنوی لکھیں۔ جبکہ وہ مزار میرؔ کے آثار تک محفوظ نہ رکھ سکے؟

مجھے مسرت ہے کہ "انجمن بہارِ ادب لکھنؤ" نے جو ادبی ٹکٹ رائج کئے تھے جن پر مشاہیر ادب کی تصویریں ثبت تھیں ان میں میر صاحب کی تصویر کے نیچے میر تقی میرؔ اکبرآبادی چھپوایا تھا یہی بے تعصبی اور حقیقت نگاری ہے۔ اکثر حق دوست اہلِ قلم بھی اب میر صاحب کو اکبرآبادی ہی لکھتے ہیں۔ فہو المقصود۔

اکبرآباد سے دہلی اور تلمذ

میر صاحب کی ولادت سے ایک صدی پہلے مغل سلطنت کا دار الملک اکبرآباد سے دہلی منتقل ہو چکا تھا۔ اور وہاں اب شاہ عالم کی حکومت تھی۔ اکبرآباد میں شرفا اور ادبا کا کوئی قدردان تو کیا پوچھنے والا بھی نہ تھا۔ باپ کی

وفات کے بعد گھر کا سارا بار میر صاحب کے نازک کاندھوں پر آپڑا تھا کچھ ادائے قرض کی بھی فکر تھی اس لئے ۱۱۵۵ھ میں آگرہ سے دہلی چلے گئے۔ وہاں خواجہ باسط کی سفارش سے امیر الامرا صمصام الدولہ نے ان کا ایک روپیہ یومیہ مقرر کر دیا۔ مگر جب صمصام الدولہ نادر شاہ کی ہنگامہ آرائی میں مارے گئے تو میر صاحب بیکار ہو کر پھر اکبرآباد واپس چلے آئے۔ یہاں اب کون تھا جو انکی خاطر داشت کرتا۔ اس لئے کچھ عرصہ آگرہ میں ٹھہر کر پھر دلی پہنچے اور اپنے سوتیلے ماموں محمد حسن خاں و سراج الدین علی خاں آرزو اکبرآبادی کے یہاں مقیم ہوئے۔ خان آرزو کی محبت نے میر صاحب کی تعلیم و تربیت کا تکملہ کیا میر صاحب خان آرزو سے اصلاح بھی لینے لگے۔ اور عربی علوم متداولہ کا بھی ان کی معیت میں اکتساب کیا۔

میر صاحب مدت تک خان آرزو کے یہاں رہکر کسب کمال کرتے رہے اور دہلی میں انکی شہرت ہوگئی۔ بالآخر رعایت خاں نے جو اعتماد الدولہ قمر الدین کے داماد تھے، انہیں اپنے مصاحبین میں لے لیا اور میر صاحب کی زندگی اطمینان سے بسر ہونے لگی۔

لیکن کچھ روز بعد ہی ابدالیوں کا حملہ ہوا۔ سانبھر کے پاس مرہٹوں سے جنگ ہوئی جس میں رعایت خاں کے ساتھ انہیں بھی شریک ہونا پڑا۔

رعایت خاں کی مصاحبت کے بعد نواب بہادر کی مصاحبت نہیں رہی پھر دیوان مہاراجہ کے متوسلین میں شامل ہوگئے۔ اسکے بعد راجہ ناگرمل کے لڑکے نے خواجہ غالب کی سفارش سے میر صاحب کا کچھ درماہہ مقرر کر دیا جو ایک سال تک ان کو ملتا رہا۔

ناگاہ نادر شاہ درانی کا دوسرا حملہ ہوا۔ دلی پھر لوٹی گئی۔ اور اب کی مرتبہ ایسی تباہ ہوئی کہ مدتوں پنپنے کی نوبت نہ آئی میر صاحب دہلی سے بہ متعلقین برسانہ پہنچے۔ وہاں کچھ روز ٹھہر گئے۔ راجہ ناگرمل کے صاحبزادے رائے بشن سنگھ نے میر صاحب کو ٹھہر لیا اور کچھ وظیفہ بھی مقرر کر دیا جب دلی میں سکون ہوا، راجہ ناگرمل معہ اپنے عمائدین اور سرداروں کے ساتھ دہلی واپس ہوئے تو میر صاحب بھی انکے ساتھ دہلی آگئے۔

سورج مل جاٹ بغاوت کرکے جب اکبرآباد پر متصرف ہو گیا تو خود بادشاہ کو اُسے مغلوب کرنے کیلئے اکبرآباد آنا پڑا اسوقت سورج مل نے ناگرمل سے مدد چاہی۔ اور ناگرمل بھی اکبرآباد پہنچ گیا۔ اسی کے ساتھ میر صاحب بھی آگرہ آئے اور یہاں چار مہینے تک مقیم رہے۔

اس کے بعد بھی ایک مرتبہ جب رگھوناتھ راؤ دکنی نے ملک میں فتنہ و فساد پھیلا دیا تھا۔ میر صاحب ناگرمل کے ساتھ پھر آگرہ آئے اور پندرہ بیس روز آگرہ رہ کر واپس دہلی چلے گئے۔

راجہ کی ملازمت ترک کر دینے کے بعد وجیہہ الدین خاں برادر حسام الدولہ کے متوسلین میں شامل ہو گئے۔

دہلی سے لکھنؤ آخرکار انکی شہرت دہلی سے لکھنؤ پہنچی۔ نواب آصف الدولہ نے انکو بلا بھیجا میر صاحب دہلی کی تباہی اور اپنی پریشان حالی سے بہت مغموم تھے۔ اس بلاوے کو غنیمت جانا اور دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ نواب آصف الدولہ نے تین سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور میر صاحب اب فراغت سے زندگی بسر کرنے لگے۔ دربار آصفی میں ان کی بڑی عزت تھی۔ وزیر الممالک سفر و شکار اور سفر و حضر میں میر صاحب کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد نواب سعادت علی خاں نے میر صاحب کی قدر کی۔ لکھنؤ میں میر صاحب کو سب نے استاد مانا۔ اور سلک شاعری کا پیشوا تسلیم کیا۔

سیرۃ میر تقی میر اکبرآبادی ایک صوفی اور باکمال و دلکش بچے بیٹے تھے۔ اور خود بھی عشق کی چوٹ دل پر کھائے ہوئے تھے اس لئے طبیعت میں سوز و گداز تھا۔ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ متوکل، سپاہی پیشہ، رقیق القلب، کم اختلاط اور سنجیدہ تھے مگر استغنا انکی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ وہ اپنی خودداری کے سامنے دولت و جاہ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ اُمرا اور وزرا کی مجالس میں ہمیشہ اپنی آن قائم رکھتے تھے۔ وہ فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنا اپنا فخر سمجھتے تھے مگر کسی کے سامنے دستِ سوال پھیلانا ان کی عادت میں داخل نہ تھا اُنکا لباس اور انکی وضع قطع سپاہیانہ تھی۔ آخر عمر میں دُنیا سے بالکل متنفر ہو گئے تھے۔

وفات میر صاحب لکھنؤ میں گومتی کے جنوبی کنارے پر محلہ ستہٹی میں رہتے تھے سنا ہے کہ میر انیس کا مکان بھی اسی محلہ میں تھا۔ آخر عمر میں بعض مزمن امراض اور ضعف بصر میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مگر شعر و سخن سے دلچسپی برابر باقی تھی۔ اتفاق وقت سے تین سال میں ان کے یہاں متواتر تین موتیں ہوئیں۔ ایک سال انکی لڑکی کا انتقال ہوا۔ دوسرے سال لڑکے کا اور تیسرے سال اہلیہ کا۔ ان سانحات سے میر صاحب بیحد شکستہ دل ہو گئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

اختلال صحت کے ساتھ ساتھ وجع المفاصل اور درد قولنج کے دورے پڑنے لگے۔ علاج معالجے بڑی توجہ کے ساتھ ہوتے رہے۔ مگر میر صاحب کا پیمانہ عمر لبریز ہو چکا تھا ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

حوادث نے اُن کی قوت حیات پہلے ہی چھین لی تھی۔ امراض نے انہیں اور بھی مردہ کر دیا۔ آخرکار ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ کو وقتِ شام نوے برس کی عمر میں وہ آفتاب جو سواد اکبرآباد پر طلوع ہوا۔ اور دہلی میں نصف النہار پر پہنچا۔ لکھنؤ میں غروب ہو گیا۔

۲۱ شعبان ۱۲۲۵ھ بروز شنبہ دوپہر کے وقت اکھاڑہ بھیم میں جو ایک مشہور قبرستان تھا سپرد خاک کر دیئے گئے۔ میر صاحب کا سب سے آخری شعر جو انہوں نے مرض الموت میں کہا تھا یہ ہے ؎

ساز بہ سیج آمادہ ہے سب، چلنے کی تیاری ہے
مجنوں ہم سے پہلے گیا ہے اب کے ہماری باری ہے

(باقی باقی)

شیطان

(از جناب الطاف مشہدی)

وہ جس کے نام سے موسیقیوں کا رس ٹپکتا ہے
شمیم جانفزا کا مخملیں دامن مہکتا ہے
وہ جس کی مسکراہٹ میں ستارے جھلملاتے ہیں
وہ جس کے عنبریں لہجے میں ساغر گنگناتے ہیں
وہ جس کی یاد میں بدمستیاں پہلو بدلتی ہیں
جوانی کی حسیں پریاں شرابی ہو کے چلتی ہیں
تصوّر میں کبھی جب جھوم کر آنکھیں ملاتا ہے
تو میرے ناتواں ہاتھوں سے ساغر چھوٹ جاتا ہے
وہ جس کے سایۂ رحمت سے جنّت جھینپ جاتی ہے
تھکے ہارے ہوؤں کو راحتوں کی نیند آتی ہے
شریعت جس کی خوابوں سے حسیں معلوم ہوتی ہے
حسینوں کے نقابوں سے حسیں معلوم ہوتی ہے
گناہوں سی حسیں شے جس نے دُنیا کو عطا کی ہے
ترنّم آفریں شے جس نے دُنیا کو عطا کی ہے
وہ خودداری کے دریا جس کی شریانوں میں بہتے ہیں
سمجھ سکتا نہیں میں کیوں اُسے شیطان کہتے ہیں

ایک حور اور ایک ملّا

(از جناب راجہ مہدی علی خانصاحب)

جب شام جنت میں ہوئی،
باغوں میں ہر سُو گھوم کر،
حوریں مری سب آ گئیں،
بیٹھیں مرے نزدیک سب ۔
چوما ہر اک کا میں نے مُنہ ۔
پر جب انہیں میں نے گِنا ۔
جو سب سے پیاری اُن میں تھی ۔
تھی وہ ہی کم ۔
مُلّا تھا اک
عیّار ہمسایہ مرا ۔
میں نے گرج کر
یہ کہا اُس سے کہ
او ملعون ادھر
آ تو ذرا
سچ سچ بتا
کیا بات ہے ؟
ورنہ دبوچوں گا ترا
موٹا گلا !

سلمیٰ کے نام

از
جناب سعید احمد ملک گیلانی

اُنہیں معلوم ہے سلمیٰ کہ ابھی زندہ ہیں
ہمیں مفلس
ہمیں بے کس ـــ ہمیں نادار ـــ "غریب"
پھر وہ کیوں جھانک کے دیکھیں گے
کسی مُرجھائی ہوئی پھول کی پتّی کو
جو پتنگے کی طرح ـــ
اُن کے قصروں کے تلے ـــ
سر جھکائے سرِ دیوار چلا جاتا ہو
تیری آنکھوں میں نمی کیسی ہے
تیری منزل ہے ابھی ـــ دور ـــ مگر "صبر طلب"
تو گو بے کس بھی ہے
بے بس بھی ہے ـــ لاچار بھی ہے ـــ
دیکھ کر اُن کی حریصانہ نگاہ
جن میں ہم جیسے بہت سے "معصوم"
رقص کرتے ہوئے تجھ کو بھی نظر آئیں گے
مجھے معلوم ہے مجھ سے نہیں پوشیدہ ذرا
"رقص کے دیکھنے کی تجھ میں ذرا تاب نہیں"
خوف سے کانپ نہ جانا پھر بھی ـــ
تیری منزل ہے بہت ـــ دور ـــ مگر صبر طلب"
اُن کی بے باک ہنسی ـــ
اُن کے ناپاک یہ ہونٹ
چوستے ہیں جو غریبوں کا لہو ـــ
یاد آئیں گے سبھی
عہدِ گذشتہ کے فسانے تجھ کو
بھول کر بھی نہ انہیں پاس پھٹکنے دینا
ڈگمگا جائیں گے ورنہ ـــ "یہ قدم"
جن کی منزل ہے بہت ـــ دور ـــ مگر "صبر طلب"

غزل

حضرت احسان دانش

لاکھ چاہا مگر افسوس کہ آنسو نہ تھمے
ضبطِ غم ہم سے بقدرِ غمِ پنہاں نہ ہوا

ہیں رہا در پہ ہر اک سانس کے مصروف سجود
کوئی سجدہ بھی تری شان کے شایاں نہ ہوا

ذرے ذرے پہ یہ اعلانِ پریشانی ہے
مطمئن خاک وہ ہوگا جو پریشاں نہ ہوا

جس کے دامن سے ہو وابستہ مرا ذوقِ حیات
وہ بھی کافر مرے معیار کا انساں نہ ہوا

غمِ دنیا، غمِ عقبیٰ، غمِ ہستی، غمِ موت
کوئی غم بھی تو حریفِ غمِ جاناں نہ ہوا

میری تخلیقِ ادب میں ہے قصیدہ معدوم
مجھ سے احسان کسی وقت یہ عصیاں نہ ہوا

فلسفۂ ہستی

جناب بسمل الہ آبادی

(۱)

گویا نہ بلندی میں نہ پستی میں ہوں
آلودۂ غم وہم پرستی میں ہوں
اک نقطۂ موہوم ہوں میں اے بسمل
کہنے کے لئے حلقۂ ہستی میں ہوں

(۲)

بدمست کو بے کار کی مستی کیسی
افکار بلندی میں بھی پستی کیسی
ہم جیتے ہیں مرنے کے لئے اے بسمل
ہستی کی یہ صورت ہے تو ہستی کیسی

(۳)

ہر وقت جو گھیرے رہے پستی مجھ کو
تو خاک بلندی میں ہو پستی مجھ کو
ہونا ہے مجھے نیست کسی دن بسمل
لائی ہے کہاں کھینچ کے ہستی مجھ کو

(باقی)

رپورٹ بزمِ ادب (خواتین)

(از حمیدہ سلطانہ بیگم ادیب فاضل۔ سکریٹری)

۲۹ مارچ کی شام کو بزم ادب خواتین کا پہلا جلسہ "ہارڈنگ لائبریری کے وسیع ہال میں زیر صدارت ڈاکٹر شائستہ اختر بانو سہروردیہ منعقد ہوا۔ جہاں تک تقاریر اور نظموں کا تعلق ہے تقلب [illegible]

(۱) زکیہ ظفر صاحبہ نے اپنی دلچسپ تقریر میں بتایا کہ اسلام میں عورت کا رتبہ کیا ہے۔

(۲) آنسہ خورشید حیدری نے ایک دلکش نظم "عورت سے خطاب" سنائی۔

(۳) مس اختر قریشی بی، اے، بی، ٹی کی تقریر "خواتین اور اردو شاعری" بھی پُر از معلومات اور دلکش چیز تھی۔

(۴) بیگم قدر قریشی نے اپنی نظم "عورت" سنا کر سب کو خوش کیا۔

(۵) آنسہ حمیدہ عارف نے "کچھ عورتوں کے متعلق" گھریلو باتیں دلاویز طریقے سے بیان کیں۔

(۶) آنسہ سحاب قزلباش نے اپنی دلکش و مترنم آواز سے غزل سُنا کر سب کو مسحور اور مسرور کیا۔

(۷) میں نے اپنا مقالہ "اُردو ادب اور خواتین" پڑھا۔ یہ طویل تھا لیکن بہنوں نے بڑے شوق سے سُنا۔

(۸) حاضرین کے اصرار پر سحاب نے اپنی بجتی ہوئی آواز میں دوسری غزل سُنا کر دادِ تحسین حاصل کی۔

(۹) محترمہ صالحہ عابد حسین نے ناسازیٔ طبع کے باعث آنے کا اقرار نہیں کیا تھا لیکن فضل خدا سے انکی طبیعت بحال ہوگئی۔ ذوقِ ادب انکو کھینچ لایا۔ اور انہوں نے اپنا پُراز معلومات و دلچسپ مقالہ "ادب اور خواتین" سُنایا

(۱۰) صدر جلسہ محترمہ شائستہ اختر بانو نے بہت دلچسپ تقریر کی جسکا لب لباب پیش کرنے کا میں فخر حاصل کر رہی ہوں اُنہوں نے فرمایا:۔

"اس قسم کے جلسوں کی ہمیں بہت ضرورت ہے۔ جہاں ہم سب مل کر بیٹھیں اور اسی طرح تبادلۂ خیالات کرسکیں۔ یہ جلسے خواتین کو مل کر بیٹھ جانے کا اچھا موقعہ دیتے ہیں۔ عام طور پر عورتیں گھریلو مصروفیتوں اور سماجی پابندیوں کی بدولت بہت ہی کم آپس میں مل سکتی ہیں۔ موصوفہ نے فرمایا یہ بات مسرت افزا ہے کہ اب زنانہ جلسے اور مشاعرے کئے جاتے ہیں۔ لیکن ابھی یہ صرف رسمی طور پر ہوتے ہیں۔ [illegible] مقصد ہم عورتوں نے ابھی نہیں سمجھا ہے۔ لیکن امید ہے رفتہ رفتہ علم و ادب کا صحیح [illegible] ہم میں پیدا ہو جائیگا۔ ابھی عورتوں میں یہ کمزوری باقی ہے۔ کہ وہ خالص علمی و [illegible] جلسوں میں سامان تفریح کی تلاش کرتی ہیں۔ خالص علمی اور ٹھوس مضامین اگر زنانہ جلسوں [illegible] پڑھے جائیں تو تمام جلسے میں ایک بیزاری سی پھیل جاتی ہے۔ بیچاری پڑھنے والی کی مشکل [illegible] کیونکہ خواتین یہ چاہتی ہیں کہ محض خوش گلو شاعرہ خواتین سے نظمیں یا غزلیں ہی سنتی رہیں لیکن [illegible] میرے ہمارا قصور نہیں دراصل ہندستانی عورت کو گھریلو بندھنوں نے اس بُری طرح جکڑ رکھا ہے [illegible] اس تھوڑی سی فرصت میں صرف تفریح کرنا چاہتی ہے۔ پھر موصوفہ نے فرمایا ہمارے وہ بھائی یقیناً لائق تحسین ہیں۔ جو اپنی علمی و ادبی قوتوں سے سہارا دیکر ہر طرح امداد پہنچا کر اور تکالیف برداشت کر کے ہمیں سوچنے سمجھنے اور کام کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ میں فصیح الدین صاحب سکریٹری ہارڈنگ لائبریری کا تمام خواتین کی جانب سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے ہم عورتوں کے لئے اتنی زحمت برداشت کی اور اس زنانہ جلسہ کا انتظام کیا۔ میں اُن تمام خواتین کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے اپنی پُراز معلومات اور عالمانہ تقاریر سے ہمیں محظوظ کیا۔ شرکت کرنے والی بیگمات جو اپنے سَو کاموں کو پس پشت ڈالکر یہاں تشریف لائیں یقیناً ہمارے شکریے کی مستحق ہیں"۔

شائستہ بانو صاحبہ جب اپنی دلچسپ تقریر ختم کر کے بیٹھ گئیں۔ تو میں نے اپنی اور محترم فصیح الدین صاحب کی جانب سے صدر صاحبہ اور تمام تقاریر کرنے والی خواتین نیز تشریف لانے والی بیگمات کا شکریہ مختصر الفاظ میں پیش کیا۔ جلسے کے ختم ہونے کے بعد صدر صاحبہ اور تمام شاعرہ اور ادیبہ خواتین کو ہارڈنگ لائبریری کی جانب سے ٹی پارٹی دی گئی اور یہ جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

اب آپ وہ نظمیں، مضامین اور مقالے دیکھئے جو اس جلسے میں سُنائے گئے۔

اُردو ادب اور خواتین

از محترمہ حمیدہ سلطانہ بیگم صاحبہ ادیب فاضل

ہماری زندگی کے ہر شعبے میں انتشار اور تذبذب ہے۔ پرانے رسم و رواج پر نئی تہذیب کی ضرب لگ رہی ہے۔ اس دور افراط و تفریط میں مردوں سے زیادہ عورتوں کے لئے مشکل ہے۔ اُن کی ذمہ داری بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

ہندوستان میں بلکہ ایشیا کے ہر ملک میں خاندان کی خوشی کا زیادہ تر انحصار عورت پر ہے۔ لیکن [illegible] قیود اور سماجی بندشوں کی بدولت ہندوستانی عورت کی جمالیاتی حس [illegible] وہ ہو گئی ہے۔ اور ہماری قوم میں علم و ادب کا ذوق رکھنے والی خواتین کی تعداد بہت مختصر ہے۔ لیکن پھر بھی چند ہماری ایسی بہنیں بھی ہیں جن کے علمی و ادبی کارناموں کو دیکھکر [illegible] ہیں اور جن پر ہم فخر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر خواتین کو کھیلنے اور مناسب تعلیم و تربیت دی جائے تو وہ کس قدر ترقی کر سکتی ہیں۔ مسلمان خواتین نے اُردو ادب کو سنوارنے میں کس قدر حصہ لیا۔ اور دورِ حاضرہ کی خواتین اپنی زبان و ادب کے لئے کس قدر کام کر رہی ہیں۔ اِس تھوڑے وقت میں اس کی پوری تفصیل بتانی بہت مشکل ہے۔ ہاں میں کچھ مختصر طور پر اپنی لکھنے والی اُن بہنوں کے متعلق عرض کرونگی جن کی دُنیائے ادب میں دُھوم ہے تاکہ آپ کو بھی معلوم ہو کہ اُردو ادب کو ہماری ان بہنوں نے کس کس طرح سنوارا ہے۔ انکے کاموں کی کسی قدر اہمیت آپ پر واضح ہو جائے گی۔

میں آپ کو ایسی دُنیا میں لے چلونگی جہاں آپ ناول نویس خواتین سے ملیں گی۔ اور مختصر کہانیاں سُنانے والی بہنیں بھی آپ کے سامنے ہونگی۔ ایک جانب شاعرہ خواتین کی دلکش نغمہ سنجیوں سے آپ محظوظ ہونگی۔ تو دوسری جانب معاشرتی، اِصلاحی، تاریخی غرضکہ ہر قسم کے مضامین لکھنے والی خواتین سے بھی آپ کی ملاقات ہوگی۔

یہ موضوع اس قدر وسیع اور بکھرا ہوا ہے کہ اس کا سمیٹ کر لکھنا اور اپنی تمام بہنوں کے کاموں کے متعلق عرض کرنا دراصل بہت مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ اگر سہواً کسی خاتون کا نام رہ جائے تو یقین ہے فراخدلی سے وہ مجھے معاف کردینگی۔

اچھا تو پہلے میں آپ کا تعارف ناول نویس خواتین سے کراتی ہوں۔

آپ اور میں اور سب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ جب تک عورتوں نے قلم ہاتھ میں نہ سنبھالی تھی صرف مولانا عبدالحلیم شررؔ کے ناول ہی ملک بھر میں مقبول تھے اور پڑھنے کے قابل سمجھے جاتے تھے۔ رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" یا مرزا ہادی رسوا کا ناول امراؤ جان ادا بہت اعلیٰ درجے کے ناول تھے۔ لیکن یہ ناول اس قابل نہ تھے کہ کمسن لڑکیوں کے ہاتھ میں بلاتکلف پکڑا دیئے جاتے۔ سوائے ڈپٹی نذیر احمد کی لکھی ہوئی کتابوں مراۃ العروس، بنات النعش وغیرہ وغیرہ کے۔ لیکن ڈپٹی صاحب موصوف کی لکھی ہوئی کتابیں ایک ناصحانہ رنگ رکھتی ہیں۔ اس لئے پڑھنے والے یا پڑھنے والی کے دل میں انکو پڑھتے ہوئے اس کا خیال رہتا ہے کہ یہ قصے کہانی سے زیادہ ایک بزرگ کی نصیحت ہے جسکو ذہن میں محفوظ کر لینا ضروری ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے بعد اُن کے صاحبزادے بشیر احمد صاحب نے بھی دو تین کتابیں لکھیں لیکن انکو زیادہ اہمیت اُردو ادب میں نہیں دی گئی۔

ہاں مولانا راشد الخیری کی لکھی ہوئی کتابوں کو تمام ملک میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ انشاء پردازی کے لحاظ سے اُن کے لکھے ہوئے ناولوں کو اعلےٰ درجہ حاصل ہے۔ زبان و بیان پر مولانا موصوف حیرت انگیز طور پر قادر تھے۔ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے اسکو اپنا لیتے تھے۔ لیکن اُن کی تصانیف میں حزن و الم کی فراوانی اور حسرت و یاس کی مسلسل داستانوں کو دیکھکر دل اُکتا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ تمام عمر حقوق نسواں کے لئے کوشاں رہے اور مردوں کی خودغرضی اور نااہلی کو آشکارا کرتے رہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ جگ بیتی سے آپ بیتی کہیں زیادہ پُرلطف ہوتی ہے۔ اس لئے جب خود عورتوں نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا تو میدان صحافت میں ہر جانب پھول برسا دیئے۔

میں نے بچپن کے اُن ایام میں جب زندگی اور زندگی کے تمام حقائق میری نظر میں یکسر تیرہ تھے اپنی آپا سے محترمہ عباسی بیگم مرحومہ کا لکھا ہوا ناول "زہرہ بیگم" سُنا۔ یہ ناول ان دنوں تہذیب نسواں میں مسلسل چھپ رہا تھا۔ میں فطری طور پر قصے کہانی کی شوقین تھی اس لئے باوجود بے شعوری اور لڑکپن کے اس قصہ کو سُنتی اور متاثر ہوتی تھی۔ یہ ناول بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ گو فنی نقائص اس میں بھی ضرور ہیں۔ لیکن پھر بھی "زہرہ بیگم" کا انجام مصنفہ نے زور قلم سے ایسا دکھایا ہے کہ سنگدل سے سنگدل انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک جاہل ہٹ دھرم ماں کا اپنی تعلیم یافتہ نیک طینت لڑکی کو ایک جاہل، امیر کبیر بوڑھے سے بیاہ دینا، اور پیروں فقیروں پر ان جاہل بیگم کا اعتماد۔ یہ موضوع ایسا ہے جو آج بھی بہت سے مسلمان ہندوستانی گھروں کا اصل نقشہ ہے۔

ہوش سنبھالنے کے بعد سب سے قبل جس خاتون کی تصانیف میری نظر سے گذریں وہ محترمہ نذر سجاد حیدر ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی ناولیں "اختر النسا"، "حرمان نصیب"، "جانباز" کئی کئی مرتبہ چھاپی جا چکی ہیں۔ اور کوئی پڑھی لکھی خاتون ایسی نہ ہوگی جنہوں نے انکے ناولوں کو نہ دیکھا ہو۔ محترمہ موصوفہ ہندوستان کی اُن قابل فخر خواتین میں سے ہیں جن کو قابلیت و ادبیت اور طرز تحریر کے مخصوص انداز کے باعث دُنیائے ادب میں وہ درجہ حاصل ہے۔ جو اکثر

لکھنے والے مردوں کو بھی نصیب نہیں ہے۔ انکے لکھے ہوئے ناولوں نے ہمیں سب سے قبل ایک ایسی تہذیب سے روشناس کرایا جہاں آزادی ہے۔ وسعت خیال ہے۔ تعلیم ہے تربیت ہے۔ مغربی انداز کی رہائش ہے۔ نشست و برخاست رہن سہن پر بہت کچھ مغرب کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کتابوں کی روح خالص مشرقی اور اسلامی ہے۔ محترمہ موصوفہ کے لکھے ہوئے کردار اعلیٰ خاندانوں کے روشن خیال گھرانوں میں آپ کو ہر جگہ نظر آجائیں گے۔

بعض خواتین کا خیال ہے کہ نذر سجاد بہت آزاد خیال ہیں اور اپنے ناولوں اور افسانوں میں وہ معاشرت دکھاتی ہیں جو سخت قابل اعتراض ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ اس حقیقت کو ہمیں تسلیم کرلینا پڑتا ہے کہ محترمہ موصوفہ جو تہذیب ہمیں اپنی تصانیف میں دکھاتی ہیں اس سے بھی بڑھکر اعلےٰ تعلیم یافتہ مسلمان خواتین میں سرایت کر گئی ہے۔

اونچے طبقے کی مسلمان روشن خیال خواتین میں ہمیں علم و ادب سے ذوق رکھنے والی بیگمات کم اور کھیل کود رقص و سرود کی شوقین خواتین بہت زیادہ نظر آتی ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ ہماری ہندوستانی ملکی و قومی تحریکوں میں ہم سے کہیں آگے بڑھ چکی ہیں۔ ان حالات میں پنپنے کی امید فضول ہے۔ "میلہ گھومنی" محترمہ کی تمہید ہے کہ محترمہ نذر سجاد حیدر کے افسانے اور ناول بغیر کسی خاص مقصد کے محض دل بہلانے کی چیز نہیں ہوتے۔ ان سے کچھ مفید نتائج نکل سکتے ہیں۔

"گودڑ کا لال" ایک ضخیم ناول ہے اسکے تین حصے ہیں اور اسکی مصنفہ والدہ افضل علی ہیں۔ اس قصّے کی بنیاد دو بہنوں پر ہے۔ بڑی بہن منہ پھٹ زبان دراز، جاہل اور بدمزاج ہے۔ چھوٹی سگھڑ، تعلیم یافتہ، نیک طینت ہے۔ بڑی نے اپنی جہالت و بدخلقی سے اپنے حلیم الطبع شوہر کو اس قدر تنگ کیا کہ اُس نے دوسری شادی کرلی۔ اس کی برائیوں میں زیادہ تر ہاتھ اسکی ایک بدباطن سہیلی کا تھا جو اسے دل میں جلتی تھی اور بظاہر بڑی غمگسار بنتی تھی۔ مرتے وقت جب اُس نے اسکا اعتراف کیا تو اس بیوقوف عورت کی آنکھیں کھلیں۔ یہاں اس سوکن سے مصالحت کرکے اپنی زندگی سُدھاری۔ چھوٹی نے اپنی ذہانت و نیکدلی کی بدولت اپنی زندگی کو قابل رشک بنالیا۔ ڈاکٹری کی ڈگری لی۔ پھر اس کا رشتہ سلیقے سگھڑاپے کے باعث ایک امیر کبیر سے ہوا۔ اور اُس نے تمام عمر جاہ و حشم سے بسر کی۔ یہ تو ہوئی اصل قصّہ لیکن اس کے ضمن میں بہت سی اور چیزیں بھی آجاتی ہیں۔ ایک بہن بھائی خیر علی ان سگھڑ و پھوہڑ بہنوں کے بڑے بھائی، یہ جاہل بھی ہیں، بدمزاج بھی، رنگین طبیعت بھی اور بزدل بھی۔ جیسا کہ اس قسم کے لوگوں کو ہونا چاہیے۔ ایک اور جاہل نواب زادی ہیں۔ ان دونوں بہنوں کے پھوپی زاد بھائی کی بیوی ساری عمر وہ اپنے غریب لیکن خوددار میاں کو خاطر میں نہ لائیں۔ اور بعد میں پچھتا کر میاں سے اپنے ناروا طرز عمل پر معافی مانگی۔ لاولد تھیں

اس لئے لڑکا گود لیا۔ اس کو بیجا لاڈ پیار میں ایسا خراب کیا کہ اُس نے بڑے ہوکر انکی زندگی اجیرن کردی۔ غرضکہ اس ناول میں ایک قصّے کے ضمن میں بہت سے قصّے ہیں اور ہر قصّے میں ایک اصلاحی مقصد مصنفہ کے پیش نظر ہے۔ لیکن اس ناول کی زبان صاف نہیں ہے۔ یہ زبان جو اس میں استعمال کی گئی ہے دہلی کے کسی امیر غریب گھرانے میں نہیں بولی جاتی۔ جو اسکی چغلی کھاتی ہے کہ مصنفہ کا تعلق دہلی سے نہیں ہے۔ وہ کسی دیہات کی رہنے والی ہیں۔ رسومات بہت سی البتہ وہی ہیں جو اب سے پچاس سال قبل دہلی میں رائج تھیں۔ بحیثیت مجموعی بڑا دلچسپ اور اصلاحی ناول ہے۔

"روشنک بیگم" کی مصنفہ مسز ظ حسن ہیں۔ مصنفہ چونکہ بنگالی ہیں اس لئے زبانی لغزشیں کہیں کہیں اس ناول میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے کردار بھی سب دہلی کے رہنے والے ہیں۔ دہلی کے ایک امیر کبیر گھرانے کی فضا دکھائی گئی ہے۔ جہاں تک طور و طریق کا تعلق ہے بالکل وہی ہیں جو دہلی کے امراکے ہاں رائج ہیں۔ جاہل امیر بیگمات کی ہٹ دھرمی اور نا سمجھی کی اصل تصویر مصنفہ نے حسینی بیگم کے کردار میں پیش کی ہے۔ کافی اچھا ناول ہے۔

"انوری بیگم" بیگم خدیو جنگ کی تصنیف ہے۔ اس ناول میں حیدرآباد دکن کی سچی معاشرت کی تصویر کشی مصنفہ نے کی ہے۔ پُرانے توہمات اور تعصبات اور جدید خیالات کو باتوں باتوں میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ حقوق و تعلیم نسواں کا جہاں ذکر آگیا ہے وہاں ضمناً اپنے خیالات اچھے پیرایے میں ظاہر کئے ہیں۔ شادی بیاہ کا معاملہ ہندوستانی شریف گھرانوں میں بہت ہی ٹیڑھا ہوتا ہے۔ ماں باپ لڑکے لڑکیوں کی مرضی کا خیال کئے بغیر رشتے اپنی خوشی سے کردیتے ہیں اور عزیزداری کے خیال سے بعض اوقات بہت نامناسب رشتے کردیے جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ بہت خراب ہوتا ہے۔ اس ناول میں شادیاں اس طریقے سے کی گئی ہیں کہ ان میں افراط و تفریط دونوں نہ تو عام ہندوستانی رواج کے موافق جیسے جانوروں کے جوڑے ملادیئے جاتے ہیں انگریزوں کی سی آزادی ہے۔ جگہ جگہ ماماؤں کی زبانی ٹھیٹ دکنی زبان کو مصنفہ نے خوب ادا کیا ہے۔

"شوکت آرا" بھی ایک ضخیم ناول ہے جسکے تین حصے ہیں۔ یہ بھی ایک خاتون کی لکھی ہوئی ہے۔ اور یہ خواتین کے لکھے ہوئے ناولوں میں اپنی زبان، کلچر اور روانی کے باعث سب سے ممتاز ہے۔ دیہاتی لوگوں کی زندگی کی صحیح عکاسی اس ناول میں کی گئی ہے۔ ایک دیہاتی شریف خاندان کی معاشرت رسم و رواج خیالات یہ سب باتیں اس طرح لکھی ہیں کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ پھر ہندو مسلمانوں کے میل جول، آپس کے تعلقات اور غمگساریوں کا ذکر کرکے مصنفہ نے اپنی روشن خیالی کا ثبوت

ہے۔ "شوکت آرا" کی ایک خصوصیت اسکی شگفتگی بھی ہے جو اور کسی خاتون کے لکھے ہوئے ناول میں نہیں پائی جاتی۔ شوکت آرا (ہیروئین) کی سہیلی سروری کا کیرکٹر کچھ نرالی نہیں ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک الھڑ اور شوخ امیرزادی ٹھٹول بازی کر رہی ہے۔ عورتوں کے خیالات رسمی قیود اور گھر میں گھٹے رہنے کے باعث قنوطی ہو گئے ہیں۔ ان کے لئے ایسی تصانیف کی ضرورت ہے جو ان کے خشک لبوں پر تبسم کی لہر پیدا کر دیں۔ اور جو اُن کے پژمردہ دلوں کو تازگی بخش سکیں۔ "شوکت آرا" نے اس کمی کو بہت حد تک دور کر دیا ہے۔ شوکت آرا جس قدر حلیم الطبع۔ متین اور خاموش ہے اسی قدر سروری شوخ باتونی بذلہ سنج اور تیز مزاج ہے۔ جگہ جگہ شوکت آرا اور سروری کی دلاویز نوک جھوک ناول کو بڑا دلچسپ بنا دیتی ہے۔ شوکت آرا میں ایک اور چیز بھی ہے۔ وہ ہے ایک بیوقوف نوعمر روانی خیالات رکھنے والی لڑکی ناظمہ بیگم کا قصہ! جو شوکت آرا اور سروری کی ہم مکتب تھی۔ ناظمہ نے اپنی حماقت سے رومانی تخیل میں کھونے کے بعد ایک فریب کار مرد کے دھوکے میں آ کر خود کو کس طرح تباہ کیا۔ یہ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر شوکت آرا کے عالمانہ لیکچروں نے اس ناول کو بڑی امتیازی حیثیت دیدی ہے۔ ہر پڑھی لکھی عورت کے لئے شوکت آرا کا مطالعہ بڑا ضروری ہے۔ میں نے اسکو کئی مرتبہ پڑھا اور ہر مرتبہ نیا لطف حاصل کیا۔

حال میں ایک اور نئی ناول "شمع" ایک دہلوی خاتون ایس، کے صاحبہ کی لکھی ہوئی میری نظر سے گذری۔ اسکی زبان سادہ اور شستہ ہے۔ انداز بیان بھی دلکش ہے لیکن اس ناول کی کوئی انفرادی حیثیت نہیں ہے۔ کوئی چیز اس میں ایسی نہیں ہے جو اسکے کسی پہلو کو بھی اجاگر کرے۔ لیکن چونکہ بہت دنوں بعد ایک خاتون کی لکھی ہوئی ناول نظر آئی ہے اس لئے قابل قدر ہے۔ ہماری بہنیں ازدواجی زندگی اور گھریلو بندھنوں میں جکڑے جانے کے بعد بھی کوئی ادبی کام کریں تو خواہ وہ کتنا ہی ہلکا ہو بہر حال ہے قابل قدر! مردوں کیلئے علمی، ادبی ادارے ہر جگہ کھلے ہوئے ہیں۔ تبادلہ خیالات کے انکو بہت سے مواقع نصیب ہیں۔ آمد و رفت کیلئے ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ نہ وہ کسی کے محکوم ہیں۔ لیکن غریب عورتوں کو ہندوستان میں یہ آسانیاں میسر نہیں ہیں۔ ان میں سے ۷۵ فی صدی گھر کی چاردیواری میں بند ہیں۔ اور ۲۵ فی صدی جو پردہ نہیں کرتیں انکی گھریلو ذمہ داریاں توجہ کی محتاج ہیں۔ اور مردوں کی طرح مطلق العنان تو وہ بھی نہیں ہیں۔ ان حالات میں ہماری جو چند باحوصلہ بہنیں ادبی و قومی خدمات کر رہی ہیں یقیناً قابل قدر ہیں۔ میں نے ابھی ابھی مشہور ناول نویس خواتین کے متعلق آپ کو بتایا ہے۔ اب آپ ان سب خواتین کے لکھے ہوئے ناولوں کو دیکھنے کے بعد یہ محسوس کر سکتی ہیں کہ یہ تو وہی قصے ہیں جو ہمارے گھروں میں آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ نہ ان ناولوں میں عشق و محبت کی بے سروپا داستانیں ہیں نہ دور از حقیقت حسن کے قصے۔ نہ کہیں ہیرو زہر کھاتا ہے نہ کوئی ہیروئین دیوانی ہوتی ہے۔ یہی مسلمان شریف گھرانوں کی گھریلو فضا ہے۔ یہی مشرقی شرمیلی لجیلی لڑکیاں ہیں جو ہر جانب چلتی پھرتی نظر آتی ہیں جن کی محبت پر شرم و حیا کے لاکھ پردے پڑے ہوئے ہیں۔ شریف خاندانوں کے مہذب تعلیم یافتہ اور نیک طبیعت لڑکے ہیں۔ جو اپنی پسندیدہ لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ رسم و رواج میں جکڑی ہوئی بڑی بوڑھیاں ہیں۔ نئی روشنی کی دلدادہ اپنے جھگڑنے والی نوجوان عورتیں ہیں۔ جاہل، فضول خرچ پیروں فقیروں پر یقین رکھنے والی بیگمات ہیں۔ ان کی منہ چڑھی مامائیں اور مغلانیاں ہیں۔ سوتیلی ماں کے مظالم ہیں کسی اوباش انسان کے فرضی عشق کی داستان ہے۔ سگھڑ، پھوہڑ لڑکیوں کا موازنہ ہے۔ اُن کے دکھ سکھ کی کہانی ہے۔

غرضکہ ان سب ناولوں میں جو کچھ ہے حقیقت ہے جھوٹ کے قلابے نہیں ملائے گئے نہ ان کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ محض پند و نصائح کی خاطر لکھے گئے ہیں۔ یا لکھنے والی کے پیش نظر کوئی [illegible] روزمرہ کی زندگی کی کہانی بیان کی گئی ہے جیسی کہ وہ ہے اور اس کہانی کے ضمن میں سب کچھ آ جاتا ہے۔

ہر ایک ناول کے پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک مسلمان خاندان کا قصہ ہے۔ زندگی کے ساتھ کہانی کا یہ ربط ہر عورت کے لکھے ہوئے ناول میں آپ کو ملے گا۔ مانوس باتیں ہونگی۔ جانے پہچانے لوگ ہونگے۔ وہی گھریلو فضا ہوگی۔ جسکے ہم آپ عادی ہیں۔ اور اس میں جو کچھ ہوگا وہ وہ ہوگا جو حقیقی طور پر ہونا چاہیئے۔ مردوں نے تاریخی ناول لکھے یا کسی اصلاحی مقصد کیلئے کتابیں ناولوں کی صورت میں لکھیں یا پھر فرضی بوالہوس عشق کی داستانیں آپ کو سنائیں۔ چند اچھے ناول جو مردوں کے لکھے ہوئے اب نظر آتے ہیں بہ چند سال پیشتر کے ہیں۔ اس سے بہت پہلے خواتین کے کئی اچھے ناول نکل چکے تھے۔

کتنا اچھا خیال ہے مشہور انگریز فلسفی مل کا! "مرد جب کوئی نئی چیز باشوکت الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ کسی عقلمند عورت کا تخیل ہوتا ہے۔"

(افسانہ نگار خواتین)

افسانہ کی عمر اردو میں زیادہ نہیں ہے۔ جنگ عظیم کے بعد اس کی ابتدا ہوئی ہے۔ کثرت کار کے باعث لوگوں کو اتنی فرصت نہ تھی کہ امیر حمزا کی داستان یا فسانۂ آزاد جیسی ضخیم کتابیں پڑھ سکتے۔ دماغوں پر انگلش ادب کا اثر بھی کافی ہو چکا تھا۔ مردوں میں ان دنوں منشی پریم چند، سید سجاد حیدر یلدرم۔ سلطان حیدر جوش۔ مولانا نیاز اچھے اچھے افسانے لکھ رہے تھے۔ اردو افسانہ نگاری کے پھولنے پھلنے کا سہرا ان

بزرگوں کے سر ہے۔ لیکن خواتین بھی افسانہ نگاری میں اُن کے دوش بدوش چلتی رہیں
افسانے کی توسیع میں عورت برابر کی حصّے دار ہے۔ اگر کوئی نقّاد اُردو ادب کا جائزہ لینے
بیٹھے تو اُس کے سامنے آج ایک بڑا انبار اُردو افسانوں کا ہوگا۔ اس میں نصف کے قریب
لکھے ہوئے افسانے خواتین کے ہونگے۔ یہ لکھنے والیاں گو مختلف سطح پر ہیں۔ لیکن ان
کے موضوعات میں ایک طرح کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان کی ہمدردیاں بے معنی اور کھوکھلی
نہیں ہیں۔ بعض کے یہاں تبدیلی اور انقلاب کی شدید خواہش صرف مبہم حزن کی شکل
میں پرورش پارہی ہے۔ اور بعض کے ہاں یہ خواہش باغیانہ رنگ اختیار کرچکی ہے
کچھ لکھنے والیوں کے زیرِ نظر اصلاحی مقصد ہے۔ کچھ محض رومانی دُنیا کی سیر ہی کراتی
ہیں۔ بعض ادیبانہ فن کاریوں کے پورے ساز و سامان کے ساتھ جدید اسالیب میں افسانے
آپ کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ اور بعض سیدھی سادی زبان میں۔ لیکن ان سب کے
افسانوں میں اکثر موجودہ دور کے عام رجحانات کا تجزیہ ضرور ہوتا ہے۔ کہانی لکھنے
کا فن دیکھنے میں آسان ہے لیکن اسکی تکمیل معمولی دماغ نہیں کرسکتے۔ آپ کے سامنے
افسانے آجاتے ہیں اور آپ کچھ دیر کے لئے افسانوں کی بھول بھلیّوں کی سیر کرکے
لطف اندوز ہوجاتی ہیں۔ لیکن آپ کو اُس کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ کہ اس کے لکھنے
والے یا لکھنے والی کو کس قدر دماغی کاوش کرنی پڑتی اور اس افسانے کی تیاری میں
اس نے اپنا کتنا قیمتی وقت کھو دیا۔

افسانہ نگار کے ہر طرف خوفناک گڑھے ہیں۔ اُونچی دیواریں ہیں۔ تاریکیاں
ہیں۔ بدلیاں ہیں۔ ایک اچھے افسانہ نگار کو ہر جانب دیکھ دیکھ کر قدم اُٹھانا پڑتا ہے
ذرا سی غفلت اسکو کسی نہ کسی بلا کا شکار بنادینے کیلئے کافی ہوتی ہے۔ اسکے یہاں طرح
طرح کی سماجی بیماریوں کا ذکر ہوگا تو اس کے ساتھ وہ ایسا تریاق بھی اپنے افسانے میں
رکھ دیگا جو اُس پھیلتے ہوئے زہر کا علاج ہوسکتا ہے۔

ویسے تو ہر دور کا ادب شعوری یا نیم شعوری طور پر اس زمانے کی تشریح
وتنقید کرتا ہے۔ لیکن آج فن کار کا کام بہت نازک ہوچکا ہے۔ کہانی کے چھوٹے
سے خاکے میں زندگی کا اضطراب اور زمانے کا پورا ہیجان بھر دینا پڑتا ہے۔ اور پھر
سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ کہانی سے کہانی پن نہ جانے پائے۔

اس میں کتنی خواتین کامیاب ہیں۔ یہ حساب کچھ زیادہ حوصلہ افزا تو نہ ہوگا تاہم
اُردو افسانہ نویسی نے جیسی اور جتنی اچھی لکھنے والیاں اس مختصر زمانے میں پیدا کیں اسکی
مثال اُردو زبان اور ادب کی تاریخ میں کسی دوسرے صنفِ ادب کے بارے میں نہیں ملتی
بگڑی ہوئی قوموں کو بنانے اور گرے ہوئے افراد کو اُبھارنے میں جو زبردست
اثر کامیاب افسانوں کا ہوسکتا ہے شاید ہی کسی اور چیز کا ہو۔

جس طرح اس سے کوئی ذی عقل انکار نہیں کرسکتا کہ قوم کی ترقی اس وقت
تک ممکن نہیں جب تک عورت اور مرد دونوں برابر کے شریک کار نہ ہوں۔ اسی طرح یہ
بھی حقیقت ہے کہ ہمارے ادب کو سب سے زیادہ ضرورت اس وقت معاشرتی افسانوں
کی ہے۔ اگر ہماری معاشرت درست ہوگئی اور ہمارے گھر کی زندگی سُدھر گئی اور ہماری
بہنیں اور بھائی اپنی اپنی کمزوریوں سے واقف ہوکر اور فرائض سے باخبر ہوکر صحیح طریقے
پر زندگی بسر کرنے لگیں تو ہماری ترقی کو یقیناً کوئی چیز نہیں روک سکتی۔

افسانہ نگار خواتین کی صف میں بھی اوّل نمبر محترمہ نذر سجاد حیدر کا ہے۔ جو
تقریباً پچیس سال سے مسلسل اخلاقی و معاشرتی، اصلاحی مجسم کے افسانے لکھکر برابر زبان
و ادب کی خدمت کررہی ہیں۔ نذر سجاد حیدر صاحبہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ ملک
اُن معدود اہلِ قلم خواتین میں سے ہیں جن پر ہم کو ناز ہے۔ جن کی بدولت ہم مردوں کے
سامنے فخر سے سر بلند کرسکتے ہیں۔ موصوفہ کے افسانے اکثر طویل لیکن دلچسپ ہوتے ہیں
ان کے کسی افسانے میں کوئی واقعہ نہ خلافِ قیاس و عقل ہے۔ نہ غیر فطری ہے گو ہر
افسانہ فرضی ہے لیکن پڑھنے کے بعد قیاس کہتا ہے کہ کہیں نہ کہیں ضرور ایسا ہوا ہوگا
کیونکہ ہر افسانے کا پلاٹ واقعیت پر مبنی ہے۔ تصنّع یا بناوٹ ناممکن الوقوع یا غیر
ممکن العمل باتیں جو اُس دور کے مردوں کے لکھے ہوئے اکثر افسانوں میں پائی جاتی ہیں
نذر سجاد کے افسانے ان سے بالکل پاک ہیں۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی
یہ ہے کہ جس حیثیت، اور جس عمر اور جن خیالات کا کیریکٹر ہے ہو بہو اسی قسم کے حرکات
اور گفتگو ہے۔ وہ اپنے ہیرو یا ہیروئین کے متعلق جو کچھ کہتی ہیں اسکے حرکات یا معاملات
سے دلیل ہی ثابت کردیتی ہیں۔ اُن کے افسانوں کی فضا ہمیشہ روشن ہوتی ہے۔ ان
افسانوں کے کردار اکثر آزاد خیال تعلیم یافتہ اور معزز گھرانوں کے افراد ہوتے ہیں مشرقی
و مغربی خوبیوں کا ایک دلکش سنگم ہیں ان کے لکھے ہوئے ہر افسانے میں نظر آتا ہے۔ اپنی
صناعانہ طرز نگارش کی بدولت آج بھی اُن کو دنیائے ادب میں وہی جگہ حاصل ہے جو
اب سے پندرہ سال قبل انہوں نے اپنے لئے بنائی تھی۔

فاطمہ بیگم منشی فاضل، منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار کی بڑی صاحبزادی
بھی افسانہ نگار خواتین میں مخصوص درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے متعدد افسانے مختلف اخبار و
رسائل میں شائع ہوکر خراجِ تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ وہ ہمیشہ کسی خاص اصلاحی مقصد کے
زیرِ نظر افسانہ لکھتی ہیں۔ اس لئے اُن کے لکھے ہوئے افسانے سب اصلاحی و معاشرتی
ہیں۔ طرزِ بیان دلکش ہے۔ ادائے مطالب پر ان کو قدرت حاصل ہے۔ زبان سادہ
اور شیریں ہے۔

خجستہ اختر بانو سہروردیہ واجب التعظیم اور ادب نواز سہروردی خاندان کی

رضیہ ختر تھیں۔ ان کے لکھے ہوئے افسانے افسوس میں نے نہیں پڑھے۔ کیونکہ میرے ہوش سنبھالنے سے قبل ہی موصوفہ کا انتقال ہو گیا لیکن ایک انگریزی ناول کا کیا ہوا ترجمہ "آئینہ عبرت" میری نظر سے گذرا ہے۔ یہ مرحومہ موصوفہ کی ادبی قابلیت اور علمیت کا ایک عکس ہے۔

محترمہ صغریٰ ہمایوں مرزا۔ ایم۔ آر۔ اے۔ ایس بھی مشہور لکھنے والی خواتین میں سے ہیں۔ اصلاحی و معاشرتی، اخلاقی ہر قسم کے مضامین و افسانے لکھتی ہیں۔ "سرگذشت ہاجرہ" "موہنی" "تحفۂ نسواں" یہ ان کے طویل افسانے ہیں۔ جو کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے بھی تمام افسانے اصلاحی اور معاشرتی ہوتے ہیں لیکن ان کا طرز بیان کچھ الجھا ہوا سا ہے۔ اور بیان بھی کچھ غیر مربوط سا ہوتا ہے۔

جمیلہ بیگم صاحبہ "مصنفہ فیروزہ" کا شمار اچھی لکھنے والیوں میں کیا جاتا ہے۔ افسانوں کے ساتھ وہ اور موضوعوں پر بھی مضامین لکھتی ہیں۔ ان کا انداز بیان عام فہم اور تحریر میں پختگی اور روانی ہے۔ اپنی بہنوں کی ترقی اور بہتری کا ان کو بہت خیال ہے ان کے افسانے دلکش اور موثر ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی جدید اسلوب افسانہ نگاری میں انہوں نے پیدا نہیں کیا۔

اب میں ایک ایسی افسانہ نگار خاتون کا ذکر کروں گی جو اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن جن کے لکھے ہوئے افسانے آج بھی بہنیں شوق سے پڑھتی ہیں۔ اور اس جوانمرگ کو یاد کر کے ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ یہ ہم سے بہت جلد بچھڑ جانے والی بہن مصنفہ "گلستان خاتون" "پیکر وفا" اور "بچھڑی بہنیں" خاتون اکرم ہیں۔ خاتون اکرم مرحومہ کو افسانے لکھنے کا خداداد سلیقہ تھا۔ بالکل نوعمری سے وہ افسانے لکھتی تھیں۔ شادی کے بعد علامہ راشد الخیری جیسے خسر کے قرب کی بدولت ان کا یہ جوہر اور بھی چمک اٹھا۔

ان کے لکھے ہوئے تمام افسانے اصلاحی اور معاشرتی ہیں۔ خاتون مرحومہ نے اپنے افسانوں میں وہی باتیں پیش کی ہیں جو ہندوستانی گھروں میں اکثر پیش آتی ہیں۔

ایک کامیاب افسانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ پلاٹ دلچسپ ہو اور مرحومہ کے ہر افسانے میں یہ خوبی موجود ہے تحریر میں غضب کی روانی ہے۔ ان کا اسلوب بیان دلآویزی اور دلکشی کے ساتھ ساتھ اثر کی بے بہا دولت سے مالامال ہے۔ ان کے دل میں اس کمسنی میں اپنی بہنوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان کی آزادی اور ترقی کا زبردست خیال تھا۔ اور خواتین کے غصب شدہ حقوق واپس ملنے کی وہ زبردست حامی تھیں۔ آپکے اکثر افسانے ایسے ہیں جن میں انہوں نے ہندوستانی عورت کی بیکسی بے حسی پر خون کے آنسو بہائے ہیں اور مردوں سے درد بھرے الفاظ میں عورتوں کے ساتھ شرافت اور انسانیت سے پیش آنے کی التجا کی ہے۔

ایس۔ آر۔ کرانیہ بھی اچھا خاصہ لکھ لیتی ہیں۔ لیکن کوئی مخصوص بات ان کے افسانوں میں نہیں پائی جاتی۔ ان کے افسانوں کی زبان سادی اور طرز بیان دلنشین ہے۔ اکثر اصلاحی و معاشرتی افسانے لکھتی ہیں۔

جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی ایم۔ اے حیدرآباد دکن مصنفہ "بربط نا ہید" مخصوص طرز نگارش کی مالکہ ہیں۔ ان کے طرز بیان کی بے ساختگی شگفتگی، دلکشی کے اعتبار سے ادبی حلقوں میں پسندیدہ نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ ان کے خیالات فلسفیانہ اور شاعرانہ ہیں۔ ادائے مطالب میں ان کو کمال حاصل ہے ان کے افسانوں کی فضا رومانی اور شاعرانہ ہوتی ہے۔ اپنے دلکش طرز تحریر کے باعث ان کو لکھنے والی خواتین میں ممتاز درجہ حاصل ہے۔

شفیق بانو شفق افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعرہ بھی۔ ان کے اکثر افسانے اخبار و زنانہ رسائل میں نظر آ جاتے ہیں۔ ایک افسانوں کا مجموعہ "سہارا" چھپ بھی چکا ہے۔

لیکن ہماری ان بہن نے سچ پوچھئے تو شاعری یا افسانہ نگاری کسی صنف ادب میں بھی کمال کو حاصل نہیں کیا۔ ان کے لکھے ہوئے افسانے زیادہ تر تخیلی اور اس دنیا سے کچھ الگ سے ہوتے ہیں۔ اور خواتین کے لکھے ہوئے افسانوں کی طرح ان کے افسانوں میں کشتی یا زندگی سے کہانی کا ربط کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کی عقل پر ہمیشہ جذبات کا غلبہ رہتا ہے اسلئے انکے افسانے ہمارے لئے تھوڑی دیر دلچسپی کا سامان تو بن سکتے ہیں لیکن اس سے ہمارا دل متاثر نہیں ہو سکتا۔

محمودہ رضویہ مدیرہ رسالہ ہندوستانی کراچی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ لالہ زار ابھی طبع ہوا ہے۔ ان کے ہر افسانے میں دلی سوز اور اعلیٰ اخلاقی معیار نہیں ملتا ہے۔ زبان دلکش اور لطیف ہے۔ سوز و ساز رضویہ صاحبہ کے ادبی و اخلاقی ہر قسم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ زبان کی لطافت ان مضامین میں بھی وہی ہے جو ان کے افسانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ رنگینی وہاں بھی ہے اور یہاں بھی ہے۔ محمودہ رضویہ کا شمار ایک دن ملک کی ممتاز اہل قلم خواتین میں ہو گا۔

شیریں کا نام لکھنے والیوں کی صف میں کچھ عرصہ سے ہی داخل ہوا ہے۔ لیکن اس تھوڑے عرصہ میں ان کے دلکش افسانوں نے دل میں جگہ سی لے لی ہے۔ ان کے لکھے ہوئے افسانے ہر اچھے رسالے میں نظر آتے ہیں۔ وہ زیادہ تر رومانی افسانے لکھتی ہیں۔ شیریں کے ہر افسانے کے پردے میں محبت کے جلتے ہوئے آنسو اور دبی ہوئی آہیں مضمر ہوتی ہیں جنکی غم آفریں گرمی سے قلب موم کی طرح متاثر ہونے لگتا ہے۔ ہر افسانہ آنکھوں کے پردوں میں اور دل کے گوشے گوشے میں دکھ اور غم کا ایسا نقش چھوڑ جاتا ہے جو کافی دنوں تک دور نہیں ہو سکتا اکثر افسانے اپنے انجام میں سماج کیلئے ایک دعوت غور و فکر رکھتے ہیں۔ یقین ہے شیریں اپنی شیریں بیانی کے باعث ایک دن خسرو اقلیم ادب کی ملکہ بن جائینگی۔

مسز عبدالقادر عموماً پُر اسرار اور ہیبت ناک افسانے لکھتی ہیں۔ خواتین میں اس قسم کے افسانے لکھنے والی یہ پہلی خاتون ہیں۔ قدیم کھنڈروں، ہری بھری وادیوں، کہساروں، مرغزاروں وغیرہ کے ماحول کو پُر اسرار اور دہشت آفریں بنانے میں ان کو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے۔ منظر نگاری یہ اس سلیقے سے کرتی ہیں کہ ان کا افسانہ پڑھ کر بے اختیار افسانے کے پس منظر کو بچشم خود دیکھنے کے لئے دل مضطرب ہو جاتا ہے۔ مسز عبدالقادر کے افسانوں کی زبان دلکش اور صاف و رواں ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "صدائے جرس" اور "لاشوں کا شہر" دونوں طبع ہو کر ملک بھر میں مقبول ہوئے ہیں۔ فن افسانہ نگاری میں موصوفہ نے اپنا انفرادی رنگ قائم کیا ہے۔ ان کی یہ فنکارانہ کوشش لائق تحسین اور قابل فخر ہے۔

آیئے اب میں آپ کو ان چند قابل قدر خواتین سے ملاؤں جن کے نام آسمان صحافت پر درخشاں ستاروں کی مانند جگمگا رہے ہیں۔ اور جن کے علم و فضل کی دھاک ملک بھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔

حجاب امتیاز علی ان خوش نصیب خواتین میں سے ہیں جن کو ہمیشہ علمی و ادبی ماحول ملا۔ وہ محترمہ عباسی بیگم مرحومہ مصنفہ "زہرا بیگم" جیسی قابل ماں کی بیٹی ہیں ذوقِ ادب ماں سے ترکے میں پایا ہے۔ اور ایک مشہور ادیب کی بیوی ہیں۔ اس فضا میں جس قدر ان کا ادبی تخیل پھولے پھلے بجا ہے۔

حجاب امتیاز علی سے کیا ہم ان کے افسانوں کے مخصوص کرداروں ڈاکٹر گار۔ بوڑھی زوناش صندلی جسم والی افسانہ نگار روحی اور ڈریوک جسوتی سے بھی اس قدر واقف ہو گئے ہیں۔ کہ ہمیں محسوس ہوتا ہے گویا وہ اس دنیا کے چلتے پھرتے کردار ہیں۔

نغمۂ موت، ادب زریں، میری ناتمام محبت، صنوبر کے سائے، ظالم محبت، ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ حجاب امتیاز کے لئے یہ بہا طرۂ امتیاز ہے کہ ابھی اُن کے شباب پر پیری نے سایہ نہیں ڈالا اور وہ اتنی کتابوں کی مصنفہ اور اپنے مخصوص طرز نگارش کے باعث ملک کی محبوب افسانہ نگار خاتون ہیں۔ تحفے اور دوسرے شگفتہ افسانوں پر پنجاب یونیورسٹی نے ان کو ادبیات کا اوّل انعام دیا ہے۔ حجاب کا طرز تحریر تمام لکھنے والوں اور لکھنے والیوں سے الگ اور بے حد دلکش ہے۔ اس قدر حسین! کہ بعض اوقات انکی تحریر پر بجائے نثر کے نظم کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ حجاب کے افسانوں اور ناولوں کی دنیا ہماری آپ کی دنیا سے بالکل الگ ہے۔ وہاں قمریاں بولتی ہیں۔ صنوبر کے سائے ہوتے ہیں۔ ہوائیں سیٹیاں بجاتی ہوئی چلتی ہیں۔ عربی دریچے ہوتے ہیں۔ فرانسیسی کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان میں بیٹھی ہوئی روحی اپنی ناول کے باب لکھتی رہتی ہے۔ یا پھر کسی رومانی تخیل میں کھوئی ہوئی ہوتی ہے۔ نیلے سمندر کے کنارے مادام زبیدہ کا عالی شان محل۔ حبشی غلام، نو بکثرت مودب خادم اور بے شمار باتمیز کنیزیں جو سراسر کچھ عربی تمدن، کچھ مصری انداز۔ الف لیلوی ماحول غرضکہ ایک انوکھی دنیا کی سیر حجاب کے ہر افسانے میں ہم کرتے ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں کا انجام افسوس ناک ہوتا ہے۔ جیسا کہ مشرق میں حقیقتاً ہوا کرتا ہے۔ رنگین و دلآویزی لطافت حجاب کی تحریر کی خصوصیت خاص ہے۔

وہ اُردو ادب میں اپنی انفرادی حیثیت قائم کئے ہوئے ہیں انکا ساحر کارانہ انداز نگارش کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ حجاب کے افسانے تھکے ہوئے دماغوں اور پژمردہ طبائع کے لئے اکسیر کا کام کرتے ہیں۔ عشق و محبت اُن کے ہر افسانے کی جان ہے۔

جب ہم ان افسانوں کے ذریعے دنیا سے دُور بہت دُور حُسن و محبت کی رنگین وادیوں میں پہنچ جاتے ہیں تو ہماری رُوح کے خوابیدہ عناصر انگڑائیاں لیکر بیدار ہونے لگتے ہیں۔ دماغ ایک کیفیت اہتزاز محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور اس شوخ مہکی ہوئی فضا میں پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صفحۂ قرطاس پھولوں کی سیج بن گیا ہے۔ اور نگاہیں اس سے صرف الفاظ نہیں بلکہ رنگا رنگ کے پھول چنتی چلی جا رہی ہیں۔

غرضکہ حجاب ایک رنگین مزاج ساحرہ ہے جو اس رنگین سحر میں ہمیں اُلجھا کر ہماری اُفتگی کا تماشہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے اور زیادہ دیوانہ بنانے کے لئے پھر قلم و کاغذ سے کھیلنے لگتی ہے۔ لیکن اب ہمیں ایسے افسانوی ادب کی ضرورت ہے جو زندگی سے ربط رکھتا ہو۔ حجاب اپنی جگہ خوب ہیں۔ مگر اب حُسن و عشق کی داستانیں دُہرانے کا زمانہ نہیں رہا۔ آج دُنیا اس تیزی سے بدل رہی ہے کہ اس تبدیلی پر ہر ذی عقل حیران ہے۔ ترقی پسند ادب کی پیدائش جنگ عظیم کے بعد ہوئی۔ یہ ترقی پسند ادب کیا چیز ہے۔ آیئے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ ملک میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور غریبوں کی افراط اس ادب کی بنیاد ہے ہر ادیب و شاعر یقیناً متفکر ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ ہو تو وہ ادیب و شاعر کہلانے کا مستحق نہیں محض نقال ہے۔

ملک کے چند تعلیم یافتہ ذہین و ذکی الحس نوجوانوں نے جب قوم کی یہ تباہ کاریاں دیکھیں۔ سرمایہ داری کو غربت پر ظلم کرتے دیکھا تو یہ عشق و محبت کا رونا چھوڑ کر ایسے افسانے لکھنے لگے جو غریبوں کی زندگی مظلومی بیکسی کا آئینہ بن گئے۔

یہ صورت حال اس دور کی ہے جس سے ہم اور آپ گذر رہے ہیں گو ترقی پسند نوجوان نسل کی گہری اور ہموار نگاہ نہیں ہے۔ لیکن ان کی رُوح میں جوش ہے ولولہ ہے۔ اور نت نئے مسائل ان کے سامنے ہیں۔ ان کی زندگی کا چکر تو ابھی شروع ہوا ہے۔ اس لئے اُن کے افکار میں حرکت اور تنوع ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بلندی اور جوش کا جذبہ بھی ہے۔ وہ ایک چیز کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ انکے ذہن

میں پختگی نہیں۔ مگر ان میں بلا کی تیزی ہے۔ جو انسانوں کے راز معلوم کرنے کے لئے بے چین رہتی ہے۔ یہ لوگ ناپ تول کر بات کرنا نہیں جانتے۔ جو کچھ سوچتے ہیں کہہ ڈالتے ہیں۔ افسانے کو انہوں نے زندگی کے بالکل قریب کر دیا ہے۔ غریبوں کی زندگی۔ اُن کے دکھ۔ اُن کی تکالیف، سرمایہ دارانہ نظام کی ابتری غرضکہ ترقی پسند ادب میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو حقیقی طور پر اس دنیا میں ہے۔

گو ترقی پسند ادب کی رجعت پسند لوگ ابھی تک مخالفت کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بے وقت کی راگنی اب چل نہیں سکتی۔ جب تک رزق میسر نہ ہو عشق کہاں اور کس سے کیا جائے۔ مثل مشہور ہے "بے زر عشق ٹیں ٹیں ہے"۔ دنیا روز بروز آگے بڑھ رہی ہے۔ پرانی زندگی کا ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ بوڑھے لوگ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ نئی نسل اُس منزل پر رہے جس پر وہ ابھی تک گامزن تھے۔ ظاہر ہے کہ اب جو کام کرنا ہے نوجوانوں کو کرنا ہے۔ ہر زمانے کا ادب اُس نسل کا ساتھ دیتا ہے جب دربار نہ رہے تو داستان گو کہاں سے آئیں۔ اور طلسم ہوشربا کی داستان کس کو سنائیں۔ انگریز شاعر ٹینی سن کا یہ قول ضرب المثل ہو گیا ہے۔

"پرانا نظام بدل جاتا ہے اور اپنی جگہ نئے نظام کو حوالے کر دیتا ہے۔"

خدا اپنی مشیت کی تکمیل مختلف طریقوں سے کرتا ہے تاکہ کہیں یکساں رسم و رواج دنیا کو بگاڑ نہ دیں۔ ادب کو زندگی سے تعلق ہے۔ اور وہ بھی زندگی کی ہی ایک حرکت ہے۔ اتنا تو وہ لوگ بھی مان لیں گے جو ترقی پسند کا لفظ سنتے ہی بھڑک جاتے ہیں۔ اور جن کے خیال میں محض اسلاف میں اچھائیاں تھیں۔ اور انہیں کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ جو ادب کا مقصد محض دماغی تفریح اور ذہنی عیاشی سمجھتے ہیں کہ اب دیو، جن، پری کے قصے سنانے بیکار ہیں۔ چبائے ہوئے نوالوں کو کون بار بار چبائے۔ خواب آلود زندگی کا ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ترقی پسندوں کی صف میں ہم کو اچھے اچھے افسانے نگار نظر آتے ہیں۔ ان میں ہماری چند بہنیں بھی شامل ہیں جنہوں نے اپنی جودتِ طبع سے مردوں کو بھی حیران کر دیا ہے۔

ڈاکٹر رشید جہاں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی ایک سرگرم رکن ہیں۔ ان کے افسانوں میں موجودہ سوسائٹی کے عیوب اور انسانی فطرت کی کمزوریاں بے نقاب نظر آتی ہیں۔ سماج کی دُکھتی ہوئی رگ کو اپنے قلم کے نشتر سے چھیڑ دینا رشید جہاں کا فن کارانہ کمال ہے۔ تحریر میں بلا کی روانی ہے۔ ہلکے پھلکے طنزیہ جملے ان کی طرزِ تحریر کی خصوصیت خاص ہے۔ ریاکار مولویوں اور بنے ہوئے پیروں اور خود غرض نا اہل مردوں کے مکر و فریب اور جبر کو نمایاں کرنے میں ان کو کمال حاصل ہے۔ ان کے افسانے اور ترقی پسند ادیبوں کی طرح زیادہ عریاں بھی نہیں ہوتے "عورت" ان کی مشہور تصنیف ہے۔

عصمت چغتائی بی۔ اے، بی۔ ٹی ہندوستان کی ان افسانہ نگار خواتین میں سے ہیں جن پر اُردو ادب کو ہمیشہ فخر و ناز رہے گا۔ فطرت انسانی کی کمزوریوں کی عکاسی کرنے میں ان کو ید طولےٰ حاصل ہے۔ اس دُنیا کے چلتے پھرتے کرداروں کے نفسیات کا تجزیہ کرنے میں جس قدر ان کو سلیقہ ہے شاید ہی ہندوستان کے کسی اچھے سے اچھے افسانہ نگار کو حاصل ہو۔ عصمت کی قلم کی شوخیوں کے ہم اور آپ شاکی ضرور ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب خیالات کا طوفان موج زن ہوتا ہے تو بُرے بھلے کی تمیز نہیں رہتی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمیشہ بات پتے کی عصمت کہتی ہیں کہیں ہم لوگ اس لئے تو برہم نہیں ہوتے کہ وہ ہمارے ان رازوں کو ایک دم بے نقاب کر دیتی ہیں جن کا پردہ اُٹھنا ہمیں کسی طرح بھی منظور نہیں ہے۔ مثل مشہور ہے "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے"۔ اب عورتوں کی نفسیات پر ایک ان کی ہم جنس نے قلم اُٹھایا ہے۔ خدا ہی خیر کرے۔ عصمت کی رسائی وہاں ہے۔ جہاں عاقل و عالم و فاضل مرد لاکھ سر پٹکتے اور پہنچ نہ ہوتی۔

فن افسانہ نگاری میں اُنہوں نے جو جگہ حاصل کی ہے وہاں وہ تنہا کھڑی ہیں کوئی ان کا مد مقابل نہیں ہے۔ ان کے افسانے عورت کے دل کی طرح پُر پیچ اور بھول بھلیاں سے ہوتے ہیں۔ ان کے قوس و قزحی تخیل کو متلون مزاجی کو سحر انگیز شائستگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بیان نہیں کیا جا سکتا۔ عورت کی زندگی کی مکمل تصویر عصمت کے افسانوں میں ہم کو نظر آتی ہے۔ یہ تصویر خوبصورت بھی ہے، بدصورت بھی۔ اس میں آنسو بھی ہیں قہقہے بھی۔ گہرائی بھی ہے اور چھچھورا پن بھی۔ نفرت بھی ہے اور محبت بھی۔ شوخ و چنچل الھڑ لڑکیاں خالہ زاد، ماموں زاد، چچا زاد بھائیوں سے انکی محبتیں۔ بناؤ بگاڑ۔ اکثر عصمت ایک اوسط درجے کے مسلمان گھرانے کا نقشہ بمع متعلقات کے اپنے افسانوں میں آپ کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ موجودہ زمانے کی اعلیٰ سوسائٹی کی امیر ماں باپوں کی لاڈلی فیشن ایبل اور کالج میں تعلیم پانے والی کھلنڈری لڑکیوں کے خیالات کا تجزیہ عصمت سے بہتر کوئی نہ کر سکا۔ دیکھئے ان لڑکیوں کا تعارف عصمت کیسے اچھے الفاظ میں کراتی ہیں۔ "آپ نے چند موم کی پتلیوں کو تو دیکھا ہو گا۔ ننھی منی کھیل کود کی شوقین جنکا مقصد زندگی بھر کھیلنا ہے۔ گڑیوں سے کھیلنا، کتابوں سے کھیلنا، اماں ابا سے کھیلنا، اور پھر عاشقوں کی پوری کی پوری ٹیم کے ساتھ کبڈی کھیلنا"۔

عصمت کے افسانوں کو دیکھنے کے بعد ایک اور بات جو ذہن میں آتی ہے۔ وہ ہے ان کے افسانوں کی جلت پھرت۔ ان کا افسانہ نہ صرف دوڑتا ہوا نظر آتا ہے بلکہ فقرے کنائے۔ آوازیں اور کردار جذبات و احساسات ایک طوفانی انداز کے ساتھ بھاگتے نظر آتے ہیں۔ کبھی اُن کی یہ خیالات کی تیزی اس درجے آگے بڑھ جاتی ہے کہ پڑھنے والا

پیچھے کو ستارہ جاتا ہے لیکن عصمت کی یہ تیز روی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندستانی عورت اب اپنی رُوح میں بیداری اور بیداری کے ساتھ توازن محسوس کر رہی ہے۔ وہ رسم ورواج کے بندھن توڑ کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہے۔ عصمت کے افسانے اس پنہی تسلسل اور نئی زندگی کے خارجی پہلو کے آئینہ دار ہیں سیدھی سادی زبان ہے۔ نسوانی لطیف محاورے ہیں۔ شوخیاں اور چٹکیاں ہیں۔ کالج کی لڑکیوں چھیلی بہن کمینے رشتوں کے لڑکوں کا ذکر ہے۔ اور سب وہ افراد ہیں جن سے ایک خاندان بنتا ہے۔ ان کی ہر کہانی زندگی کے بہت قریب ہے۔ انہی خوبیوں کے ہوتے ہوئے عصمت کے افسانوں میں ایک نقص ان کی عریاں نویسی اور شوخ بیانی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حقیقت نگار نہ نویس ہیں۔ انہوں نے حقائق کو ہمارے سامنے عریاں پیش کر دیا ہے۔ لیکن کیا اچھا ہوتا کہ ان حقائق پر وہ مجاز کی ہلکی سی نقاب ڈال دیتیں۔ اس طرح اُن کے دلکش افسانوں کو چار چاند لگ جاتے۔ جس طرح کسی حسین دلہن کا دلربا چہرہ باریک نقاب سے جھلکتا ہوا زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔

سلطانہ قاضیہ ابھی بالکل نوعمر ہیں۔ لیکن مختصر افسانے لکھنے میں انکو کمال حاصل ہے۔ نئے ادبی تخیل رکھنے والی خواتین میں سلطانہ کے لکھے ہوئے افسانے سب سے زیادہ پاکیزہ اور دلکش ہوتے ہیں۔ ان کا تخیل نہایت گہرا ہے۔ اس کم سنی میں لفنی ادراک صحیح اور متناسب ہے۔ وہ جذبات کے دھارے میں بہہ نہیں جاتیں۔ بلکہ جذبات پر قابو پا کر لکھتی ہیں۔ اور افسانے کے اختتام پر ایسی گہری چوٹ کرتی ہیں کہ اس کا اثر دیر تک قائم رہتا ہے۔

موضوع کی وحدانیت ایک مضبوط پلاٹ کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک خوبصورت افسانے کا تانا بانا طیار کرتی ہیں۔ (خوبصورت میں نے اس لئے کہا کہ افسانہ وہی خوبصورت سمجھا جاتا ہے جس میں رنگا رنگ ساریوں اور جگمگاتے ہوئے زیوروں کا باربار ذکر ہو۔) لیکن سلطانہ کے افسانوں میں ان چیزوں کا نام نہ ہوتے ہوئے بھی افسانہ دلکش ہوتا ہے۔ انفرادی اور سماجی خوبصورتی کے متعلق سلطانہ کا نظریہ مختلف ہے۔ وہ خوبصورتی کو ایک اضافی قدر سمجھتی ہیں۔ ایک ایسی قدر جو ماحول اور سماج اور قدرت کی پکار کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ ناامیدی، بیچارگی، ناکامی کا احساس جو ہر ہندستانی مفلس انسان اپنی زندگی میں بار بار محسوس کرتا ہے۔ اور ترقی پسند ادیبوں کی طرح سلطانہ کے افسانوں میں بھی جھلکتا ہے۔

"غریب کی زندگی کیا ہے۔ کاغذ کی ناؤ ہے" ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اُلٹ گئی سلطانہ کے اکثر افسانوں میں یہی رنگ تفکر ہے۔ یہی صدائے احتجاج ہے۔ زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ ان کے افسانے مختصر لیکن وسیع المعنی ہوتے ہیں۔ بہت کچھ نہ کہکر بھی بہت کچھ کہہ دینا سلطانہ کے طرز تحریر کی خصوصیت خاص ہے۔

صالحہ عابد حسین کے افسانے بھی معاشرتی ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر شگفتہ افسانے لکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور دلکش ہے۔ نئی اور پُرانی تہذیب کا تصادم اور ان کا تقابل صالحہ عابد حسین بہت دلچسپ طریقے سے کرتی ہیں۔ عورت کی زندگی کے ہر پہلو پر ہماری ان بہن نے بہت گہری نظر ڈالی ہے۔ اور بڑے غور سے کام لیا ہے۔ روزمرہ کے واقعات اور زندگی کے ضروری مسائل کو اس سلیقے سے بیان کرتی ہیں کہ ان میں ایک ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کے ہر افسانے میں نئے اور پچھلے اسالیب کا ایک بہترین امتزاج پایا جاتا ہے۔ نہ اول دور کے لکھنے والوں کی طرح محض کہانی ہی کہانی ہے نہ ترقی پسند ادیبوں کی سی شعلہ فشانی ہے۔ مسائل حیات پر اُنہوں نے حکیمانہ نظر ڈالی ہے۔ اور اُس کو کہانی کے پیرایے میں دلنشین انداز کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ منظر کشی اور سیرت نگاری میں صالحہ عابد حسین کو کمال حاصل ہے۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "نقشِ اول" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ یقین ہے دوسرا مجموعہ یعنی نقش ثانی اس سے کہیں بہتر اور دلچسپ ہوگا۔

ڈاکٹر رشیدہ اختر بانو سہروردیہ اہلِ قلم خواتین میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ علم وادب سے ذوق رکھنا ان کا خاندانی جوہر ہے۔ وہ خجستہ بانو بیگم سہروردیہ جیسی عالمہ فاضلہ پھوپی کی بھتیجی اور ڈاکٹر سر حسان سہروردی جیسے قابل باپ کی بیٹی ہیں۔ انکے نامور اور مکرم والد اپنی لاڈلی اکلوتی بیٹی کی علمی قابلیت پر جس قدر ناز کریں بجا ہے۔ رشیدہ بانو کا علم وفضل تمام مسلمان خواتین کیلئے باعث فخر ہے۔

لکھنے اور بولنے پر ان کو یکساں قدرت حاصل ہے۔ وہ نہ شاعرہ ہیں۔ نہ افسانہ نگار نہ ناولسٹ لیکن اُردو ادب میں ان کی اہمیت ان سب سے بڑھکر ہے۔

اپنی قومی زبان کی خدمت اور اپنی بہنوں کی بہبودی کا ان کو بہت خیال ہے نوعمری میں بڈھوں کی سی سنجیدگی ان کے تفکر میں پائی جاتی ہے۔ اخلاقی معاشرتی مذہبی، اصلاحی ہر قسم کے مضامین لکھتی ہیں۔ طرز تحریر بڑا دلاویز ہے۔ اس عجیب انداز سے اظہار خیال کرتی ہیں کہ خشک سے خشک موضوع دلچسپ بن جاتا ہے۔

کبھی یورپ کی دلچسپیاں بیان کرتی ہیں۔ کبھی مغربی عورت کی زندگی دکھاتی ہیں۔ کبھی ہندستانی رسم ورواج اور یہاں کے سماجی حالات پر بحث کرتی ہیں اور کبھی تنقید وتبصرہ۔ لیکن ان کی ہر چیز ہوتی کار آمد اور مفید ہے۔ اور پھر لکھنے کا یہ کمال ہے کہ معمولی اُردو جاننے والی عورتوں سے لیکر عالمہ وفاضلہ خواتین پر بھی ان کی ادبیت کا رعب چھایا ہوا ہے۔ پیچیدہ مسائل کو نہایت آسان زبان میں لکھنا ان کی تحریر کی دلاویز خصوصیت ہے۔

ہماری عزیز بہن شائستہ بانو کو ۱۹۴۲ء میں لندن یونیورسٹی نے لٹریچر میں پی ایچ ڈی یعنی "ڈاکٹر آف فلاسفی" کی ڈگری دی۔ وہ پہلی ہندوستانی مسلمان خاتون ہیں جنہیں یہ علمی اعزاز ملا ہے۔

انہوں نے دو سال تک لندن سکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں پی ایچ ڈی کی طیاری کی۔ اور اردو افسانے اور ناول پر ساڑھے چار سو صفحوں کا مقالہ انگریزی میں لکھا جس پر ان کو یہ ڈگری دی گئی۔ اس مقالے کا وہ حصہ جس میں عورتوں کی ادبی خدمات پر انہوں نے بحث کی ہے۔ بہت دلچسپ ہے۔

یہ مقالہ دیکھکر ان کی فنی قابلیت اعلےٰ ذہانت اور گہرے تفکر پر عالم و فاضل مرد بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ ہم سب کو اپنی ان بہن کی قابلیت پر ناز ہے۔ نہ صرف ادبی بلکہ ان کی گھریلو زندگی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے لئے قابل مثال ہے۔ جہاں وہ ایک زبردست ادیبہ اور فاضل خطیبہ ہیں۔ وہاں وہ ایک سعادتمند بیٹی فرمانبردار بہو اطاعت گذار بیوی اور فرض شناس ماں بھی ہیں۔ ایسے دل و دماغ والی اور اخلاق کی مالک چند اور خواتین اگر ہمارے ملک میں ہو جائیں تو یقیناً موجودہ مشکلات کا سدباب ہو جائے۔

ابھی تک میں نے آپ کا تعارف ناول نویس افسانہ نگار اور مقالہ نویس خواتین سے کرایا۔ آئیے اب آپ کو اپنی شاعرہ بہنوں سے ملاؤں۔

عورت کا فنون لطیفہ سے فطرتی لگاؤ ہے۔ میرا خیال ہے ہر عورت فطری طور پر شاعرہ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے فطری جذبے کو اجاگر کرے۔ عورت کی قوت حس مرد سے بہت زیادہ ہے اور شعر کہنے کے لئے احساس ہونا لازمی ہے۔ لیکن بیجا قیود اور رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑے رہنے کے باعث ہماری بہت کم بہنیں شاعرہ ہیں۔ اور جو چند شاعرہ خواتین ہیں مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ وہ فن کار کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔ یوں تو ہم کو ہر زنانہ مردانہ رسالے میں عورتوں کی لکھی ہوئی نظمیں غزلیں ضرور نظر آ جاتی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی ایسی چیز ہمیں نظر نہیں آتی جو مخصوص طور پر ہماری طبائع کو متاثر کر سکے۔ آج دنیا بہت تیزی سے بدل رہی ہے۔ ہمارے سماجی تقاضوں کے ساتھ ساتھ ادبی تقاضے بھی وسیع ہو گئے ہیں۔

مجھے افسوس ہے۔ عصمت، حجاب اور شائستہ کی طرح میدان شاعری میں کوئی مردوں سے بازی لے جانے والی خاتون نہیں ہیں۔

اقبال و جوش تو بڑی چیز ہیں۔ ہماری شاعرہ خواتین حسرت و فانی کے رنگ میں بھی دو شعر نہیں کہہ سکتیں۔ رسائل کی کثرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شاعرہ خاتون اپنا کلام شائع کرا دینا ضروری سمجھنے لگی۔ کتنا اچھا ہوتا کہ وہ اپنی فنی کمزوریوں، تخیل کی بے مائگی

[illegible]

تجربوں کو فلسفۂ حیات سے ہم آہنگ بنانے کی ضرورت نہیں۔ انکے لئے مطالعہ اور غور و فکر لازمی نہیں بس چھوٹے چھوٹے مصائب اور معمولی معمولی کیفیتوں کے بیان پر اکتفا کر لینا کافی ہے۔ کیونکہ ان کا کام صرف تخلیق ہے۔ ہماری شاعرہ بہنوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ صرف جذبات اور سیدھے سادے جذبات کی ترجمانی کا نام شاعری نہیں ہے۔

بلکہ جذبات اور حقائق کے تجربوں میں زندگی کی نئے سرے سے تخلیق ہونی چاہیئے۔ ایسی تخلیق جس میں زندگی بلند سے بلند تر اور خوب سے خوب تر بنانے کی جد و جہد کی جانب بھی اشارا پایا جائے۔ لیکن شاعرہ بن جانے کی دھن میں ان مسائل پر غور کرنے کا بہت کم خیال ہماری بہنوں کو رہتا ہے۔

آیئے ان چند مشہور شاعرہ خواتین سے آپ کا تعارف کراؤں جنکو موجودہ دور میں اونچا درجہ دیا جاتا ہے۔

محترمہ "ح ب صاحبہ" ان کا مذاق شعر بہت منجھا ہوا ہے ان کے دل میں درد بھی ہے اور تخیل بھی قدرت نے ان کو عطا کیا ہے۔ زبان میں لوچ بھی ہے اور بیان پر قدرت بھی، وہ ہمیشہ نظم کہتی ہیں اور اچھی کہتی ہیں۔ ان کی شاعری تاثر آمیز اور دلکش و پاکیزہ ہے۔ ان کے اشعار میں متانت و سنجیدگی کے ساتھ وہ لطافت و دلکشی بھی موجود ہے جو ایک خاتون کا ہی حصہ ہے۔ موجودہ دور کی تمام خواتین میں انکا کلام زیادہ دلکش اور بلند ہے۔ ان کی شاعری میں ایک پیغام ہے۔ امید و زندگی ہے۔ یہ صاحب دیوان ہیں۔

محترمہ زیب عثمانیہ اور نواب سردار اختر کے کلام میں بھی ہمیں تفکر اور گہرائی ملتی ہے۔ ان کی شاعری ہمیں سوچنے پر مائل بھی کرتی ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے ان دونوں کا کلام پختہ اور نقائص سے پاک ہے لیکن وہ ولولہ اور تڑپ ان کے کلام میں نہیں جو دل کو تڑپا دے ممکن ہے آئندہ یہ دونوں کچھ ترقی کریں۔

رابعہ پنہاں بہت مدت سے شعر کہہ رہی ہیں ان کا کلام پختہ بھی ہے اور دلکش بھی۔ لیکن پھر بھی فن کارانہ پختگی ان کے ہاں نہیں ہے۔ جو ایک حقیقی شاعرہ کے ہاں ہونی چاہیئے۔

بلقیس جمال کو منظر نگاری کا اچھا سلیقہ ہے۔ نظمیں خاصی اچھی کہہ لیتی ہیں انداز بیان دلآویز ہے۔ لیکن کوئی انفرادی رنگ ان کا بھی نہیں ہے۔

خورشید آرا کی شاعری گہری بھی ہے اور ان کا تخیل پاکیزہ اور بلند بھی ہے بعض نظمیں ان کی کافی بلند ہوتی ہیں۔ تاہم کوئی خاص اسلوب انہوں نے بھی پیدا نہیں کیا۔

[illegible]

مقدس روح پر رحمتوں کی بارش کرے۔ جن کی تصنیف "آئینہ حرم" ان کی یادگار ہے۔ اگر زندہ رہتیں یقیناً ایسی زبردست شاعرہ ہوتیں کہ ان کو اُردو ادب میں انفرادی درجہ حاصل ہوتا۔ ان کے کلام میں جو بالکل نوعمری کا ہے۔ ہم کو ایک غیر معمولی ولولہ ایک لافانی جوش ایک دلی تڑپ ملتی ہے۔ ان کا تخیل بہت بلند اور ان کی نظر بہت گہری ہے۔ بدقسمتی سے ہمارا یہ فخر ہم سے قبل از وقت چھن گیا۔ اور اس ناقابل تلافی نقصان کا مداوی قدرت اب تک نہ کرسکی۔

عزیز جہاں آرا کی نظمیں اچھی ہوتی ہیں۔ منظر نگاری میں انکو کمال حاصل ہے اگر انہوں نے مشق جاری رکھی تو یقیناً کچھ بہتر کہنے لگیں گی۔

کنیز فاطمہ حیا اس دور کی تمام شاعرہ خواتین سے زیادہ شعر کہتی ہیں۔ ان کے کلام میں ایک دل نشین تسلسل اور لطیف تخیل نہیں ملتا ہے۔ لیکن سالیب وہی پرانے ہیں۔ ہاں البتہ صفیہ شمیم ملیح آبادی کی شاعری کچھ اُمید افزا نظر آتی ہے۔ وہ نظمیں بھی کہتی ہیں اور غزلیں بھی۔ ان کی ہر چیز میں فنی لطافت کے ساتھ ساتھ نسوانی نزاکت بھی ہوتی ہے۔ لطف بیان اور حسن زبان نے شمیم کے کلام کو اجاگر کر دیا ہے۔ کوئی جدید اسلوب بھی کبھی کبھی ہم کو ان کے کلام میں نظر آجاتا ہے۔ موجودہ دور کے نوجوان شعرا کی طرح وہ اکثر مسائل حیات پر شعر کہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور اچھا خاصا کہہ لیتی ہیں۔

گوہر اقبال حور۔ خورشید اقبال حیا۔ سکینہ بیگم اور نجمہ تصدق ان چاروں خاتونوں کی شاعری تقریباً یکساں سی ہے۔ ان بہنوں کے کلام کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے۔ کیا اب بھی ایسی رسمی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ کوئی تفسیر حیات نہیں ہے۔ آخر اس بیسویں صدی میں اس شاعری کو کہاں جگہ مل سکتی ہے۔ اس میں تسکین کا کون سا پہلو ہے۔ چونکہ تخیل کی بنیاد ٹھوس نہیں ہے اس لئے یہ خواتین ہر قدم پر بہکتی ہیں۔ فنی نقائص کے علاوہ بہت سے الفاظ کا استعمال بھی شاعرانہ بصیرت سے نہیں کرسکتیں۔ ہاں کوئی کوئی غزل ان کی البتہ جاندار ہوتی ہے۔ لیکن نظمیں تو بالکل سطحی اور جذباتی ہوتی ہیں۔ جن کی کوئی جگہ اس طوفان میں مقرر نہیں کی جا سکتی۔ جو موجودہ دور کے نوجوان شعرا کی آتشین نظموں سے اُٹھ رہا ہے۔ میں ان تمام شاعرہ خواتین کی کلام آپ کے سامنے پیش کرنے کا وقت نہیں پاتی۔ نہ یقیناً اس تبصرہ کو سننے کے بعد آپ اس کے لئے رضامند ہونگی۔ ہاں اتنا کہہ دینے پر اکتفا کرتی ہوں کہ محترمہ "ح ب صاحبہ"۔ زیب عثمانیہ۔ نواب سردار اختر۔ رابو پنہاں اور محترمہ خورشید آرا کو چھوڑکر موجودہ دور کی تمام شاعرہ خواتین کی شاعرانہ کوششیں جگر مرادآبادی۔ حفیظ جالندھری۔ اختر شیرانی۔ ساغر نظامی کی شاعری کا مٹا ہوا دھندلا سا عکس ہیں اور بس۔

یہ ہے ہماری شاعری کی کل کائنات۔

لیکن مایوس ہونے کی بجائے میں اُمید کرتی ہوں اس گروہ میں سے کوئی زیب النسا۔ کوئی قرۃ العین۔ کوئی سروجنی نکل آئے گی۔

"عورت"

(از بدر جہاں بیگم قریشی۔ بدر)

کیونکر یہ بتاؤں میں تمہیں کیا ہوں میں
اِک آتشِ سیال کا دریا ہوں میں

میں ایک حقیقت بھی ہوں، افسانہ بھی
خود مجھ کو بھی معلوم نہیں کیا ہوں میں

ادراک سے مردوں کے ہے جو بالاتر
ہستی کا وہ پیچیدہ معمّا ہوں میں

آدم نے مرے واسطے جنّت چھوڑی
وہ رونقِ ہستی، وہی حوّا ہوں میں

نرمی میں اگر بادِ بہاری میں ہوں
غصّہ میں شرر ریز بگولا ہوں میں

نافہم مجھے کہتے ہیں پُر جور و دغا
ٹوریکھ ہیں وہ، کیا جانیں مجھے کیا ہوں میں

ہے عشق مرے دم سے جہاں میں زندہ
دُکھ درد کے ماروں کا مسیحا ہوں میں

ہوں ماں کہیں اور بیٹی کہیں، بہن کہیں
ہر رُوپ میں مردوں کا سہارا ہوں میں

جس گھر میں نہ چمکوں وہ اندھیرا گھر ہے
آکاش کا تابندہ ستارا ہوں میں

اے بدر۔ حقیقت میں حقیقت یہ ہے
عورت ہوں۔ مگر زینتِ دُنیا ہوں میں

محترمہ صالحہ عابد حسین ، ادیب فاضل

میں اس مضمون میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ جو عورتیں ادب کے میدان میں آئیں تو انہیں کون سا مقصد اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ کیسا اسلوب بیان اختیار کرنا چاہیے۔ اور کن مخصوص موضوعوں پر قلم اُٹھانا چاہیئے۔

ادب دراصل زندگی کا ترجمان ہے جو کچھ انسان اپنے گرد وپیش دیکھتا ہے اور جس طرح اُس سے متاثر ہوتا ہے اسی کو وہ نظم اور نثر کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ لیکن لوگوں نے ادب کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا ہے "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" اور اس مسئلے نے ایک مستقل بحث کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مجھے مردوں کے جمالیاتی نقطۂ نظر اور "آرٹ برائے آرٹ" اور "ادب برائے ادب" پر بحث کرنا نہیں۔ میرا تو دعویٰ یہ ہے کہ مرد خواہ کچھ کہیں اور کچھ کریں لیکن عورت زندگی کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر کچھ دیکھ ہی نہیں سکتی۔ عورت ماں ہے۔ اسکی آغوش میں آئندہ قوم پرورش پاتی ہے۔ وہ معلم ہے مصلح ہے۔ تربیت کرنے والی۔ زندگی بخشنے اور سنوارنے والی ہے۔ اور کوئی بھی تعلیمی یا اخلاقی کام کرنے والا جس کے پیش نظر اصلاحی مقصد ہو کبھی زندگی کے حقائق سے مُنہ نہیں موڑ سکتا۔ اور اسی لئے میں سمجھتی ہوں کہ عورت ہر کام میں زندگی کو دیکھتی اور پرکھتی ہے۔ اور اُسے قائم رکھنے اور سنوارنے کو اپنا مطمح نظر سمجھتی ہے۔ مرد زندگی سے مُنہ موڑ کر بیٹھ سکتا ہے۔ لیکن عورت کیلئے یہ مشکل بلکہ محال ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کی امین ہے۔

اگر یہ بات آپ نے مان لی کہ ادب کم سے کم عورت کے لئے زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں تو اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کون سی خاص خاص باتیں ہیں جو ادب میں ضرور موجود ہونی چاہئیں۔

جب مقصد اخلاقی اور اصلاحی ہو تو سب سے پہلی اور ضروری شرط زبان اور بیان کی سادگی، صفائی اور اثر ہے۔ بات جس قدر سیدھے سادے دل نشین انداز میں کہی جائیگی اتنی ہی زیادہ موثر ہوگی۔ جو لوگ ادب کا اصل مقصد ذوقِ جمال کی تسکین یا محض تفریح سمجھتے ہیں وہ جتنی بھی زیادہ اپنے طرز بیان میں رنگینی پیدا کریں۔ لفظی خوبیاں اور صنعتیں برتیں۔ اور اپنی تحریر کو شوق سے خوبصورت الفاظ کا گورکھ دھندا بنائیں لیکن جن کا مقصد ادب سے کچھ کام لینا ہے۔ جو اسے زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ اس چیز کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ جو بات کہیں وہ سیدھے سادے طریقے اور صفائی سے پُر اثر انداز میں کہیں۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے آجائے اور اُن کے دل میں بیٹھ جائے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ خوبصورت الفاظ یا دلکش طرز بیان اور لفظی خوبیاں بُری چیز ہیں یا انہیں بالکل نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اصل مقصد ان تکلفات کی فکر میں فوت ہو جائے۔ مولانا حالی مرحوم اسی لئے کہتے ہیں :-

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دلگداز تو

حالی نے اپنی مشہور اور مقبول تصنیف "مقدمہ شعر وشاعری" میں شعر کے لئے تین وصف لازمی بتائے ہیں جن کے بغیر شعر شعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ یعنی اصلیت، سادگی اور جوش۔ میرے نزدیک یہ تینوں اوصاف نثر کے لئے بھی اتنے ہی لازمی ہیں جتنے شعر کے لئے۔

"ادب برائے زندگی" کے لئے پہلی اور اہم صفت اصلیت ہے۔ یعنی سیدھی سچی بات بیان کرنا جو ہر وقت کے مشاہدے اور تجربے سے معلوم کی جائے۔ آسمان زمین کے قلابے ملانا۔ مافوق الفطرت داستانیں اور عجیب وغریب قسم کے قصے سُنانا یا ایسی زندگی دکھانا جو صرف خواب میں نظر آئے تو آئے یا محض تخیل میں اس کا وجود ہو تو ہو رنگین۔ دل فریب اور دلچسپ ہو سکتی ہے لیکن حقیقی زندگی کی ترجمان نہیں۔ اس ادب میں تو پہلی شرط ہی یہ ہے کہ وہ تصویر پیش کی جائے جو پڑھنے والے کو جیتی جاگتی زندگی کا نمونہ معلوم ہو۔ وہ چند لمحے کے لئے اپنے دُکھ سکھ کو بھول کر دوسرے کے دُکھ سکھ میں ڈوب جائے۔ اور یہ سمجھے کہ ایسی زندگی خود وہ بھی بسر کر سکتا ہے۔ یہ سب اس پر بھی گذر سکتا ہے۔

اب دوسری صفت سادگی کو لیجیئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، سادگی سے مراد زبان اور طرز بیان کی سادگی اور صفائی ہے۔ یعنی بات کہنے کے طریقے میں ایسا ایچ پیچ نہ ہو کہ پڑھنے والا اس کی گرہیں کھولنے میں اُلجھا رہے۔ دقیق مشکل اور غیر مانوس الفاظ سے پُر نہ ہو کہ اس کا دماغ مطلب سے بھٹک کر لفظوں پر غور کرنے اور سوچنے ہی میں رہ جائے۔

اب رہا تیسرا وصف یعنی جوش۔ جوش کا یہ مطلب نہیں کہ عبارت میں بڑے جوشیلے الفاظ ہوں بلکہ جس تحریر میں سچی لگن ہوگی اور دلی جذبات حقیقی طور پر ادا کئے

جائیں گے اس میں سادہ سے سادہ اور نرم سے نرم الفاظ میں بھی جوش نہاں ہوسکتا ہے۔

زندگی کے ترجمان ادب میں کوئی تعلیمی اخلاقی اور اصلاحی مقصد پوشیدہ ہونا بھی لازمی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ افسانہ، ناول اور مضمون وعظ و نصیحت کا دفتر بن جائے۔ وہ ادب نہ ہوگا کسی مولوی کا وعظ یا پندنامہ ہو جائیگا۔ یہ مقصد تحریر میں اس طرح پنہاں ہونا چاہیئے کہ چپکے چپکے پڑھنے اور سننے والے کی دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اور وہ غیر محسوس طور پر اس مقصد کو قبول کرے۔

اب تک تو یہ ذکر تھا کہ عورت کے ادب کا مقصد کیا ہے اور کیا ہونا چاہیئے۔ اور طرز تحریر کس قسم کی ہو۔ آیا رنگین اور پر شکوہ یا سادہ اور دلنشیں۔ اب یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ان کی تحریر کا دائرہ اور موضوع کیا ہو۔ وہ عام اجتماعی زندگی دکھائیں تو ہر ادیب، خواہ مرد ہو یا عورت، دکھاتا اور دکھا سکتا ہے۔ یا اُس زندگی کی تصویر پیش کریں جس میں وہ اپنی عمر کا زیادہ سے زیادہ حصہ صرف کرتی ہیں۔ یوں تو مرد اور عورت کی زندگی میں تفریق نہیں ہوسکتی جس دنیا میں مرد رہتے ہیں اُسی دنیا میں عورتیں رہتی ہیں پھر عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ ادب کا ہونا کیا معنی؟

بے شک ایک حد تک دونوں کی زندگی اور دونوں کا ادب مشترک ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ عورتوں کی ایک الگ دنیا بھی ہے۔ اسی کا مشاہدہ کرنا اور اسی کی تصویر کھینچنا عورت کے قلم کا اصلی کام ہے۔ ہندوستانی عورت خصوصاً مسلمان عورت کا ماحول عموماً مردوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اور اس کی زندگی ایک بڑی حد تک مردوں سے الگ بسر ہوتی ہے۔ اس کا ایک محدود دائرہ زندگی ہے جس میں وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ صرف کرتی ہے۔ ایک مخصوص میدان عمل ہے جس میں وہ زندگی کے تجربات حاصل کرتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو زندگی تجربے اور ذاتی مشاہدے کی بنا پر دکھائی جائیگی وہ سنی سنائی یا دور سے دیکھی ہوئی زندگی کے بیان سے زیادہ حقیقی۔ اچھی، دلکش اور پراثر ہوگی۔ مطالعہ کی وسعت کی بنا پر قابل عورت یوں تو ہر مضمون پر طبع آزمائی کرسکتی ہے لیکن اس کو وہی موضوع زیادہ تر اختیار کرنے مناسب ہیں جن کا تعلق خود اس کی اپنی اپنے بچوں، اپنے متعلقین اور اپنے ملنے جلنے والوں کی زندگی سے ہو۔ کیونکہ ادیب زیادہ کامیاب اُسی میدان میں ہوسکتا ہے جس کا اُسے ذاتی تجربہ ہو۔ اور جس کا اُس نے گہرا مشاہدہ کیا ہو۔

ایک اور اہم وجہ یہ بھی ہے کہ عورت کے جذبات و احساسات جس طرح عورت دکھا سکتی ہے۔ عورت کی زندگی کے بعض مسائل اور خاص خاص واقعات کو جس خوبی سے وہ بیان کرسکتی ہے اُس طرح مرد نہیں کرسکتے۔

ہمارے کئی اچھے ادیبوں نے عورتوں کی زندگی [illegible] تصویریں کھینچی ہیں۔ بعض نے اپنا خاص موضوع ہی اسے قرار دیا اور اس میں کامیاب بھی ہوئے لیکن وہ بھی عورت کے جذبات اور احساسات کی وہ حقیقی اور سچی تصویر نہیں کھینچ سکے جو ادیب عورت تھوڑی سی کوشش سے کھینچ سکتی ہے۔ مرد عورت کے احساسات اور جذبات کو بھی اپنے پر قیاس کرتے ہیں۔ اور عموماً اچھی سے اچھی کتاب میں اس چیز کی کمی نظر آتی ہے۔ مثلاً بیوہ عورت یا وہ عورت جس کے بچہ نہ ہو اُس کے جذبات، اُس کے رنج و غم اور احساسات کا اندازہ جس طرح عورت کرسکتی ہے اور خود اُسے محسوس کرسکتی ہے۔ مرد کبھی نہیں کرسکتا۔ اور اس لئے عورت کی ترجمانی کا فرض بھی عورت ہی پر ہے۔ اور جس طرح مردوں کے لئے عورت کے جذبات اور اسکی فطرت کا سمجھنا اور اس سے زیادہ اس کا اظہار کرنا دشوار ہے۔ اسی طرح مرد کے احساسات اور جذبات کا پورا پورا اندازہ لگانا عورت کے لئے مشکل ہے۔ اور اسی لئے ہماری ادیب عورتیں بھی مردوں کا کیرکٹر دکھانے میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں۔ وہ انہیں یا تو ظالم، وحشی اور سنگ دل دکھاتی ہیں یا بے حد سے زیادہ حساس، نرم دل اور جذبات کی رو میں بہہ جانے والا۔

اگر سچ پوچھئے تو ہمارا عورتوں کا ادب ابھی ہے ہی کے دن کا؟ نصف صدی پیشتر تک تو اُردو ادب میں عورت کا نام بھی مشکل سے نظر آتا تھا۔ شاید عورتوں میں سب سے پہلے محمدی بیگم اور بیگم صاحبہ بھوپال مرحومہ نے لکھنے کی ابتدا کی۔ عورتوں کے اخبار و رسائل نے عام طور پر ان میں لکھنے کا شوق پیدا کیا۔ اور تھوڑی مدت میں کئی اچھی لکھنے والیاں پیدا ہوگئیں۔ تعلیم کے پھیلنے اور مطالعہ کی وسعت نے اس شوق کو اور تیز کیا اور بڑی تیزی سے لکھنے والیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ عورتوں کے رسالوں اور اُن کے مضمون نگاروں کی تعداد بہت بڑھی اور اُدھر کچھ مدت سے تو اُردو لکھنے والی خواتین میں بعض ایسی ادیب نظر آنے لگی ہیں جو چوٹی کے ادیبوں میں شمار ہوسکتی ہیں۔ اتنی سی مدت میں یہ کامیابی امید افزا اور امید پرور ہے۔ موجودہ دور میں، جسے افسانہ کا دور کہا جاتا ہے۔ نوجوان مرد اور عورت دونوں افسانہ نگاری کے بہت زیادہ شائق ہیں۔ اور میں اپنے مطالعہ کی بنا پر کہہ سکتی ہوں کہ اوسط درجے کی ادیب عورتوں کے افسانے اُسی درجے کے ادیب مردوں کے افسانوں سے اکثر زیادہ کامیاب اور پُر اثر ہوتے ہیں۔ اُمید ہے کہ انشاء اللہ آگے چلکر میدان ادب میں عورتیں، مردوں کے صرف دوش بدوش ہی نہیں چلیں گی۔ بلکہ اگر اُن سے بازی لے جائیں تو بھی کوئی تعجب نہیں؟

ہماری جتنی پہلی اور پُرانی قصہ اور ناول نویس خواتین ہیں (مثلاً محمدی بیگم

مرحومہ، والدہ افضل علی صاحبہ۔ "خاتون" مصنفہ شوکت آرا بیگم، نذر سجاد حیدر۔ عباسی بیگم مرحومہ وغیرہ) سب نے ہندستان کی معاشرتی گھریلو زندگی دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اصلاحی اور اخلاقی مقصد کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ چاہے ان قصوں میں اور کچھ خامیاں ہوں لیکن اپنے اس مقصد میں یہ خواتین بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہیں۔ پرانے اُردو ادب میں مرد ادیبوں نے بڑی بڑی خیال آرائیاں کیں۔ بڑی بڑی رنگینیاں دکھائیں اور نظم و نثر کو اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لئے وقف کر دیا۔ لیکن جب عورت ادب کے میدان میں آئی تو اس نے بلا ارادہ اپنا مقصد زندگی کی ترجمانی ہی رکھا۔ اور یہ بھی اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ عورت زندگی کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر کچھ نہیں دیکھ سکتی۔

عام اردو ادب، خصوصاً نظم میں "آرٹ برائے آرٹ" یا "ادب برائے ادب" کا نظریہ شروع سے مقبول تھا لیکن ایک مدت سے اس کی قبولیت کچھ کم ہو گئی ہے اور لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ ادب سے زندگی کی ترجمانی اور اصلاح کا کام لینا چاہیئے۔ اس چیز پر سب سے زیادہ اور غالباً سب سے پہلے حالی نے زور دیا۔ نہ صرف یہ تحریک اٹھائی بلکہ نظم و نثر دونوں میں نمونے بھی پیش کئے۔ یہ رنگ خاص حلقوں میں بہت مقبول ہوا لیکن عام طور پر لوگ انہیں رنگینیوں اور خیال آرائیوں میں مصروف رہے۔

اب پچھلے چند سال سے ایک نئی تحریک زوروں پر ہے۔ یہ "نیا ادب" یا "ترقی پسند مصنفین کا ادب" ہے۔ جن اصولوں پر اس کی تحریک اٹھی ہے ان کے فوائد سے کون معقول پسند انکار کر سکتا ہے۔ منشی پریم چند جیسے حقیقت نگار اور مصلح ادیب کا اس تحریک میں شریک ہونا اس کے کار آمد اور مفید ہونے کی ضمانت ہے۔ یہ بھی دراصل "ادب برائے زندگی" ہی کی ایک نئی اور زیادہ وسیع صورت ہے۔ لیکن اس ادب نے انقلابی ادب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب اس کے اکثر ادیبوں کا مقصد اُردو ادب میں اصلاح ہی نہیں رہا۔ بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ اسے جڑ سے کھود کر پھینک دیں اور اس کی جگہ ایک بالکل نیا اور انقلابی ادب پیدا کریں۔ نئے ادب کی تحریک اپنی جگہ پر بہت اچھی سہی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اکثر خود ساختہ ترقی پسند ادیب گندی مکروہ، بدکاری اور بے شرمی کی زندگی کی نہایت عریاں تصویر کبھی خوفناک اور کبھی دلچسپ انداز میں کھینچنا اور مزے لے لیکر بیان کرنا اس تحریک کا مقصد سمجھتے ہیں۔ مزدوری اور سرمایہ داری کے (اور ترقی پسندی کے) پردے میں وہ وہ باتیں لکھی جاتی ہیں جنہیں ہر کوئی معقول پسند شخص کراہت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بات جتنی زیادہ عریاں، مکروہ اور خوفناک [illegible]

اسی کا نام ہے تو خدا ہندستانی ادیب عورت کو اس سے محفوظ ہی رکھے۔

اگرچہ عام طور پر اُردو کی ادیب خواتین اس قسم کے ادب کو ناپسند کرتی ہیں لیکن پھر بھی دو ایک خواتین ترقی پسند ادب کے میدان میں مردوں سے بھی زیادہ تیزی سے جولانیاں دکھا رہی ہیں۔ ان کے مضامین بے شرمی و عریانی کے مضمون گندے مکروہ الفاظ کے استعمال اور باغیانہ خیالات اور جذبات کے اظہار میں کنا ہیں کاش یہ اپنے زور قلم اور حسن رقم سے اپنے جیسے مردوں ہی کو محظوظ کرنے پر اکتفا کریں لیکن اب انہوں نے ہندستانی عورتوں پر بھی نوازش شروع کر دی۔ اگر اس ذہنیت کے دس پانچ خواتین میدان ادب میں آجائیں تو بہت جلد خواتین کے ادب کی نیا ڈوب کر دم لیں گی۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ نئے ادب کے علم برداروں کی مذمت کروں۔ ان میں بہت اچھے لکھنے والے موجود ہیں جو اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہیں۔ لیکن میرا مشورہ اپنی ادیب بہنوں کو یہی ہے کہ وہ اس نئے ادب سے دُور رہ کر محض اسکی پُرانی شکل یعنی "ادب برائے زندگی" ہی پر طبع آزمائی کریں۔ عورت کا کام تخریب نہیں، تعمیر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اس سیلاب میں بہہ جائیں۔ جس میں اکثر ادیب بھائی اور بعض ادیب بہنیں بہہ گئی ہیں۔

میں دیکھتی ہوں کہ کچھ دن سے رُوحانی ادب عورتوں میں مردوں سے بھی کچھ زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ اور اس طرز کو بعض بہت اچھا لکھنے والی خواتین نے نظم و نثر میں اختیار کیا ہے۔ اس ادب کا مقصد زندگی کی حقیقی تصویر دکھانا نہیں بلکہ ایسی زندگی دکھانا ہے جسے بسر کرنے کو لکھنے والے کا جی چاہتا ہے۔ ایک رنگین عشق و محبت سے لبریز دلکش حسین اور دلچسپ زندگی جیسی شاید پریوں کے بادشاہ یا الف لیلہ کے ہارون رشید بسر کرتے ہونگے۔ خوبصورت حسین دُنیا دکھانا جہاں شعر و نغمہ، دولت و عزت، اعلےٰ اخلاق، سچی اور دلی محبت غرض دُنیا کی ہر حسین اور خوبصورت شے کا وجود ممکن ہے محض تفریح کیلئے یہ ادب بہت اچھا ہے۔ ایک اچھے رومانی ادیب کی تحریر پڑھتے وقت ہم دُنیا مافیہا سے بے خبر ہو کر کچھ دیر کیلئے اسکی خیالی حسین دُنیا میں اپنے کو بھول سکتے ہیں۔ لیکن جب واپس اپنے آپ میں آتے ہیں تو ہمیں اور زیادہ سختی سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہماری حقیقی دُنیا اس خیالی دُنیا سے کتنی مختلف ہے۔ یہاں مصیبتیں، تکلیفیں، بیماریاں اور ناگہانی موتیں، مفلسی، دُکھ، غریبی، بے روزگاری، ظلم اور ناانصافی ہے کاہلی اور بے ایمانی، بے وفائی اور بے مروتی بھی ہے۔ یہاں ایک انسان دوسرے انسان کا دشمن اور خون کا پیاسا بھی ہے۔ یہاں دُنیا کو تباہ کرنے کیلئے جنگ و جدل برپا ہے۔ یہاں عورتیں یا تو حد سے زیادہ امیر، فیشن کی غلام، اخلاق اور مذہب کی بندشوں [illegible]

کمزور اور بد تربیت بچے ہیں۔ مفلسیت کے مارے مزدور اور سماج کی ٹھکرائی عورتیں ہیں غرض تھوڑی سی آسائش اور آرام کے مقابلے میں بہت زیادہ دُکھ اور مُصیبت نظر آتی ہے اگر دل میں اپنی جنس اور نوع کیلئے تھوڑی سی ہمدردی موجود ہو تو شدت سے یہ احساس ہوگا کہ ہمارے ادب کو اس دُکھ بھری زندگی کی تصویروں اور اُسے بدلنے اور سنوارنے کی کوششوں کیلئے وقف ہونا چاہیئے۔ جہاں کشتی ڈوب رہی ہو وہاں خوش آئند راگ گانا بھلا نہیں لگتا ایسے وقت میں ادیب کو محض تفریح اور جمالیاتی تسکین کیلئے وقف کرنا اپنے پر اور اپنے ادب پر ظلم ہے۔ رومانی ادب پسند ہے تو شوق سے اُس پر طبع آزمائی فرمائیے۔ مگر محض فرضی اور مافوق الفطرت قصوں اور صرف دلکش دُنیائیں بنانے پر اکتفا نہ کیجئے۔ بلکہ دل میں اصلاحی خلش رکھکر اُسے بھی حقیقی زندگی سے قریب تر لائیے۔ لیکن اگر آپ کو اپنا وہی رومانی ادب پسند ہے تو پھر آپ کو اختیار ہے خوب خوب رنگین دُنیائیں بنائیے۔ یہ بھی جوانی کی ایک ترنگ ہے اور تھوڑی دیر کیلئے اپنے کو یا دوسروں کو خوش کر دینا بھی کوئی بُری بات نہیں۔

"رومانی" اور "نئے ادب" کے بعد پھر وہی "ادب برائے زندگی" باقی رہ جاتا ہے یعنی وہ جس کا تعلق زندگی سے بہت گہرا ہے۔ جس کی بنیاد اصلی اور حقیقی زندگی کی بولتی چالتی تصویر پیش کرنا ہے۔ معاشرتی خرابیاں، تعلیمی کمیاں، اخلاقی کمزوریاں، مذہبی توہمات، مغرب پرستی، فیشن کی اندھادُھند غلامی، بچوں کی خراب تربیت، عورتوں کی بے بسی اور جہالت خاندانی اور گھریلو جھگڑے اور مشکلات، میاں اور بیوی کے خراب تعلقات، سماج کی بے جا بندشیں کہاں تک گناؤں۔ روزمرہ کے مشاہدے میں ایسی سینکڑوں باتیں گذرتی رہتی ہیں ان کی اصلاح اور ان خرابیوں کو دُور کرنے کی خلش پس منظر میں رکھکر ایسی تصویریں کھینچیئے جو ہم آپ دن رات اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ وہ تصویر جو سچ مچ چلتی، پھرتی، بولتی چالتی، ہنستی اور روتی محسوس ہو جس کے ساتھ دوسرا بھی ہنس اور رو سکے جس کے دُکھ سُکھ کو وہ اپنا دُکھ سُکھ سمجھ سکے۔

خواتین کے ادب میں ایک بہت بڑی کمی یہ ہے (جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا) کہ اب تک جس قدر ناول اور افسانوں کے مجموعے خواتین کے شائع ہوئے ہیں۔ اُن میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جن میں امیر و رئیس خاندانوں کی معاشرتی زندگی دکھائی گئی ہے شاید اسکی یہ وجہ ہو کہ پہلے پہل لکھنے والیاں متمول طبقے میں پیدا ہوئیں۔ اور بعد میں یا تو انکی تقلید ہیں اور یا اس لئے کہ لاؤ اور کچھ نہیں تو تخیل ہی میں امارت کا لُطف اُٹھا لیا جائے۔ اسی قسم کے قصے لکھے گئے۔ ان قصوں میں امیرانہ زندگی، جس میں روپیہ پیسہ، عیش آرام، خطابات و اعزازات، جاگیر و املاک، جواہرات و زیورات، اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت وغیرہ کی اس قدر فراوانی ہے کہ خدا کی پناہ! ضمناً غریب یا متوسط طبقے کے لوگوں کا ذکر آیا بھی تو سرسری انداز سے اور بعض اوقات تحقیر آمیز طریقے پر وہاں سے گذر جاتے ہیں۔ کسی نے اوسط درجے کی زندگی دکھائی بھی تو آخر میں وہ کسی نہ کسی ترکیب سے ضرور دولت مند بن جاتے ہیں۔ غریب خاندانوں کے حالات اور معاشرتی زندگی دکھلانے کی تو بہت ہی کم کوشش کی گئی ہے۔

مرد عموماً عمر بھر کسب معاش اور طلب زر کے لئے جد و جہد کرتے رہتے ہیں اور یوں بھی مستثنیات کو چھوڑکر اُن کے دل میں وہ درد اور لچک اور وسعت نسبتاً کم ہوتی ہے جو عورت کا حصہ ہے۔ اسلئے اگر ایک حد تک ان میں غریب، امیر، شریف، مفلس وغیرہ کی تخصیص ہو تو کوئی تعجب نہیں لیکن اس پر بھی ہمارے کئی اچھے مصنفین نے عام اجتماعی زندگی دکھائی ہے جس میں منشی پریم چند مرحوم اور مولانا راشد الخیری مرحوم کے نام سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔

میرا خیال ہے کہ عورت کا دل زیادہ وسیع ہونا چاہیئے۔ اُسے قدرت نے ایک خاص لچک اور نرمی عطا کی ہے۔ اس کے لئے امیر، غریب، کم حیثیت اور اعلےٰ خاندان وغیرہ کی تفریق کرنا بہت ہی نازیبا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں تو سب برابر ہونے چاہئیں۔ اور پھر ہندوستان میں امیر خاندان ہیں ہی کتنے ہزار اور ایک کی نسبت بھی تو نہیں۔ ایسی زندگی جس میں سوا جاہ و حشمت اور اس کے لوازمات کے کچھ اور نہ ہو کتنے لوگوں کے لئے دلچسپ یا مفید ہو سکتی ہے؟ شاید امرا کا طبقہ اس کو شوق سے پڑھے لیکن عوام کے دل پر وہی کتاب قبضہ کر سکتی ہے جس میں خود اُن کی زندگی پیش کی گئی ہو۔ جس میں اُن کی مصیبتیں، مشکلیں، پریشانیاں اُن کے مشاغل اور مصروفیتیں اور اُن کی دلچسپیاں۔ ان کا دُکھ سُکھ دکھایا گیا ہو۔ تصویر کا صرف روشن پہلو دکھانا اور تاریک کو نظر انداز کر دینا اچھے مصور کا کام نہیں۔ اُس کا فرض تو یہ ہے کہ تصویر کے دونوں رُخ ایمانداری سے پیش کرے۔

ترقی پسند مصنفین نے بے شک اپنا خاص موضوع ہی غریب اور مزدور طبقے کی زندگی بنایا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا اوّل تو اُن کے ہاں عُریانی اور مُبالغہ بہت ہے اور جنسیت کا عنصر بہت غالب ہے۔ اور ایک دوسری بات یہ ہے کہ اُسے پڑھکر زندگی سے بیزاری، مایوسی اور نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ادیب عورتوں کو کسی خاص قسم کے ادب سے تعلق کئے بغیر ہر طرح کی مشکلات اور رنج، غم، خوشی اور راحت غرض ہر طرح کی زندگی دکھانی چاہیئے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ساتھ ہی یہ خیال بھی رکھنا ضروری ہے کہ زندگی کا تاریک سے تاریک پہلو بھی اپنے اندر کہیں نہ کہیں چھپی ہوئی روشنی ضرور رکھتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ پڑھنے والے کے دل پر یاس و قنوطیت، ناامیدی اور ناکامی، افسردگی اور لاچاری

کے جذبات طاری ہو جائیں۔ نہیں۔ بلکہ ہر مصیبت کے اندر اُمید کی کرن ضرور چمکتی ہو۔ کون نہیں جانتا کہ خود عورت سخت سے سخت حادثہ اور انتہائی تکلیف اور مشکل کے وقت بھی امید کا تار ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔ وہ ڈھارس بندھانے والی، زندگی کو قائم رکھنے والی اور اس میں خوشی کی جھلک پیدا کرنے والی ہے۔ اگر اس پر فاقے گذرتے ہیں۔ وہ اپنے بھوکے بچوں کو چھاتی سے لگا کر ول کو ڈھارس دے لیتی ہے۔ کہ میری دولت تو یہ ہیں۔ بیمار ہوتی ہے تو اس کی یہ آرزو رہتی ہے کہ میرے پیارے تندرست اور زندہ رہیں۔ تندرستی ان سے بڑھکر نہیں۔ ہندستانی عورت کے لئے بیوگی سے بڑھکر دردِ فرسا حادثہ کوئی نہیں۔ وہ اُسے دُنیا کی سب سے بڑی مصیبت سمجھتی ہے۔ لیکن اس وقت بھی وہ اپنے بچوں یا کسی اور عزیز کی خاطر زندگی کو گوارا بنا لیتی ہے۔ کیونکہ خدا نے اس کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ وہ اپنی خاطر نہیں دوسروں کی خاطر جئے۔ اور ان کی زندگی کو روشن بنائے۔ بس اُس کی یہی اہم صفت اس کے ادب میں بھی موجود ہونی چاہیئے۔ جس طرح وہ زندگی میں کسی نہ کسی طرح روشنی تلاش کر لیتی ہے۔ اور کوئی نہ کوئی سہارا ڈھونڈھ کر امید کا تار پکڑے رہتی ہے۔ یہی خصوصیت اُس کے ادب میں بھی نمایاں ہونی چاہیئے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس میں ادیب عورتیں مردوں سے کہیں زیادہ کامیاب ہو سکتی ہیں۔

نامُمکنات

از
محترمہ صفیہ شمیم
ملیح آبادی

جیسے پتھر کو کوئی ہیرا بنا سکتا نہیں
جیسے کانٹا صورتِ گُل مُسکرا سکتا نہیں
جیسے ناممکن ہے انگاروں کا بن جانا گُلاب
جیسے کوئی زہر کو امرت بنا سکتا نہیں
جیسے دن کو دے نہیں سکتے ستارے روشنی
جیسے کوئی وسعتِ گردوں کو پا سکتا نہیں
جیسے چل سکتا نہیں بس زندگی کا موت پر
جیسے انساں عقدۂ ارواح پا سکتا نہیں
جیسے بہکا ہی نہیں سکتا فرشتوں کو کوئی
جس طرح دِن شب کی سی ظلمت دِکھا سکتا نہیں
چھیننا جس طرح ناممکن ہے گرمی آگ سے
جیسے کوئی آگ پانی میں لگا سکتا نہیں
جیسے پتھریلی چٹانوں پر نہیں ملتے گہر
جیسے کوئی چاند کی تابش چُرا سکتا نہیں
جیسے کوئی قید کر سکتا نہیں مہتاب کو
سر پہاڑوں کا کوئی جیسے جُھکا سکتا نہیں
جس طرح سے تم کو میرا یاد فرمانا محال
دِل مرا یوں ہی کبھی تم کو بُھلا سکتا نہیں

خواتین کی شاعری

(از محترمہ اختر قریشی، بی، اے، بی، ٹی)

ہندوستان میں مسلمان خواتین کی بیداری کی تاریخ اگر دیکھی جائے تو ہمیں تین اہم دور نظر آئیں گے۔ اوّل وہ زمانہ جبکہ علم و ادب کا دور دورہ تھا۔ مغلوں کی حکومت تھی۔ بادشاہوں کی علم دوستی اور قدر دانی کے زیر سایہ ادب کی ہر صنف خصوصاً شاعری خوب پھل پھول رہی تھی۔ خواتین پر علم کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اور چونکہ ہر گھر میں علمی چرچے تھے لہٰذا وہ تعلیم یافتہ خواتین اور شہزادیاں جن کا رجحان شاعری کی جانب ہوا تھا میدان سخن میں خوب طبع آزمائی کرتی تھیں۔

اس کے بعد دوسرا دور شروع ہوا۔ جس کو تاریک دور کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ جبکہ علم ادب کے دروازے عورتوں پر یکلخت بند کر دیئے گئے۔ تعلیم نسواں کو معیوب سمجھا جانے لگا۔ یہ مغلوں کے زوال کا زمانہ تھا۔ اس زمانے کے بہت عرصہ بعد تک بھی عورتوں کو اس طرح گھروں میں قید کر کے رکھا گیا کہ نور علم کی ایک کرن بھی اُن تک نہ پہنچنے پائی۔ عورتوں کا کام صرف خانہ داری تصور کیا گیا۔ علمی مشاغل میں حصہ لینے کی انہیں قطعی اجازت نہ تھی۔ اس لئے رفتہ رفتہ خواتین کی شاعری کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد تیسرا دور شروع ہوا۔ یعنی دور جدید ..... یہی موجودہ زمانہ جس میں ہم اور آپ موجود ہیں۔ خواتین جو عرصہ سے جہالت کی تاریکی میں سوئی ہوئی تھیں بیدار ہوگئیں۔ عورتوں کو پھر تعلیم دی جانے لگی۔ اور تعلیم کا چرچا ہوتے ہی علم و ادب کی دوسری شاخوں کی مانند شاعری بھی سرسبز ہوگئی۔

حاضرین! اس سے قبل کہ میں دور قدیم اور دور جدید کی شاعرہ خواتین کے کلام پر تبصرہ کروں۔ آیئے پہلے یہ دیکھ لیں کہ شاعری ہے کیا چیز؟ شاعری کا جس قدر گہرا تعلق ہماری زندگی سے ہے اتنا کسی اور چیز سے نہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہیئے کہ شاعری کی ابتدا انسان کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ جس رفتار سے وحشی انسان ترقی کرتا گیا اسی رفتار سے شاعری بھی ترقی کرتی گئی۔

ارسطو کہتا ہے کہ "شاعری فطرتی رموز کی نقاشی ہے"۔ افلاطون کہتا ہے "شاعری وہ ہے جو ایک دل سے نکلے اور دوسرے دل میں جا کر ٹھہرے۔"

زمانہ اپنی رفتار کے مطابق شاعرہ خواتین پیدا کرتا ہے۔ پرانے زمانے میں بھی بہت سی مشہور شاعرات گذری ہیں۔

شہنشاہ جہانگیر کی بیگم نورجہاں ایک مشہور شاعرہ تھی۔ اُسکے بلند تخیل اور پاکیزگی کلام کو دیکھ کر بڑے بڑے عالموں کو حیرت ہوتی تھی۔ اکثر مناسب موقعوں پر فی البدیہ شعر اس قدر برجستگی کے ساتھ پڑھتی کہ جہانگیر بھی حیرت میں رہ جاتا۔ نورجہاں کے علاوہ جہانگیر کی دوسری بیگمات مثلاً حیات النساء۔ فنات النساء اور آرام جان بیگم بھی شاعری کرتی تھیں۔ ان کا کلام اکثر فارسی میں ہوتا تھا۔

شاہجہاں بادشاہ کی بیٹی جہاں آرا بیگم جن کو بادشاہ بہت عزیز رکھتے تھے اپنے وقت کی مشہور شاعرہ تھیں۔ ان کے شیریں اشعار کی چُست عبارت۔ انداز بیاں اور خوبصورت الفاظ اس بلا کے دلکش ہوتے تھے کہ سننے والا متعجب ہوتا تھا۔ قدرتی طور پر شاعری کا شوق اور طبیعت موزوں پائی تھی۔ آپ کے کلام میں مُبالغہ اور جھوٹ کی آمیزش نہیں پائی جاتی۔ آپ کا کلام یا تو اخلاقی رنگ کا ہوتا تھا یا مذہبی۔ کلام میں بیشتر حمد و نعت پائی جاتی ہیں جس سے آپ کی مذہبی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ مذہبی دلچسپی کے باعث کلام میں بھی مذہبی رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ آپ کے کلام میں عشقیہ غزلوں کا فقدان تھا۔ حُسن و عشق کے جھگڑوں سے آپ کو بڑی نفرت تھی۔ اور ایسی شاعری کو فضول اور بے نتیجہ خیال کرتی تھیں۔ لہٰذا کلام عشقیہ رنگ سے پاک ہے۔

روشن اختر محمد شاہ رنگیلے کی ملکہ قدسیہ بیگم کو بھی شاعری کا از حد شوق تھا۔ اُردو میں طبع آزمائی کی ہے۔ رعنائی تخلص کرتی تھیں۔ اُن کے اکثر اشعار اب بھی خاص و عام کی زبان پر ہیں۔ مثلاً ؎

ہم جانتے تھے آنکھ لگی دل کو سُکھ ہوا
کم بخت کیسی آنکھ لگی اور دُکھ ہوا

شہنشاہ اورنگ زیب کی چہیتی بیٹی زیب النساء بیگم بھی بڑی مشہور شاعرہ گذری ہیں۔ آپ کا تخلص مخفی تھا۔ دیوان مخفی جو آپ کا تصور کیا جاتا ہے فارسی کا ایک نادر اور اکمل نمونہ ہے۔

عالمگیر کی دختر بادشاہ بیگم کو بھی تخیلات کی بلندی اور موزوں طبیعت خدا نے عطا کی تھی۔ سخت سے سخت زمین پر بھی شعر اس قدر برجستگی اور عمدگی سے کہتی کہ حیرت ہوتی تھی۔ ایک دفعہ عالمگیر کسی جنگ میں شامل ہوا۔ جہاں اسے فتح حاصل ہوئی جب وہ میدان جنگ سے واپس لوٹا تو شعرائے دربار نے اس نصرت و کامیابی کے موقع پر اسکی خدمت میں قصیدے اور تہنیت نامے پیش کئے۔ بادشاہ بیگم نے ایک قطعہ موزوں کر کے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ عالمگیر کو اس بات کا مطلق علم

نہیں تھا۔ کہ بادشاہ بیگم نے شاعری شروع کردی ہے۔ نہایت غور سے قطعہ کو پڑھا رکھ دیا اور پھر اٹھا کر پڑھنے لگا۔ گو کہ اس کی ذہانت اور عقلمندی پر انتہا سے زیادہ مسرور ہوا۔ اور اُس کی طبع کی بلندی کو بہت سراہا۔ تاہم قطعہ کی پشت پر چند سطور بطور جواب قطعہ لکھ بھیجیں کہ نورِ چشم فن شاعری تو ایک بے نتیجہ فضول اور بیکار فن ہے اور تم جیسی شہزادی کی شان کے شایاں نہیں۔ یہ فن عام آدمیوں کیلئے باعث فخر ہو سکتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے نہیں۔

اِس واقعہ کے بعد بادشاہ بیگم نے کبھی بھول کر بھی شعر و سخن کا نام نہ لیا اور شاعری سے توبہ کی۔ ان شاعرات کے علاوہ دلی کی ایک مشہور خاتون حسینی بیگم امراؤ بھی میدان سخن میں طبع آزمائی کرتی تھیں۔ ان کے شعر مشہور ہیں۔ مثلاً ؎

باغ عالم میں جھڑ (؟) تھا اگر اپنوں سے ۔ پہلے ہی سبزہ بیگانہ بنایا ہوتا
اور جو منظور نہ تھی خانہ نشینی میری ۔ تو مجھے مسکن ویرانہ بنایا ہوتا

علاوہ ازیں لکھنؤ کی امیر بیگم آسمان بیگم رامپور کی بہو بیگم وغیرہ خوش شاعرات گذری ہیں۔ دورِ قدیم کی شاعرات کے بعد اب ہم اگر دورِ جدید کی شاعرات کے متعلق غور کریں تو ان میں سے بیشتر ایسی ہیں جو ہمارے ادبی رسالوں عصمت۔ ادیب۔ تہذیب وغیرہ کی معاون رہی ہیں یا معاون ہیں۔ ان کا کلام اکثر عصمت و دیگر زنانہ رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ کلام کے موضوع عام طور پر قومی۔ اتفاق۔ ماں باپ کے ادب کے فوائد۔ عورت سے خطاب وغیرہ ہیں۔ علاوہ ازیں محترمہ صفیہ شمیم ملیح آبادی۔ رابعہ پنہاں صاحبہ۔ نجمہ تصدق صاحبہ۔ خورشید اقبال صاحبہ ضیا۔ بلقیس خاتون جمال بریلوی وغیرہ بہت اچھی شاعرات ہیں۔ ان میں سے بعض نومشق ضرور ہیں لیکن بعض ایسی کہنہ مشق شاعرات بھی ہیں جن کے مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا کلام پختگی اور بلند پردازی کا بہت اچھا نمونہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ بعض خواتین تو ایسی بھی ہیں جو دوسروں کے کلام کی اصلاح بھی کرتی ہیں۔ اور اُن کو بجا طور پر اُستادی کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس امر کا اعتراف ہمیں کرنا ضروری ہے کہ بعض خواتین کے کلام میں ابھی بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے گو کہ انہوں نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی ہے اور اُردو کی خدمت کا حق پورا کر دیا ہے۔

دوسری خامی جو ہمیں دورِ جدید کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ خواتین ہر قسم کی شاعری نہیں کرتیں۔ اس کی تمام تر ذمہ داری مردوں پر عائد ہوتی ہے وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ خواتین کی شاعری کو پسند نہیں کرتے اور انہیں شاعری کی اجازت نہیں دیتے۔ یا اگر دیتے ہیں تو مشکل اتنی کہ وہ "خدا سب کا داتا ہے اور ایک ہے" یا "نہر پر چل رہی ہے پن چکی"۔ اس قسم کی چیزیں لکھیں جو یا تو مذہبی رنگ لئے ہوں یا گھر کی چیزوں سے متعلق۔ مردوں کی یہ ایک ایسی زبردستی ہے جسکی کوئی توجیہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ خیر۔ یہ کہنا تو سمجھ میں آبھی سکتا ہے کہ عورتیں بالکل شاعری نہ کیا کریں۔ کیونکہ بعض لوگ اسے صنف نازک کی توہین اور تحقیر سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا سمجھ میں نہیں آسکتا کہ خواتین شاعری تو کیا کریں لیکن خاص حدود کے اندر۔ تخیل کی دنیا میں حد بندی ایک نہایت ہی نامناسب بات ہے۔ اِس لئے بہنوں کو چاہیئے کہ وہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کریں۔ صرف چند ایک میں نہیں۔

دورِ جدید اور قدیم کی شاعری کا موازنہ اگر ہم کریں تو قدیم کلام میں ہمیں ایک ایسی پختگی نظر آتی ہے جو موجودہ کلام میں نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس تاریک دور سے جبکہ عورت پر علم کے دروازے بند ہیں۔ خواتین کچھ ہی عرصہ ہوا بیدار ہوئی ہیں۔

جس طرح ایک طویل عرصہ کی نیند کے بعد اعصاب پوری طور پر بیدار نہیں ہوتے۔ بلکہ رفتہ رفتہ اپنا کام شروع کرتے ہیں۔ اسی طرح خواتین کی شاعری بھی اپنے اولین مدارج طے کر رہی ہے۔ موجودہ زمانے میں ہمیں شاعرہ بہنوں کی سخت ضرورت ہے۔ ایسی بہنیں جو اپنے زمانے کی ترجمان ہوں جنکے نغمات نہ صرف ہمیں مسحور کریں بلکہ ان کا کلام قوم کے لئے بیداری کا پیغام ہو۔ شاعری اخلاقیات کا جامہ پہن کر بہت کم عرصہ میں وہ تعلیم دے سکتی ہے جو صدیوں کی چیخ پکار میں بھی ممکن نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاعری رُوپ بدل کر زندگی کے ہر شعبہ میں آئی اور اپنے نغمات سے دل کو موم بناتی گئی۔ ہماری شاعرہ خواتین بھی ذرا سی کوشش کے بعد شاعری سے جو نسا کام لینا چاہیں لے سکتی ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

گلشن شاعر بہارستان حسن پردہ پوش
منظر خونیں جہاں کا لالہ زار شاعری

دُولھا بھائی

از محترمہ صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی

دُولھا بھائی بھی ہندستانی کنبے کی ایک انوکھی ہستی ہیں سسرال میں انکی آؤ بھگت ان کی اپنی سالی یا سالیوں کے ذمے ہوتی ہے اور میکے میں ان کا آگا تاگا لیتے رہنا ان کے بہنوئی یا بہنوئیوں کی سالی یا سالیوں پر فرض ہوتا ہے۔

غرض یہ سسرال میں ہوں یا میکے میں ہر جگہ اپنی یا دوسروں کی سالی یا سالیوں کے حوالے رہتے ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ سسرالی سالیوں کے برتاؤ سے اور میکے کی بہنوئیوں والی سالیوں کے سلوک سرے سے ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ حقیقۃً تو نہیں ان دونوں قسم کی سالیوں کا کام ہے لیکن سسرال سالیوں پر نکتہ لض اور میکے والیوں پر خالص سسرالی سالیوں پر ناک بھوں چڑھائی نہیں کہ قیامت آگئی۔ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کبھی کسی شوخ نے منہ چڑھا دیا۔ کبھی کسی شریر نے ناک پر انگلی رکھ کے دکھا دیا۔ البتہ میکے والی کی اتنی مجال نہیں کہ یہ آنکھیں دکھائیں اور وہ سر نہ جھکائے۔

سب سے پہلے "دولھا بھائی" جب اپنی سالیوں میں براجتے ہیں تو ننانوے فیصدی ان کی یہ ہیئت ہوتی ہے کہ سر پر اگر ہندو ہوئے تو گڑیا اور مور مکٹ اور مسلمان ہوئے تو صرف پگڑ پھر اس "گڑ" یا "پگڑ" یا پر سرخ "کمتی جالی" کا "مکنا"۔ اس کے بعد سہرے کی دامن دراز "پرچھتی" جس سے خدا جھوٹ نہ بلائے تو دُلہن کے "ہات پاؤں پھیلائے" "لمبے لمبے کیس" بھی لجا جائیں۔ پھر گلے سے نارنجی یا پیلا "جاما" "زمین چاٹتا خاک پھانکتا لیٹا ہوا جس کے نیچے بے کلی کا سنگی مشروع کا ایک برکا یا جامہ مسلمان دولھا بھائی عام طور پر گھوڑے کی پیٹھ کے "اڈے" پر گود میں اٹھا کر بٹھائے جاتے ہیں۔ اور "سلواس" بروزن "رنواس" کی ڈیوڑھی کی طرف ڈھول تاشے اور مجیرے کی "کنا کنا جھم" کے ساتھ ہانک دیئے جاتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہی سالوں کی پلٹن ان کے "اڈا" چھوڑتے ہی گھوڑے پر حملہ بول دیتی ہے۔ یہ بیچارے دُودھ کے چھینٹوں اور چاولوں کے چھرّوں کی مار کھاتے سالیوں کے جمگھٹ میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے انھیں جو ہفت خواں طے کرنا پڑتا ہے وہ حضرت شیدا ریختی گو دریاباسوی کے لفظوں میں سُنیئے۔

دُولھا بھائی کی مندرجہ بالا تعمیر سسرالی "سلامے" سے ہوتی ہے ـــــ جوڑا جاما، جوتا پگڑی، خاک بلا سب کچھ وہیں سے آدھی رات کو آتا ہے۔ اور ان کے "میکے والے" انہیں "دھوبانچ" کر اچھے خاصے آدمی سے "کاٹھا تو" بنا کر اپنے گھوڑے پر چڑھا کر "سلواس" تک پہنچاتے ہیں ملاحظہ ہو۔ "بارہ سالے" سسرال سے آگئے ہیں۔ ایک ماں جائی دوسرے سے کہتی ہے:۔

فکر دولھا کے نہلانے کی بہن جلد کرو
سمدھیانے سے بھی لو آگیا جامہ سہرا

اچھا صاحب "دولھا صاحب" کا "نہان" آسمان کے نیچے تاروں کی چھاؤں میں اگر جاڑے ہوئے تو کانپتے سسراتے، گرمی ہوئی تو ہنستے مسکراتے شرماتے لجاتے تمام ہوا دولھا نے۔ اس مراد والی "ماں" اللہ آمین کرتی آگے بڑھیں اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بولیں:۔

یہ دُعا ماں کی ہے، پھولو پھلو آباد رہو
اپنی اولاد کا دیکھو یوں ہی بیٹا سہرا

ماں کے بعد چھوٹی بہن دوسری بہن سے کہتی ہے ؎

شور ہریالے بنے کا ہے رچی ہے شادی
باجی میراثنیں گاتی ہیں رنگیلا سہرا

وہ اس پیغام کو سنتے ہی آنکھیں ملتی ڈپٹا سنبھالتی دوڑ پڑتی ہیں۔ اور سالے گھر کے سامنے:۔

بہنیں یہ کہتی ہیں ڈالے ہوئے سر پر آنچل
نیگ دلواؤ مبارک تمہیں بھیّا سہرا

آنکھ بری رہے کہ دولھا بھائی کسی خیر خواہ مراثن کی آنکھوں میں "صفاچٹ" ہوتے ہوئے بھی یوں کھٹکتے ہیں کہ وہ اپنی بغل میں کھڑی ہوئی دوسری مراثن سے اپنی اطمینان انگیز کھٹک یوں ظاہر کرتی ہے ؎

ڈاڑھی مونچھیں تو بوا چاٹ گئی ہے دیمک
خیر سے چہرے پہ دولھا کے ہے پردا سہرا

اب دولھا بھائی دروازے پر تیار "گھڑاڈے" کی طرف لے جائے جانے والے ہیں۔ اور آنکھوں کی "ٹٹی" ہٹانے میں مشغول ہیں۔ اس پر ایک بوا ان کی انگلیوں میں شادی کا چھلا یوں پہناتی ہے ؎

اپنے ہاتوں سے جو سر کا تا ہے دولھا سہرا
انگلیوں میں بوا ان جاتا ہے چھلا سہرا

خیر خدا خدا کر کے سارا جلوس "ڈھوتو ڈھوتو" "کرتا، اتارتا" "پھلجھڑیاں، چرخیاں بان" چھوڑتا "سلواس" جا پہنچتا ہے۔

صبح ہوتے "گٹھ بندھن" کے بعد جب "نقلی دولھا بھائی" "اصلی دولھا بھائی" بنکر تیار ہوتے ہیں تو ؎

گالیاں سمدھیں سُناتی ہیں موٹی موٹی
مہندی کہتے ہیں کسے ہوتا ہے کیسا سہرا

پھر اس خلفشار کے بعد رخصتی کے وقت ؎

ہے کہیں آرسی مصحف کہیں سہرا سہرا
یوسفی لائی ہے قرآں تو زلیخا سہرا

اس رسم کے "مُنہ موڑنے" دُولھا بھائی اور دُلہن آئینے میں ایک دوسرے کا مُنہ دیکھ پالکی کی رہبری کرتے "بیٹھے" آتے ہیں۔ یہاں استقبالیہ کمیٹی کی بہنیں چلاتی ورتی ہیں ؎

پالکی ڈیوڑھی پہ آخر کو بہن آ ہی گئی
تم سنبھلتی ہی رہیں لے لو دُلہن آ ہی گئی

اتنی منزل مار کر ابھی سانس بھی نہیں لینے پاتے کہ شامتِ تمام "چوتھی" کی انتظار ہو کر پھر دولھا بھائی کو "سواس" گھیرے جاتا ہے تو وہاں یہ عالم نظر آتا ہے ؎

سالیاں تاک میں پاپوش کی دالان میں ہیں
اور نوشاہ کی آنکھوں پہ ہے پردا سہرا

یہ تو ہوئی دولھا بھائی کی تعمیری کیفیت" دولھا بھائی" بنے اور خوب بنے لیکن ہی نئے آدمی کے پیرشدی"۔

کہتے ہیں کہ جب نوشیرواں اپنا محل بنوا چکا تو اُس نے اپنے دربار کے "چلتے پھرتے" بڑے بڑے "کھمبوں" کو بلا کر اس کی سیر کرائی اور پوچھا کہ اس عمارت میں کوئی "اونچ نیچ" تو نہیں؟ سبھوں نے کونے کونے دیدے دوڑانے کے بعد دبی زبان بڑھیا کے جھونپڑے اور اُس کے چولھے کے دھوئیں سے کجلائی دیواروں کی طرف اشارہ کردیا۔ اسی طرح ایک سوکھی ساکھی سالی اپنے بھاری بھرکم گرانڈیل دُولھا بھائی کی طرف اشارہ کرکے فرماتی ہیں ؎

تم کھو گئی ہو ہنستی ہے دُولھا بھائی کو موئی
اے بہن کھاتے ہیں کس چکّی کا یہ پیسا ہوا

—— کہ ان پر محنت کا مُٹاپا پھٹا پڑتا ہے۔

ایک بڑے پُرانے" بڑے میاں "کو جو بڑ بعنس" لگا تو گھبرا کے پھر دولھا بھائی" بن گئے۔ سالیاں بوڑھے کی ہوں یا جوان کی، ہوتی سالیاں ہی ہیں۔ بھلا وہ کیوں چوکنے لگی تھیں۔ بھری برات میں بول اُٹھیں ؎

نوشے میاں تمہارے تو بیاہ کے دِن ابھی نہ تھے
سمٹے ہوئے ہو شرم سے مُنہ پہ یہ جھریاں نہیں

ہوں۔ کبھی کبھار سالیوں کو آنکھ والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دیکھئے تماشا ؎

تفنّع سہرے کو نہیں مانتیں اس کی آنکھیں
کیا دکھاتا ہے اِن آنکھوں کو یہ اندھا دیکھیں

ایک نرے "بدھو" دولھا بھائی کو جو جورو کے فراق نے بوکھلایا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ، گھڑی دیکھی نہ ساعت، مقررہ دن سے دو دن پہلے ہی ڈولی، اکّا، پالکی، ہاتھی، موٹر نہ جانے کیا کیا لیکر سسرال پر چڑھائی کردی۔ ساس نے سالی کو ہنکار دیا۔ پھر کیا تھا انہوں نے اللہ ہی سے للکارا ؎

آئے ہو جورو کو تم رخصت کرانے بدھ کے روز
یا تو منگل کو تمہیں آنا تھا یا اِتوار کو

سُبحان اللہ یہ تو بدھ سے بھی زیادہ مُبارک دن بتائے۔

ایک شرمیلے اللہ والے دُولھا بھائی جو سالیوں کے حملوں سے پیچھا چھڑا کر "بنی جان" کے کمرے میں داخل ہوئے تو "ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را" کا چلّا کھینچ لیا۔ اب دن نکلتے ہیں نہ رات۔ یا میرے اللہ یہ کیا ہوا۔ سالیاں انتظار کرتے کرتے جب تھک گئیں تو سارے گھر کو یہ رائے دے دی ؎

حجرے میں پاؤں توڑ کے بیٹھے ہیں دُولھا بھائی
کلّے دینے اب انہیں چلتا کرے کوئی

کہتے ہیں کہ مچھلی کے بھی پِتّا ہوتا ہے۔ آخر بعضے بعضے دولھا بھائی بھی "نہ راہ رفتن نہ جائے ماندن" کے موقع پر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اور سالیوں کو ایسی ایسی آڑی ترچھی سُناتے ہیں کہ سننے والیاں تراہ تراہ کرنے لگتی ہیں۔ اور دونوں جھتوں پر یوں پھٹ پڑتی ہیں ؎

نہ ایسی سالیاں دیکھیں نہ ایسے بہنوئی
ڈھکی مندی بھی نہیں اب بے حجاب ہوتی ہے

سالی نے دولھا بھائی کو حیران کرنے کے لئے بہن سے آرسی لیکر اپنے انگوٹھے میں ڈال لی اور ہات چمکا چمکا کر دولھا بھائی کو اپنا "دست نگر" بنا لیا۔ جب دیکھا کہ حضرت کی آنکھ پھر پھر کر اسی ستارے پر پڑتی ہے تو انگوٹھا دکھا کر بولیں ؎

آرسی ہے تمہاری جورو کی
اسے کیا تک رہے ہو حیرت سے

ہو سکتا ہے کہ دونوں بہنوں کی آرسیاں ایک سی ہوں۔ اور یہ "بدحواسبنت"

جھینپو قسم کے دولھا بھائی کی خاموشی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو انکے ہونٹ یوں چھیڑے جاتے ہیں ؎

اور کچھ تم سے نہیں ہونے کا دولھا بھائی
اوڑھنی اوڑھ لو کھیلا کرو گڑیاں ہم سے

پھر بھی نہیں "سنکتے" اور بھوٹتے تو کان کے پاس ہونٹ لا کر کانا باتی "گر" کرتی ہیں اور فرماتی ہیں ؎

گونگے بہرے بن کے یوں سسرال میں مت بیٹھیے
بھولے بھالے دولھا بھائی کچھ تو غوغاں کیجیے

سالی کی اس دلیہی پر جو ذرا کسمساکر سنبھلتے ہیں تو دوسری طرف سے آواز آتی ہے ؎

دو گز دولھا بھائی کے منہ سے بہن ہٹا رومال
خدا بچائے یہ گونگا تو بولتا بھی ہے

کہیں سالیوں نے منہ چڑھا دیا ہوگا بس اس پر دولھا بھائی نے بھی ذرا لے کو منہ پھیلایا ہوگا۔ تڑاخ سے کسی نے رسید کی ؎

موئے پھیلا کے منہ کیوں سالیوں پر دوڑ پڑتا ہے
ارادہ تو نہیں ہے مرڈے کچھ کاٹ کھانے کا

ہندستان بھی طُرفہ ملک ہے۔ بسااوقات لڑکے کے دوران تعلیم ہی میں اُسے دولھا بھائی بنا دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ سالی کے منہ سے سُنئے ؎

ننانوے کے پھیر کو اب چھوڑیں دولھا بھائی
سنتی ہوں میں بگڑ گیا پرچہ حساب کا

یہ تو کہئے حضرت سامنے نہیں ورنہ اس کسر پر ایسے ایسے جوڑ توڑ کے فقرے کسے جاتے کہ ایک میں ننانوے ملانے لگتے۔

دولھا بھائی نے خفگی کی آڑ پکڑی ہے تو نیا اس سے پیچھا چھوٹ گیا۔ سالیاں دوڑ گئیں۔ حاشا وکلّا وہ تو اور منہ چڑھ کے کہہ رہی ہیں ؎

اس قدر نخرے جو تم کرتے ہو دولھا بھائی
اے دلہن جان سے اپنی نہ خفا ہو جانا

بس پر وہی ناراضی و تنک مزاجی کا اظہار کیا گیا تو "بیاہی نیا ہی" کے منہ سے سننا پڑا

دلہن کی لات کھاکر لاٹ صاحب بنکے آئے ہیں
ذری سالی تو سنئے دیکھے وہی دولھا میاں ہوتا

یعنی جوڑے جامے والے گپ چپ "ٹکر ٹکر دیدم و دم نہ کشیدم" والے اس پر بھی نہ چونکے تو ایک نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور ہونٹوں کی طرف انگلی بڑھا کر بڑی ادا کے ساتھ کہا ؎

وہ ہونٹ ہلتے ہیں وہ ناک پہ ہنسی آئی
یہی تو خیر سے تیور ہیں مسکرانے کے

فرض کر لیجئے کہ چوتھی کی شام ہے۔ دولھا بھائی کے منہ پر اس وقت نہ مقنع ہے نہ سہرا۔ چہرے کی راہ کے یہ اٹھنگے تو برات کے ساتھ رخصت ہو جاتے ہیں بس اس وقت تو ذات شریف "بھاڑ" سا منہ کھولے "سلواس" میں آ کھڑے ہوئے ہیں۔ سالیوں کی فوج استقبال کو آگے بڑھ رہی ہے۔ دولھا بھائی کو برات کے دن کی پھبتیاں مثلاً "اوئی بہن یہ مردوا تو منہ پر گھونگھٹ کاڑھ کر آیا ہے" یا یہ کہ شاید پردہ نشین "ہے" وغیرہ یاد تھیں۔ فوراً لشکر کو مخاطب کرتے ہیں کہ آؤ! آؤ!! آج ہم بے نقاب ہیں کچھ رُو نمائی بھی تم سے نہیں مانگتے۔ دیکھنا ہو تو کھل کر یہ منہ دیکھ لو۔ جناب یہ ہیں سالیاں عمروں میں کہیں ان کو کھل کھیلنے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ بندزبان جب کھلتی ہے تو ہرن سے زیادہ چوکڑیاں بھرتی ہے۔ دولھا بھائی کی اس گفتگو پر بے جھجک ارشاد ہوا ؎

دولھا بھائی "ایسے اُجڑے منہ کو یوں کیا دیکھنا
اوڑھ کر آتے اگر تم بھی اوڑھنیا، دیکھتے

دیکھ لو تمہاری چوتھی والیاں سب اوڑھنیاں اوڑھ کر آئی ہیں اب ان میں ایک منہ بھی ایسا نہ بچے گا جسے ہم گھونگٹ، پلو، آنچل، نقاب سرکا کر پرکھ نہ لیں۔ دل تو چھپی چیز کا کھوجی ہے۔ ایسے اُجڑے اور بے اوڑھنی والے چہرے کو کیا دیکھیں۔ اس پر جو دولھا بھائی کچھ "حق بق" نظر آئے تو ایک چنچل نے بڑھ کر الاپا ؎

دولھا بھائی کیا ہوا وہ ساز باز
کچھ طبیعت آپ کی ناساز ہے

ایک مینڈک وضع "دولھا بھائی" جو سسرال کے تخت پر ڈٹ گئے تو اُٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ لطف یہ کہ اشاروں کنایوں میں جتنے اُٹھنے بیٹھنے، چلنے، پھرنے، ٹہلنے، چہل قدمی کرنے کے فوائد سمجھائے جاتے ہیں۔ یہ اور پاؤں پھیلائے جاتے ہیں۔ آخر ایک "چمکو" سالی نے آ کر قاضی سے زیادہ بلیغ لہجے میں "کھڑے سے بڑے ہو بھائی کھڑے سے بڑے" کا خطبہ پڑھ دیتی ہیں ؎

سالیاں کرتی ہیں بوچھاڑ اُٹھو دولھا بھائی
کوئی کہتا نہیں مینڈک سے اُچھلنے کے لئے

گویا خود سالی نہیں ہیں ۔ دوسری یوں ٹانگ توڑتی ہیں ؎

دُولھا بھائی دہی لے سکتا ہے تیمور کا تخت
توڑ کر پاؤں جو پہلے ہی سے لنگڑا ہو جائے

یہ تو آپ اچھی طرح جانتے ہونگے ؟ اور جانتے کیوں نہ ہونگے ! آخر آپ پر بھی بیتی ہوگی ؟ خدانخواستہ اگر اب تک ایسا سنجوگ نہیں آیا تو اب آئیگا اطمینان رکھئے۔

ہاں تو دُولھا بھائی کی خوش سلیقہ سالی نے مزیدار گلوری بنا کر دی ہے۔ وہ بیٹھے بکری کی طرح بکر بکر چبا رہے ہیں ۔ یہ خبر نہیں کہ اس آفت کی پڑیا نے مُنہ میں کیا کچھ گل کھلائے ہیں بس مُنہ کی کل ہے کہ چلی جا رہی ہے ۔ سالی بھلی سی اُٹھیں آئینہ لے آئیں ۔ یا توں ہاتوں میں دولھا بھائی کے آگے رکھدیا ۔ یہاں پان کے مزے میں کسے خبر کہ اسکا کیا مطلب آخر خوش گفتار کو خود مُنہ پھوڑ کر کہنا پڑا ؎

دولھا بھائی ذری آئینہ اُٹھا کر دیکھو
جس سے مُنہ لال نہ ہو گا مِس ہو وہ پان نہیں

آئینے پر جو نظر جاتی ہے تو شفق کی جگہ کالی دھواں دھار مِسّی کی گھٹا محیط ہے "ہات تیرا ستیاناس ہو ۔ آخ تھو !"

اس آخ تھو کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ؎

مُنہ کے بل دیکھ کے بیڑا گرے دولھا بھائی
لاکھ اُفتادیں ہیں اس سے بڑی اُفتاد نہیں

سالی بیڑا یا گلوری تو ہے نہیں کہ چلو تھوک دیا یا پھینک دیا ۔

یہ گلچھپ دیکھکر بوڑھی ساس کے دل میں بھی گدگدی اُٹھی ۔ داماد کی طرفداری کر کے شک کا دہانہ کھول کر یوں تڑ بڑا دیا ؎

اچھا ہے دُولھا بھائی اُڑا دیں ترے دھوئیں
بھر چٹکی مِسّی جھونک دی مردار پان میں

عورت سے اُلجھنا مرد کا کام نہیں ۔ ناکام دولھا بھائی سارا غصّہ پان کی پیک سمجھ کر پی گئے ۔

ساس کے "کڑکنے" نے کچھ ڈھارس بندھا دی ۔ مِسّی نے ہونٹ سی لئے ۔ مگر تیور پھیکے پڑگئے ۔ اس پر یوں نمک چھڑکا گیا ؎

ذری دُولھا بھائی کے تیور تو دیکھو
کہے دیتے ہیں کوئی بولے نہ ہم سے

دولھا بھائی سسرال سے خفا ہیں ۔ اب نہ وہاں خود جاتے ہیں نہ دُلہن جان کو اجازت ہے کہ وہ جائیں ۔ سالیاں بڑی جوڑ توڑ والیاں ہوتی ہیں ۔ کھٹ سے دولھا بھائی کے "میکے" اپنے "سمدھیانے" اور بہن کی سسرال پہنچ جاتی ہیں ۔ اور بہت کچھ چنیں چناں کے بعد بہن کو ماں کے گھر روانہ کر دیتی ہیں ۔ لیکن ابھی پوری مہم تھوڑے سر ہو جاتی ہے ۔ حکم ہوتا ہے کہ دولھا بھائی اب تم بھی خیر سے سسرال سدھار دو تو بندی گنگا نہائے ۔ دولھا بھائی کہتے ہیں کہ میں تو یوں پانوں گھسیٹتا نہیں جا سکتا مطلب یہ کہ اپنی سواری میں مجھے بھی بٹھائے چلو ۔ آخر حرج ہی کیا ہے ! سالی اس کا واک ٹٹو کو یوں سیدھی راہ لگا دیتی ہے ؎

یوں جو سسرال کی جانب نہیں اُٹھتے کے قدم
پالکی ہی میں چلے جاتے دُلہن جان کے ساتھ

میرے پیش کردہ اشعار میں سے اکثر پر آپ کو آپ بیتی کا گمان ہوا ہوگا ۔ کاش اس وقت جتنی لمبی چوڑی میری زبان ہے اس کی آدھی بھی اگر میں وسیع النظر ہو جاتی تو بعض شعروں پر آپ کے کان کھڑے کرنے کا تماشا دیکھکر اندازہ لگاتی کہ شاید اکبیا باکمال ہے ۔ اُس نے کتنا گہرا ہماری گھریلو زندگی کا مطالعہ کیا ہے ۔ شاید ہی ہماری سوسائٹی کا کوئی ایسا پہلو ہوگا جس پر اُس نے روشنی نہ ڈالی ہو ۔

میر انیس کہہ گئے ہیں کہ ؎

دُنیا جسے کہتے ہیں بلا خانہ ہے
پامال ہے جو عاقل و فرزانہ ہے
مابین زمین و آسماں یوں ہیں ہم
جیسے دو آسیا میں ایک دانہ ہے

اگر یہ رُباعی میری رہبر نہ ہوتی تو انہیں اشعار کو جو دولھا بھائی کا قصیدہ بنے ہوئے ہیں ۔ صرف انہیں کا نہیں ساری قوم کا مرثیہ بنا دیتی ۔ لیکن جب یہ ثابت ہے کہ یہ دُنیا بلا خانہ ہے اور اس میں وہی پامال ہے جو عاقل و فرزانہ ہے اور پامال بھی کہاں ۔ زمین و آسماں کی چکّی کے دونوں پاٹوں کے بیچ ؛ تو پسے ہوؤں کو پیسنا کون سی بہادری ہوتی ۔

یاد رکھنا چاہیے کہ "دولھا بھائی" کا کردار جب سالیوں کی جنگ میں ہر جگہ پسپا نظر آتا ہے ۔ تو دُنیا جو بلا خانہ ہے جس میں سالیوں سے زیادہ بلائیں بھری پڑی ہیں ، ان سے کیونکر نبٹے گا ؟

دیوؤں کے مُلک میں

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

اشرف صبوحی صاحب ادیب کے ناظرین میں غیر معروف ہیں۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ صبوحی صاحب عموماً ساقی میں لکھا کرتے تھے۔ یہ نوجوان اور اچھا لکھنے والوں میں ہیں۔ دہلی کے قدیم شریف خاندان کے فرد ہیں۔ عورتوں کی زبان اور محاوروں کے کاورے پر دسترس رکھتے ہیں۔ اگر مضمون سے انکا نام حذف کردیا جائے تو بالکل ایسا معلوم ہوگا کہ کوئی ضعیف وقت کی بڑھیا اپنی جوانی کے عیش اور مسرتوں کے لُٹ جانے کا سوگ کر رہی ہے۔

صبوحی صاحب کی تجویز پر ادارہ نے فیصلہ کیا ہے کہ "ادیب" کا ایک صفحہ بچوں کیلئے بھی وقف کردیا جائے چنانچہ اس مرتبہ Gulivers Travels کے باب ثانی میں سے کچھ حصہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ صبوحی صاحب یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔ (فصیح الدین احمد)

بالشتیوں کی سرزمین سے واپس آنیکے بعد گلیور کو پھر سیر و سیاحت کی دُھن سمائی چین سے بیٹھے بیٹھے بلبلا اٹھا کہ دُنیا کی ہوا کھانی چاہیئے پچھلے سفر کی تکلیفیں عجائبات دیکھنے کے شوق میں بھول بسر گئی تھیں۔ تیاری کردی۔ جون کے مہینے کی بیس تاریخ تھی کہ حضرت "اَیڈونچر" (Adve-nture) نام جہاز پر سوار ہوکر چل پڑے۔ آدھا رستہ بڑے مزے میں نہایت امن و آسائش کے ساتھ طے ہوا۔ نہ موسم نے آنکھیں بدلیں نہ ہوا اور پانی کو کلیلیں اٹھیں لیکن تقدیر تو کچھ اور تماشے دکھانے والی تھی۔ دو چار مہینے کے بعد یکایک طوفان نے آگھیرا۔ اور طوفان بھی ایسا آیا کہ جہاز کو تنکے کی طرح اُچھال کر سیدھے رستے سے ہٹا کر ایک نامعلوم سمندر میں جا ڈالا۔

انجان سمندر تھا۔ راستے کی پہچان نہ تھی۔ ڈانواڈول پھرتے پھرتے پورا ایک سال ہوگیا نہ ساحل کا پتہ لگتا تھا نہ خشکی سے نگاہیں دو چار ہوتی تھیں۔ ملاح مستولوں پر چڑھ کر دیکھتے اور مایوس ہوکر اُتر آتے۔ اسی پریشانی کے عالم میں ایک روز جہاز کے کسی لڑکے نے مستول پر چڑھے چڑھے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پکار کر کہا کہ "مجھے وہ اُدھر خشکی نظر آئی ہے" ناخدا نے جس طرف لڑکے نے بتایا تھا جہاز موڑ دیا۔ دوسرے دن سب کو ایک میدان سا دکھائی دیا۔ یہ سرزمین بالکل انجان تھی۔ نہ کوئی اس کا نام جانتا تھا نہ اس طرف کبھی کسی کو آنے کا اتفاق ہوا تھا۔

جہاز میں کھانے کے سامان کی تو کچھ کمی نہ تھی لیکن پینے کا پانی ختم ہوچکا تھا۔ کپتان نے یہ سوچ کر کہ اور کچھ نہ سہی میٹھا پانی تو یہاں سے لے ہی لینا چاہیئے۔ کوئی ایک درجن ملاحوں کو حکم دیا کہ جہاز کی بڑی سے بڑی کشتی میں بیٹھ کر جائیں۔ اور اگر میٹھا پانی مل جائے تو لے آئیں۔ چونکہ وہ علاقہ ویران سنسان نظر آتا تھا اس لئے ساتھ جانیوالے آدمیوں کو یہ ہدایت بھی کردی کہ اپنے ہتھیار ساتھ لے لیں۔ ممکن ہے خوفناک درندوں یا وحشی انسانوں سے مُٹھ بھیڑ ہوجائے۔ گلیور صاحب کے دل میں بھی کلیل اُٹھی۔ کپتان سے کہنے لگے "اجازت ہو تو میں بھی ان ملاحوں کے ساتھ چلا جاؤں۔ ذرا ہاتھ پاؤں بھی کھل جائینگے اور عجب نہیں کہ میری معلومات میں بھی کچھ اضافہ ہو۔ یہ سرزمین صورت سے کسی قدر انوکھی معلوم ہوتی ہے۔" کپتان کا کیا بگڑتا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر اجازت دے دی کہ اپنی ذمہ داری پر جاسکتے ہو۔ اگر کوئی حادثہ پیش آیا تو مجھ پر کوئی دوش نہیں۔"

کشتی پانی میں اُتار دی گئی۔ بارہ تیرہ ملاح اور میاں گلیور جا بیٹھے۔ دو منٹ کے بعد کشتی ساحل کی طرف روانہ ہوئی۔ چلے جا رہے تھے۔ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ خشکی پہ اُتر کر انہوں نے بڑے غور سے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ نہ کوئی ندی دکھائی دی، نہ کہیں تالاب یا چشمہ۔ نہ آبادی کے نشان پائے۔ کنارے کنارے دُور تک پھرتے اور میٹھا پانی تلاش کرتے رہے۔ کبھی اِدھر جاتے کبھی اُدھر۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے لیکن وہ عجیب قسم کی سرزمین تھی کہ انسان تو انسان کوئی پانی پینے والا حیوان بھی وہاں نہیں بستا تھا۔ جو کنواں، باولی، تالاب، جوہڑ، نہر، نالہ کچھ تو ہوتا۔

یہ لوگ پانی کی جستجو میں تھے۔ اور گلیور اپنی الگ ہی دُھن میں۔ ان سے پھٹ آپ ایک دوسری طرف ہولئے۔ چلتے جاتے اور دائیں بائیں نگاہیں بھی ڈالتے جاتے کہ کوئی نئی چیز نئی صورت نظر آئے۔ وہاں خاک کے تودوں اور چھوٹے چھوٹے ٹیکروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

بالآخر پھرتے پھرتے میاں گلیور تھک کر چور ہوگئے۔ اور آگے جانا بیکار سمجھا تو واپس ہوئے اور کشتی کی طرف آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ چلتے چلتے ایک موڑ پر آئے جہاں سے سمندر صاف نظر آتا تھا۔ یکایک آنکھ جو اُٹھی تو کیا دیکھتے ہیں تمام ساتھی کشتی میں بیٹھ کر چپو مارتے چلے جا رہے ہیں۔ جیسے کوئی جان کے خوف سے بھاگتا ہے۔ حضرت کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ کہ یہ کیا غضب ہوا؟ مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔ گھبرا کر آواز دینا ہی چاہتے تھے کہ "خدا کے بندو! مجھ کو کیوں چھوڑے جاتے ہو۔ ٹھیرو مجھے بھی تو لے لو" اتنے میں ایک پہاڑ جیسے دیو کو دیکھا۔ سمندر کو کھوندتا بڑی تیزی کے ساتھ اُن کے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ اس کا قد اللہ کی پناہ! سمندر کا پانی اُس کے گھٹنوں سے نیچے ہی نیچے تھا۔

(باقی آیندہ)

"نشانی" کی کہانی

قسمت ہمیشہ نرالے کھیل کھیلتی رہتی ہے اور انسان اسکے اشاروں پہ ناچنے کیلئے مجبور ہے !!

لاہور کے ایک قریبی گاؤں دیسو کے چودھری کا لڑکا اجیت گریجویٹ ہونیکے باوجود روزگار حاصل نہ کرسکا۔ اور بیکار مباش کچھ کیا کر، کے مصداق آوارہ گردی میں مبتلا ہوگیا۔

ماں باپ اُسے باروزگار دیکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ قرض ادا کیا جائے جو اسکی تعلیم کی خاطر اُٹھایا گیا تھا۔ مگر اجیت آوارگی میں کمال حاصل کر رہا تھا۔ ادھر ساہوکار کے تقاضے برداشت سے باہر ہو رہے تھے کہ قسمت کے سنگین ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ساہوکار کی بیوی اجیت کی ماں سے ملی اور طے پایا کہ اجیت اور ساہوکار کی لڑکی پارو کی شادی کر دی جائے اس طرح قرضہ بھی ختم ہو جائیگا اور اجیت کی حالت بھی سدھر جائیگی لیکن اجیت نے یہ تجویز سنتے ہی انکار کر دیا۔ وہ پارو سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔ اپنی شرارتوں کے بدلے میں پارو سے پٹ کر اسے بہن کہہ چکا تھا اور جب ماں باپ نے سختی کے ساتھ کہا تو وہ گھر سے بھاگ نکلا اور ایک درخت کے نیچے بیٹھکر قسمت آزمائی کے لئے کسی طرف چل دینے کی بات سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے اُسے نیند آ گئی۔

لاہور کے ایک بڑے رئیس کا صاحبزادہ رنجیت کمار قسمت کا دھنی تھا۔ حسین فرمانبردار بیوی، دولت کی فراوانی، عیش و عشرت کے سب سامان موجود تھے۔ دن عید اور رات شب برات سے کم نہ تھی۔ زندگی مزے سے گذرتی تھی۔ اندرا اس پر جان و دل سے فدا تھی۔ اور رنجیت کمار کو موٹر سائیکل کی دوڑ میں حصہ لینے کا جنون تھا۔ اسی بات پر اکثر دونوں میں ٹھن جاتی تھی۔ اندرا اسے خطرناک کھیل سمجھتی تھی۔ مگر رنجیت کمار کی شکل و شباہت بالکل دیسو گاؤں کے اجیت سے ملتی جلتی تھی۔ موٹر سائیکل کی دوڑ کو تفریح کا بہترین ذریعہ سمجھتا تھا۔ ایک دن وہ اپنی موٹر سائیکل، دوسرے دوستوں کی موٹر سائیکلوں سے آگے نکال لے جانے کیلئے پوری رفتار سے جا رہا تھا۔ کہ ایک پتھر سے ٹکرا کر گر پڑا۔ اور گرتے ہی بیہوش ہوگیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں قریب ہی اجیت سو رہا تھا۔ قسمت نے قہقہہ لگایا ! رنجیت کمار کے دوستوں نے اجیت کو رنجیت کمار سمجھکر اُٹھایا۔ اور شہر کے ہسپتال میں پہنچا دیا۔ اجیت لاکھ چیخا چلایا کہ وہ اچھا بھلا ہے اسے کوئی تکلیف نہیں۔ اور وہ رنجیت کمار نہیں اجیت ہے۔ مگر رنجیت کے دوستوں اور ڈاکٹروں نے سمجھا کہ چوٹ لگنے سے اسکے دماغ کی حالت بدل گئی ہے۔ اسے اپنی پچھلی زندگی بھول گئی ہے یہاں تک کہ اس نے اپنی پیاری بیوی اندرا کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔

اُدھر گاؤں والوں نے رنجیت کمار کو اجیت سمجھکر اسے اجیت کے گھر پہنچا دیا اور جب انہوں نے سنا کہ رنجیت کمار کہتا ہے کہ وہ لاہور کا ایک بڑا رئیس ہے۔ اُسکی بیوی بھی ہے تو سب گھبرائے کہ بیچارے اجیت کو کیا ہوگیا ہے کسی نے کہا اسے درخت کے نیچے سوتے ہوئے بھوت چمٹ گیا ہے بس اب بھوت اُتارا جانے لگا۔ رنجیت کمار بہت چیخا۔ لیکن بھوت اُتارنے والے اسے بھوت کی طرح چمٹ گئے! نہ جانے اس کے ساتھ اور کیا سلوک ہوتا۔ کہ ایک پڑھے لکھے شخص نے کہا اسے بھوت نہیں چمٹا۔ اس کا دماغ پھر گیا ہے۔ اسے لاہور کے پاگل خانے میں بھجوا دیا جائے ورنہ سارے گاؤں والوں کو تکلیف ہوگی۔ چنانچہ رنجیت کمار پاگل خانہ میں بند کر دیا گیا۔

اندرا اور ان کا خاندانی ڈاکٹر، ڈاکٹر گنیش اجیت کی بیرخی سے سخت پریشان تھے وہ کسی طرح یہ ماننا ہی نہ تھا کہ یہ گھر اسکا اور اندرا اسکی بیوی ہے۔ انہوں نے لاکھوں جتن کئے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی اور آخر کار ڈاکٹر گنیش نے اندرا سے کہا اسے اسکے حال پر چھوڑ دیا جائے کچھ دنوں کے بعد وہ خود ہی ٹھیک ہو جائیگا اجیت کو من مانی کرنے کی اجازت مل گئی۔ ایک دن آوارہ گردی کرتے ہوئے وہ سیٹھ کستوری لال بینکر کی بہن لیلا سے دوچار ہوئے تو اسیر محبت ہو گئے مگر لیلا نے جسکو اپنے بھائی کی طرف سے ہر قسم کی آزادی حاصل تھی اسکی کوئی پروا نہ کی۔ لیلا کی دو چھوٹی بہنوں سنتوشی اور راجی کو اجیت کی حالت پر رحم آگیا اور انہوں نے دونوں کی ملاقات کا ذریعہ نکال دیا۔ اجیت کو اظہار محبت میں کئی بار ناکامی ہوئی لیکن آخر کار وہ لیلا کو یہاں تک کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ گھر سے بھاگ نکلے اور دونوں نے شادی کر لیں۔ ڈاکٹر گنیش مدت سے آس لگائے بیٹھا تھا لیلا اس سے شادی کر لیگی۔ لیکن جب اجیت اسے لے اُڑا تو وہ پریشان حال کستوری لال کے پاس پہنچا۔ ادھر اندرا کے نوکر رحمان کو بھی معلوم ہوا کہ اس کے صاحب بہادر لیلا کو لے اُڑے ہیں۔ اجیت نے لیلا سے شادی کر لی اور اسکو گرین ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔ اسی دن رنجیت کمار بھی پاگل خانہ سے بھاگ نکلا پولیس اسکا تعاقب کرنے لگی ادھر ڈاکٹر گنیش اندرا اور کستوری لال بھی اجیت کی تلاش میں نکلے۔ گرین ہوٹل کے قریب ہی حجام کی دکان تھی پاگل خانہ سے بھاگا ہوا رنجیت کمار اسمیں گھس گیا۔ اجیت بھی اسی دکان میں بال بنوا رہا تھا۔ باہر نکلا تو پولیس نے دھر لیا اور اسے پاگل خانہ میں پہنچا دیا۔ رنجیت جان بچانے کیلئے گرین ہوٹل میں پہنچا تو لیلا اس سے بگڑ گئی اتنے میں ڈاکٹر گنیش وغیرہ بھی وہاں پہنچ گئے ہوٹل میں فساد ہوتے دیکھکر منیجر نے سب کو پولیس تھانہ میں بھیجدیا وہاں لیلا اور اندرا گتھم گتھا ہو گئیں۔ ڈاکٹر گنیش چاہتا ہے کہ رنجیت کمار کو عمر بھر کیلئے پاگل خانہ ہو جائے تاکہ وہ لیلا سے شادی کر سکے۔ اُدھر اجیت پاگل خانہ میں ٹکریں مار رہا ہے ادھر لیلا اور اندرا ایک دوسرے کو نوچ رہی ہیں نشانی کا یہ عروجی مقام ہے۔ لیلا کس سے ملی؟ اجیت کا کیا ہوا؟ یہ سب پردۂ سیمیں پر دیکھئے !

فلمی خبریں

از فصیح الدین احمد

(۱) بمبئی ٹاکیز "قسمت" جوبلی ٹاکیز دہلی میں چل رہا ہے۔ اشوک کمار اور ممتاز شانتی نے اس فلم میں کام کیا ہے۔

(۲) فضلی برادرز "مہندی" جس میں چندرموہن۔ سردار اختر اور سبیتا دیوی کام کر رہی ہیں تیار ہو گیا ہے۔ دوسرے فلم "بھائی بہن" کی شوٹنگ بھی شروع ہونے والی ہے۔

(۳) پنچولی آرٹ پکچرز کے فلم "پونجی" میں سنا ہے کہ چار بڑی حسین لڑکیاں کام کر رہی ہیں۔ تین کیرکٹر ایکٹر بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔ یہ لڑکیاں راگنی۔ بے بی اختر۔ منورما اور مس پانڈے ہیں اور تین کیرکٹر ایکٹر اسمٰعیل۔ اجمل اور جی۔ این۔ بٹ ہیں۔ اس فلم کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ یہ بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہوگا۔

(۴) ہٹری ڈسٹری بیوٹرز کا فلم "شاہی فقیر" شمالی ہندستان میں بہت کامیاب ہوا۔

(۵) شالیمار پکچرز کا فلم "پریم سنگیت" جس میں مینا اور جے راج نے کام کیا ہے۔ عنقریب ریٹز سینما میں آنے والا ہے۔ یہ فلم "ایک رات" سے زیادہ مقبول ہوگا کیونکہ اس کی کہانی بہت رومانی عناصر سے پُر ہے۔

(۶) نیشنل سٹوڈیوز انکا مشہور فلم "جوانی" دہلی کے میجسٹک سینما میں دکھایا جا رہا ہے۔ اس میں حسن بانو اور سریندر نے کام کیا ہے۔ اس فلم کی کہانی کافی دلچسپ ہے۔ اگر اسکو پیش کرنے کا ڈھنگ کچھ زیادہ موثر ہوتا تو بہتر معلوم ہوتا۔ فلم میں بہترین اداکاری عبدالرحمٰن کابلی کی ہے۔ یہ ایک ۶۵ سالہ بوڑھے کا پارٹ ادا کر رہے ہیں جسکو ۴۰ سال تک انکے خاندانی ڈاکٹر نے شادی کرنے سے باز رکھا ہے ۶۵ سال کی عمر میں پوتی کی عمر کی لڑکی سے شادی کرنے کھڑے ہوئے ہیں جو انکے مجوزہ گھر کے سامنے ... شادی کرلیتی ہے۔ غرضیکہ بڑھاپے اور جوانی کا تقابل خوب دکھایا ہے جس میں جوانی کامیاب اور بڑھاپا پسپا ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

(۷) رنجیت موویٹون رنجیت کے بہت سے فلم ایک ساتھ تیار ہو رہے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ گوری۔ اندھیرا۔ تان سین جس میں خورشید اور سہگل کام کر رہے ہیں۔ کالیداس۔ ماتما وغیرہ۔

(۸) وادیا پیراماؤنٹ "آنکھ کی شرم" باپ اور بیٹے کی جذبات سے لبریز کہانی ہے جنکے خیالات میں ہمیشہ زمین آسمان کا فرق رہا۔ اس میں پرتھوی راج۔ کوشلیا۔ ترلوک کپور۔ گلاب۔ آغا نے کام کیا ہے۔ ۲۰ اپریل سے منروا سینما دہلی میں دکھایا جا رہا ہے۔

(۹) یونائیٹڈ فلمز انکی پہلی تصویر "نئی زندگی" ہے جسکے مکالمے اور گیت حضرت آرزو لکھنوی نے لکھے ہیں تیار ہو رہی ہے۔ اس میں شیخ مختار اور انیس خاتون نے کام کیا ہے۔

(۱۰) چترا پروڈکشنز انکا فلم "پرتگیہ" تیار ہو چکا ہے۔ جس میں موتی لال اور سلوچنا نے کام کیا ہے۔

(۱۱) موہن پکچرز رنجیت پروڈکشنز کے ساتھ یہ فلم کمپنی ایک فلم "ریکھا" تیار کر رہی ہے۔ جس میں لیلا چٹنس اور ہرتی ... نے کام کیا ہے خیال ہے کہ یہ فلم اگلے مہینہ تک تیار ہو جائیگا۔ اسکے بعد دو اور فلم تیار کرینگے جن میں اشوک کمار اور لیلا چٹنس نے کام کیا ہے۔ اور تیسرے میں جسکا نام "کون ہے" یشودھرا کاٹجو اور ساہو... نے۔ اس فلم کا نام "ذہین" ہے۔

(۱۲) سن رائز پکچرز پروڈیوسر وشنو کمار ویاس بہت تیزی سے فلم تیار کر رہے ہیں انکی کئی فلمیں بیک وقت تیار ہو رہی ہیں۔ جنکے نام یہ ہیں۔ "دہائی" "غالب" "نوکر" اور "نرگس"۔ نور جہاں۔ شانتا آپٹے۔ شوبھنا سمرتھ۔ چندر موہن۔ یعقوب وغیرہ نے کام کیا ہے۔

(۱۳) محبوب پروڈکشنز نیشنل سٹوڈیو سے علیحدگی کے بعد مسٹر محبوب نے اپنی الگ ایک فلم کمپنی قائم کرلی ہے۔ "تجربہ" انکا پہلا فلم ہے جس میں ستارہ۔ وینا۔ اشوک کمار۔ یعقوب وغیرہ نے کام کیا ہے۔ اس فلم میں یوپی کے نوابوں کی شاندار زندگی کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔

(۱۴) امر پکچرز ان کی پہلی تصویر "پیغام" تیار ہو چکی ہے جس میں ... اور سریندر نے کام کیا ہے۔ انکی دو اور تصویریں "آداب عرض" اور "برادری" تیار ہو رہی ہیں۔

(۱۵) شوری پکچرز کا فلم "پٹ نی" ۲۰ مئی سے دہلی کے جگت سینما میں بہت مقبول ہو رہا ہے جس میں راگنی۔ مجنوں۔ روپ لیکھا کام کر رہے ہیں۔ اس کی موسیقی ... ہے۔ اسکی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ "منگتی" کے بعد ڈائرکٹر شوری کی یہ دوسری کامیاب فلم ہے۔

(۱۶) نیو تھیٹرز لمیٹڈ ان کے ہاں "آج کل" "والپس" فلم کو ڈائرکٹر ہیم چندر بنا رہے ہیں جس میں اشیدت اور بھارتی نے کام کیا ہے۔ ان کا دوسرا فلم "تیری راما یخ" ہے۔

(۱۷) ہلوار پروڈکشنز کا فلم "من چلی" ۲۸ مئی سے موتی ٹاکیز میں چل رہا ہے اس میں ... رمولا۔ رام ولاری۔ گیانی نے مثبل کام کیا ہے جسے ایس۔ کنشیپ نے مکالمہ نویسی ... دی ہے۔ رمولا کی اداکاری قابل دید ہے۔

(۱۸) ایشیاٹک پکچرز کا فلم "یاد" ۲۴ مئی سے کمار ٹاکیز میں چل رہا ہے جس میں بینا۔ آزوری نے کام کیا ہے۔

(۱۹) پورنیما پروڈکشنز کا فلم "راجہ" ۲۸ مئی سے ریٹز سینما میں دکھایا جا رہا ہے جسے کشور ساہو نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ اور پرتیما داس گپتا کے ساتھ خود بھی کام کیا ہے۔ اس کی کہانی ... ہے۔
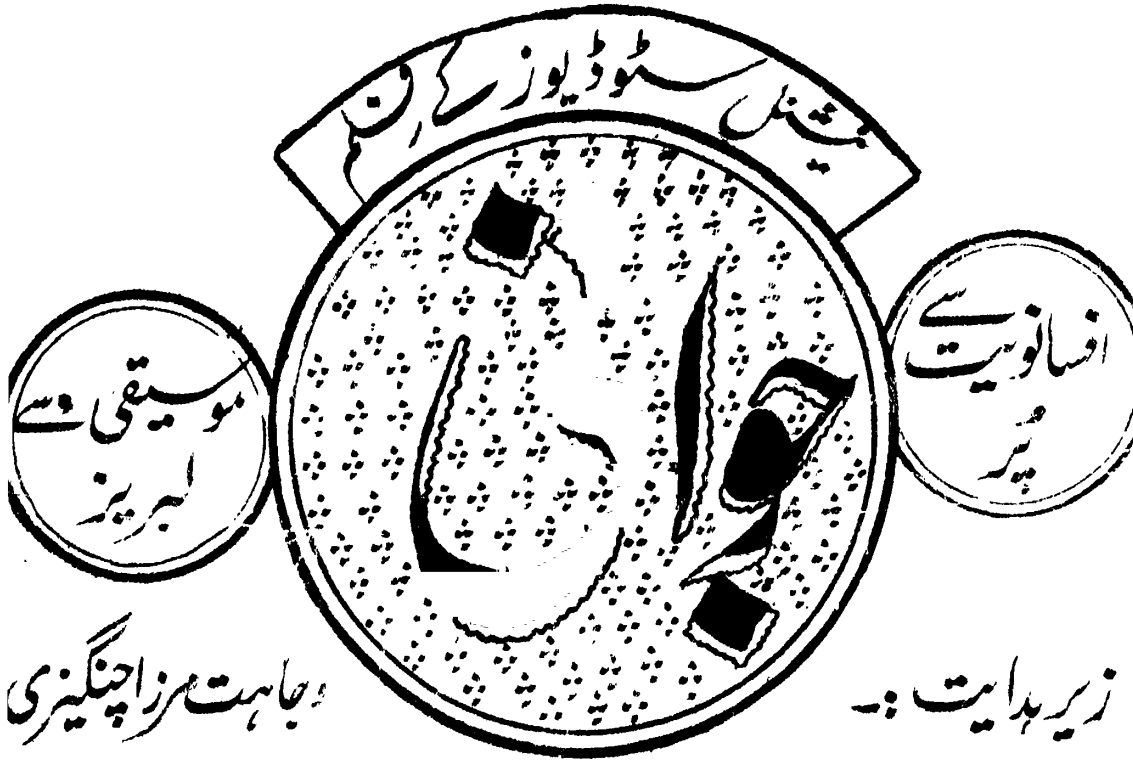
آر ایل شوری کی قابل فخر پیشکش
"منگتی" کے بعد مگر اس سے
زیادہ دل چسپ
فلم
فلم
بے مثل اداکاری
بیحد دلچسپ افسانہ
ہندستانی زبان کا انمول کارنامہ
نشانی
وہ مذاق جسے دیکھکر آپ کے پیٹ میں بل پڑ جائینگے
بہترین موسیقی جو ایک عرصہ تک آپکو مدہوش رکھے گی
زیر ہدایت :- روپ۔ کے شوری
اداکاران :-
مجنوں۔ قہقہوں کا بادشاہ
راگنی۔ حسن کی دیوی
غلام قادر
(۱) راج سینما امرتسر۔ ساتواں ہفتہ
(۲) روز سینما سیالکوٹ۔ پانچواں ہفتہ
(۳) رادھو ملتان ۔ گیارھواں ہفتہ
عنقریب ہی
تاج ٹاکیز آگرہ اور
ناولٹی ٹاکیز کانپور
میں آنے والا ہے
جگت سینما دہلی میں جمعہ ۲۸ مئی سے شروع
جاری کردہ :- رائے صاحب چندن مل اندر کمار - لاہور، دہلی، کراچی
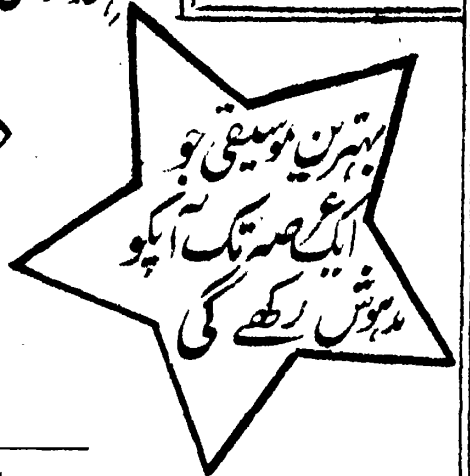
خراماں خراماں آرہا ہے !!
ڈی - ایم پنچولی
(کا)
نرالا شاہکار
پونجی
ہنسی ، شادمانی ، سنسنی
رومان اور مزاح کا بہترین مرقع
ہدایت کار :- وشنو پنچولی اور رویندر ڈاوے
کہانی ڈی - ایم پنچولی
اداکاران :- راگنی - بے بی اختر
منورما - مس پانڈے
ایم اسمٰعیل
جیانت
اجمل
درگا موٹے
جی - ان - بٹ
مکالمہ ایس امتیاز علی تاج
موسیقی غلام حیدر
جاری کردہ :- ایمپائر ٹاکی ڈسٹری بیوٹرز - دہلی - لاہور
سنیما جانیوالوں کی زندہ دل محبوبہ
رمولا
بڑھتی ہوئی خوبصورتی کے ساتھ
تلوار پروڈکشنز کی فلم
من چلی
ہدایت کار :- مسٹر آر - سی تلوار
دلفریب کامیڈی اور سحر آفریں نغمے
دیگر اداکاران :- جوتی - پرکاش - رام دلاری - گیانی سندر وغیرہ
موتی ٹاکیز میں بہت مقبول ہو رہا ہے
جاری کردہ :- واڈیا پیراماونٹ پکچرز - دہلی ، لاہور
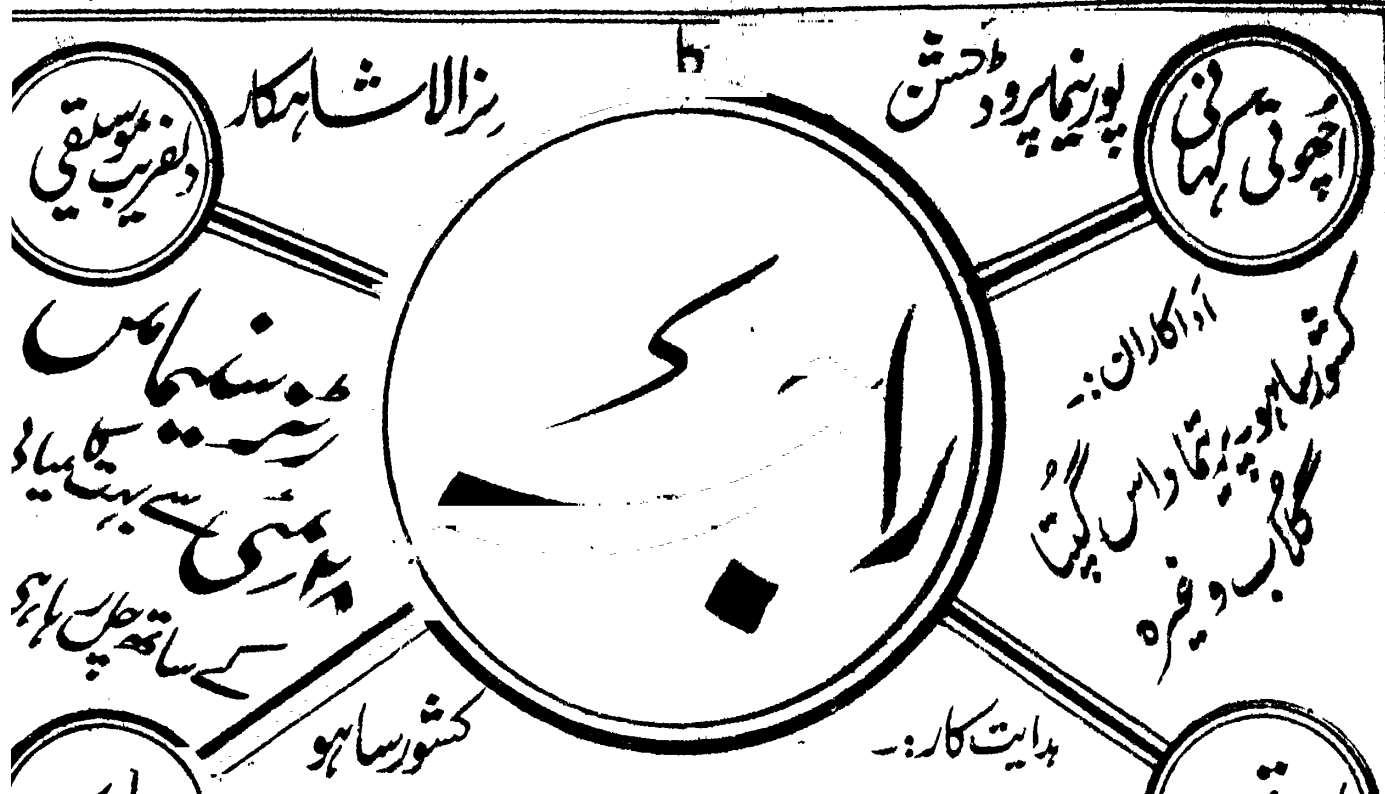
پورنیما پروڈکشن
نرالا شاہکار
اچھوتی کہانی
دلفریب موسیقی
اداکاران :۔
کسُم ساہو پورنما داس گپتا گلاب وغیرہ
ہدایت کار :۔ کشور ساہو
دلربا رقص
بہترین اداکاری
کے ساتھ چل رہا ہے
جاری کردہ :۔ ریلیجس اینڈ کوسموپولیٹن پکچرز۔ دہلی
اسن آرٹ پکچرز کا بے مثل شاہکار
سکول ماسٹر
اداکاران :۔
جیون
(باکمال کیریکٹر ایکٹر)
مایا بینرجی
کرن دیوان
کوشلیا
گوپے
ہدایت کار :۔ سی۔ ایم۔ لوہار۔ بی، ایس، سی
خدا کی تخلیق میں وہ انسان جو سب سے زیادہ دیتا اور سب سے کم لیتا ہے
میں
بے حد مقبول
ہو رہا ہے
جاری کردہ :۔ رتن پکچرز۔ دہلی

مراسلات

سینما کے ذریعہ مانو دھرم پرچار

ایک ان رنگ بمبوئی کے خاص نامہ نگار نے سینما سیوک سنگھ کے جنرل سکرٹیری آچاریہ منگلا نند جی گوتم سے ملاقات کی اور اُن سے جو سوال جواب ہوئے اسکی تفصیل یہاں دی جاتی ہے۔

س:۔ برائے مہربانی سینما سیوک سنگھ Senants of motion Pictures Society) کی اسوقت تک کی کارگذاری پر کچھ روشنی ڈالئے۔

ج:۔ ہم نے اس سنگھ کے سلسلے میں سبھی صوبجات میں کچھ نہ کچھ کام کیا ہے۔ دہلی، پنجاب، بنگال اور بمبئی کے صوبوں میں اس میں اچھی خاصی دلچسپی دکھائی جا رہی ہے۔ زیادہ تر اخبار نویس اور اوسط درجہ کے وہ اشخاص جو کہ سینما کی تجارت میں اونچی وادی چکی کے شکار ہو رہے ہیں سنگھ کے کام میں دلچسپی دکھا رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سنگھ کا کام جلد ہی تیزی سے آگے بڑھنے لگے گا۔

س:۔ مستقبل کیلئے آپ کے سنگھ کا پروگرام کیا ہے؟

ج:۔ ہم سب سے پہلے فلمی تجارت کے ہر ایک مرکز پر کچھ ایسے کارکن تیار کرنا چاہتے ہیں جو کہ ملک کی فلمی تجارت کو سیوا کا میدان سمجھیں۔ نہ کہ دوسروں کا خون چوسنے کا جنکا یقین اس تجارت کے مفید ہونیکے متعلق اور اسکے مستقبل کے بارے میں بھی اونچا ہو۔ ایکبار اتنا کام ہو جانیکے بعد ملک کی تجارت پیشہ حضرات خود بخود مانو دھرم کے دوسرے پہلو کی

Ranji

TANSE

JAYANT DESAI

اور سہگل «تان سین» میں

مس ہویدا فلم «ماسٹرجی» میں

«نرس» کے اداکار

THE ADEEB

DELHI.

1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the 10th of each month.
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/-/- only; single copy Rupee one.
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th, please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

Printed at Jayyed Press, Ballimaran, Delhi.
Edited by Fasih-uddin Ah[illegible] M. I. Wahidi & Published from the office of the [illegible] Delhi.

THE ADEEB DELHI

ستمبر ۱۹۲۳ء

علامہ سیماب اکبرآبادی

ایڈیٹرز: فصیح الدین احمد ایم اے۔ محمد سید ارتضیٰ

مس داگلی فلم '' پونجی '' میں
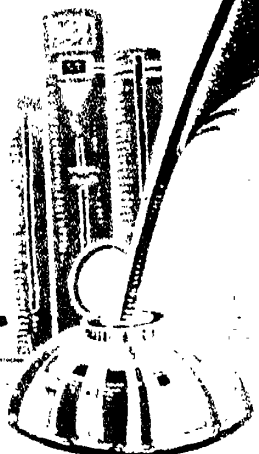
فلم '' رام راج '' کا ایک منظر

وینا فلم '' نجمہ '' میں

فلم '' پونجی '' میں مس داگلی کا ایک اور پوز

فلم '' اشارہ '' کے افتتاح کا منظر

چندہ سالانہ:۔ دس روپے علاوہ محصول ڈاک — قیمت فی رسالہ:۔ ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ادیب
دہلی

ایڈیٹرز:۔
سید محمد ارتضیٰ واحدی — فصیح الدین احمد ایم۔ اے — (آنسہ) نجمہ تصدق بی۔اے۔ بی۔ٹی

جلد ۵ — ستمبر ۱۹۴۳ء — نمبر ۵

فہرست مضامین

مسرت اور خوشی کا جو پیغام بار بار آئے اُسکو عید کہتے ہیں۔ چونکہ عید کا دن بھی ہر سال خوشی کا ایک نیا پیغام لیکر آتا ہے۔ اس لئے اس دن کو عید کا دن کہا جاتا ہے۔ عید کا دن چونکہ رمضان شریف کے پورے مہینہ میں مسلسل روزہ رکھنے اور تراویح ادا کرنے کے بعد آتا ہے۔ اس لئے فطرتاً اور طبعاً یہ دن اسلامی تہذیب میں بڑی مسرت اور شادمانی کا دن شمار کیا جاتا ہے۔

عید کا چاند بے شمار خوشیاں، مسرتیں اور لطف انگیز کیفیتیں لیکر طلوع ہوتا ہے۔ اسلام کی مقدس تہذیب میں عید کا دن اور عید کی رات دونوں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص عید الفطر کی رات کو عبادت اور خدا تعالیٰ کے شکریہ کے ساتھ زندہ رکھے گا یعنی جاگتا رہے گا تو خدا تعالیٰ اس کے دل کو غفلت کی موت سے بچائے گا۔ یعنی اس شخص کا دل خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کے عقیدے میں چونکہ ہر عبادت اور ہر فریضہ کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اسکی ہی عنایت پر موقوف ہے۔ اس لئے ہر عبادت کو بجالانے کے بعد خدا تعالیٰ کا شکریہ ضروری ہے چونکہ رمضان شریف کے روزے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے رکھے گئے ہیں۔ اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کرو۔ یہ شکریہ انفرادی بھی ادا کیا جائے۔ اور اجتماعی بھی۔ عید کی رات میں انفرادی شکریہ کا طریقہ یہ ہے کہ نوافل پڑھے جائیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اس رات کو زندہ رکھا جائے۔ اور عید کے دن میں اجتماعی شکریہ کا طریقہ یہ ہے کہ تمام مسلمان عیدگاہ میں جمع ہوکر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اسکی عظمت اور اسلامی ڈسپلن اور جماعتی زندگی کا مظاہرہ کریں۔ اور ایک امام کے پیچھے جمع ہوکر دو رکعتیں عید الفطر کے نام اور واجب کی نیت سے ادا کریں۔ چونکہ اسلام کا مقصد یہ بھی ہے کہ اس دن ہر طبقہ کے مسلمان خوش ہوکر بے فکری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا مظاہرہ کریں۔ اس لئے صاحب حیثیت مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ عیدگاہ جانے سے پہلے صدقہ فطر ادا کرے۔ یعنی پونے دو سیر گیہوں یا گیہوں کا آٹا۔ ساڑھے تین سیر جَو یا جَو کا آٹا مساکین کو خیرات دے۔ جو بچے نابالغ ہوں انکی جانب سے بھی یہ صدقہ دیا جائے تاکہ ہر غریب آدمی اور اسکے بچے اس دن پیٹ بھر کر کھانا کھا سکیں۔ اور پوری مسلم قوم کا کوئی بچہ بھی عید کے دن بھوکا نہ رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص باوجود استطاعت کے یعنی صاحب نصاب ہوتے ہوئے اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی جانب سے صدقہ فطر ادا نہیں کرتا اُس کے روزے قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کرسکتے۔ صاحب نصاب سے شریعت اسلامی کی مراد یہ ہے کہ روزمرہ کی ضرورت کے علاوہ کسی شخص کے پاس اتنا مال ہو کہ ساڑھے سات تولہ سونا یا باون تولہ چاندی اس مال سے حاصل ہوسکے جس شخص کے پاس اتنا مال ہو اُس پر صدقہ فطر کا ادا کرنا واجب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا اجتماعی شکریہ ادا کرنے کی غرض سے صبح کی نماز کے بعد غسل کرنے اور اُجلے کپڑے پہننے اور خوشبو لگانے کے بعد مسلمانوں کو عیدگاہ میں جانا چاہیئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ عید کے دن صبح ہی سے اللہ تعالیٰ کے مقدس فرشتے آبادیوں کی گلیوں اور کوچوں کے سرے پر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور اُمت محمدیہ کو خطاب کرتے ہوئے پکارتے ہیں یا اُمتہ محمد اُخرجوا الیٰ ربکم یقبل القلیل ویعطی الجزیل ویغفر الذنب العظیم۔

یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے لوگو اپنے اس پروردگار اور اپنے اس پالن ہار کی عبادت کیلئے چلو۔ جو تھوڑی سی عبادت قبول کرلیتا ہے۔ اور تھوڑی عبادت کے بدلے میں اجر و ثواب بہت دیتا ہے۔ اور بڑے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ چونکہ یہ دن اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی عظمت کا مظاہرہ کرتا ہے اسلئے گھر سے نکلتے ہی عیدگاہ کے راستہ میں مسلمان تکبیر پڑھتے ہوئے جائیں۔ تکبیر کے الفاظ اس طرح ادا کئے جائیں۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر ولللہ الحمد۔ یعنی اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔ سب سے بزرگ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی قابل پرستش نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا اور بہت بزرگ ہے۔ اور ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کی تعریف کا وہی مستحق ہے۔ عید کی نماز میں روزمرہ کی نماز کے علاوہ ایک اور خصوصیت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نماز میں چھ تکبیریں زائد ہیں۔ جب امام پہلی تکبیر تحریمہ کیلئے اللہ اکبر کہے تو سب لوگ حسب معمول کانوں تک ہاتھ اُٹھاکر باندھ لیں جب دوسری مرتبہ امام اللہ اکبر کہے تو ہاتھ اُٹھائیں اور چھوڑ دیں۔ جب تیسری

مرتبہ امام اللہ اکبر کہے تو ہاتھ اٹھائیں اور چھوڑ دیں۔ جب چوتھی مرتبہ امام اللہ اکبر کہے تو ہاتھ کانوں تک اٹھائیں اور باندھ لیں۔ اسی طرح جب امام دوسری رکعت کی قرأت پوری کر چکے اور اللہ اکبر کہے تو ہاتھ کانوں تک اٹھائیں اور چھوڑ دیں۔ جب امام دوسری مرتبہ اللہ اکبر کہے تو ہاتھ اٹھائیں اور چھوڑ دیں۔ جب امام تیسری مرتبہ اللہ اکبر کہے تو ہاتھ اٹھائیں اور چھوڑ دیں۔ جب امام چوتھی مرتبہ اللہ اکبر کہے تو ہاتھ نہ اٹھائیں بلکہ رکوع میں چلے جائیں۔ نماز ختم ہونیکے بعد اپنی اپنی جگہ بیٹھکر خطبہ سنیں۔ اور عیدگاہ سے چلتے وقت وہ راستہ اختیار نہ کریں جس سے عیدگاہ گئے تھے۔ یعنی عیدگاہ جانے اور وہاں سے آنے کے راستے ایک نہ ہوں بلکہ مختلف ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ عید کے دن جب مسلمان عید کی نماز ادا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے مقدس فرشتوں سے دریافت فرماتا ہے۔ ما جزاء الاجیر اذا عمل عملہ۔ اے میرے فرشتو! جب کوئی مزدور مزدوری پوری کرلے اور اپنا کام ختم کرلے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں۔ ربنا وسیدنا ومولانا توفیہ اجرہ۔ اے ہمارے آقا اور اے ہمارے مولیٰ ایسے وفادار مزدور کو اسکی پوری پوری مزدوری ادا کردی جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اشہدکم یا ملٰئکتی انی قد جعلت ثواب صیامہم من شہر رمضان و قیامہم رضائی ومغفرتی۔ اے میرے فرشتو! تم گواہ رہو۔ میں نے اپنے بندوں کے ان روزوں کے بدلے میں جو انہوں نے رمضان شریف کے دنوں میں رکھے ہیں اور ان نمازوں کے عوض جو انہوں نے رمضان کی راتوں میں ادا کی ہیں ان کو اپنی رضامندی اور مغفرت سے نوازدیا ہے۔ پھر مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ یا عبادی سلونی۔ وعزتی وجلالی لاتسئلونی الیوم فی جمعکم ہذا شیئاً لاٰخرتکم الا اعطیتکم ولا لدنیاکم الا نظرت لکم وعزتی وجلالی لاسترن علیکم عثراتکم۔ اے میرے بندو! مجھ سے مانگو مجھے اپنے عزت وجلال کی قسم تم آخرت کے متعلق جو چیز مجھ سے طلب کروگے وہ تم کو دونگا۔ اور دنیا کے متعلق جو سوال کروگے اس پر مہربانی کے ساتھ توجہ کرونگا۔ تمہاری خطاؤں کو نظرانداز کروں گا۔ اور قیامت میں تمہاری پردہ پوشی کروں گا۔ اور تمکو رسوا نہیں کروں گا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔ انصرفوا مغفوراً لکم قد ارضیتمونی ورضیت عنکم۔ جاؤ اپنے اپنے مکانوں اور ٹھکانوں کی طرف لوٹ جاؤ اس حال میں کہ تم بخشے بخشائے ہو۔ تم مجھ سے راضی ہوگئے اور میں تم سے راضی ہوگیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں مسلمان عیدگاہ سے مغفرت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی لیکر واپس آتے ہیں۔ اسلامی عید جس شان کے ساتھ منائی جاتی ہے وہ یقیناً دنیا کی قوموں کے تہواروں اور میلوں سے جداگانہ شان رکھتی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ عید کے دن فسق وفجور سے پرہیز کریں۔ اور بری باتوں سے بچیں۔ برس کے برس دن کوئی ایسی بات نہ کریں جو خدا تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف کا موجب ہو۔ امت محمدیہ کے ایک بہت بڑے پیر اور مشہور بزرگ فرماتے ہیں۔ لیس العید لمن شرب واکل انما العید لمن اخلص للّٰہ العمل یعنی عید ان لوگوں کی نہیں ہے جنہوں نے خوب کھایا اور پیا بلکہ عید ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کیا۔ لیس العید لمن لبس الجدید۔ انما العید لمن خاف الوعید۔ عید اچھے اچھے کپڑے پہن لینے کا نام صرف نہیں ہے۔ بلکہ عید ان لوگوں کی ہے جو خدا کی پکڑ اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ لیس العید لمن تبخر بالعود۔ انما العید لمن تاب ولایعود۔ عید ان کی نہیں ہے جو بہت سی خوشبوئیں استعمال کرتے ہیں بلکہ عید انکی ہے جو آج کے دن ایسی توبہ کرتے ہیں جسکو توڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ لیس العید لمن نصب القدور۔ انما العید لمن سعد بالمقدور۔ عید ان کی نہیں ہے جنہوں نے عید کے دن بڑی بڑی دیگیں کھانوں کی پکائیں۔ بلکہ عید ان کی ہے جنہوں نے اپنی طاقت کے موافق نیک بننے کا عہد کیا۔

لیس العید لمن تزین بزینۃ الدنیا۔ انما العید لمن تزود بزاد التقویٰ۔ عید انکی نہیں ہے جنہوں نے دنیا کی زینت کا سامان جمع کیا۔ بلکہ عید انکی ہے جنہوں نے پرہیزگاری اور تقویٰ اختیار کیا۔

لیس العید لمن رکب المطایا۔ انما العید لمن ترک الخطایا۔ عید بڑھیا بڑھیا شاندار سواریوں پر سوار ہونے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ عید خطاؤں کے ترک کردینے اور گناہوں سے باز آجانے کا نام ہے۔

لیس العید لمن بسط البساط۔ انما العید لمن جاوز الصراط۔ عید کی حقیقی خوشی ان کو نہیں ہے۔ جو عمدہ عمدہ بچھونے بچھا کر عید مناتے ہیں بلکہ حقیقی عید کی خوشی سے وہ لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں جو قیامت میں صراط سے صحیح سالم گذر کر جنت میں داخل ہو جاتے ہیں

میں تمام مسلمانوں کی خدمت میں عید کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے مؤدبانہ عرض کرتا ہوں کہ عید ایک اسلامی تہوار ہے۔ اسکو اسلامی شان کے ساتھ منایا جائے تاکہ اسکی وہ خصوصیات باقی رہیں جو اہل اسلام کے لئے طغرائے امتیاز ہیں۔

(منشور از نشر گاہ دہلی)

عیدِ بہاراں

از جناب یوسف جمال انصاری ایم اے (علیگ) جبوی

پھر عقد ہوئے ہے میانِ گل و گلزار
پھر عید بہاراں ہے گلے ملتے ہیں مے خوار

پھر دورِ مے و گل ہے جدھر آنکھ اٹھاؤ
مے خانہ ہی مے خانہ ہے گلزار ہی گلزار

جھومر مہِ کامل کا ستاروں کی ہے افشاں
گلشن میں حسیں شب ہے گل افروز گہربار

پھر جنتِ نظارہ ہے لبریز صراحی
پھر نغمۂ داؤد ہے پازیب کی جھنکار

پھر ناخنِ مے دل کی گرہ کھول رہا ہے
پھر حسنِ صنم عقدہ کشائی پہ ہے تیار

پھر مستیٔ مے تلخیٔ دوراں میں ہے غلطاں
پھر سایۂ غم سے ہے بہم پرتوِ دلدار

صہبا ہے کہ داروئے غم تلخیٔ دوراں
مطرب ہے کہ درمانِ تپِ فرقتِ دلدار

نکہت کے تجسس میں نسیمِ سحری ہے
عشرت کے تعاقب میں ہے رقاصۂ طرار

پھر قہقہۂ رنداں میں ڈھلی قلقلِ مینا
پھر لرزشِ صہبا میں تلے نغمہ و اشعار

اٹھتی ہوئی ساقی کی جوانی سے ہم آہنگ
ہے پختگیٔ بادۂ رنگین و طرب کار

نوخیز جوانی کا ابھرتا ہوا سورج
سینے سے نمایاں ہے جبیں سے ہے نمودار

ہو ہو کے قدم بوس دعا دیتی ہیں کلیاں
وہ پھول کھلاتی ہے چمن میں دمِ رفتار

ڈھلکا ہوا آنچل ہے تو امڈا ہوا سینہ
مچلے ہوئے کاکل ہیں تو دہکے ہوئے رخسار

واللیل کی تفسیر ہے یا کاکلِ شبگوں
روئے شفق آلود ہے یا صبح نمودار

کہتی ہے یہ اس نرگسِ مخمور کی گردش
ہاں اور پلے، اور پلے ساغرِ گلنار

پھر آتشِ سیال تپاتی ہے لہو کو
ہیجان ہے جذبات میں، احساس ہے بیدار

پھر عشق کے اصرار میں اک شانِ یقیں ہے
پھر حسن کے انکار میں پوشیدہ ہے اقرار

ہم دوش و ہم آغوش ہیں یوں حسن و محبت
مے خوار کو جیسے ہو سنبھالے ہوئے میخوار

معیار نرالا ہے مرے نقد و نظر کا
بوسوں سے پرکھتا ہوں میں یاقوتِ لبِ یار

مستی میں تمیزِ مے و شاہد نہیں مجھ کو
سرشار ہوں، سرشار ہوں، سرشار ہوں سرشار

اے خندۂ تقدیر ترا نیش کہاں ہے
اے وقت کدھر ہے تری چلتی ہوئی تلوار

تمدّن

(از واحدی)

بچپن میں بزرگ خواتین کی زبانی ایک روایت سُنی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مفلوک الحال لوگوں کی حالت پر ترس کھا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کی۔ "بار الٰہا! یہ غریب امیر کا کیا قصہ لگا رکھا ہے۔ سب کو یکساں کر دے۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کا راز تم نہیں سمجھ سکتے۔ دنیا کی رونق تضاد سے ہے۔ اندھیرا نہ ہوا کرے تو روشنی کا لطف جاتا رہے۔ بیماری نہ ہو تو تندرستی کو کون پوچھے۔ غریبی نہ ہو تو امیری بے معنی ہے۔"

یہ روایت پھر کسی مستند کیا غیر مستند کتاب میں بھی مجھے نظر نہیں آئی۔ اور آج کل کی عورتیں بھی اسے بھول بھلا گئیں۔ نصف صدی پہلے کی نانیوں دادیوں کے ساتھ اس قسم کی روایتوں کا غالباً خاتمہ ہو گیا۔ مگر اس روایت کی صحت و عدم صحت سے قطع نظر کر کے دیکھئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ سے اسے منسوب نہ کیجئے۔ ویسے ہی سوچئے تو بات یا دن تو سے اور پادرتی ہے۔ آپ مجھ سے اتفاق نہیں کرتے تو فرمائیے آپ نے کبھی ایسا کیا ہے کہ آپ اور آپ کے دوست بیٹھے کھانا کھا رہے ہوں اور کوئی غریب ضرورت مند آپ کے دسترخوان یا آپ کی میز کے پاس آکھڑا ہوا ہو اور آپ نے کھانا چھوڑ دیا ہو۔ اور اُس غریب کو صابون ملوا ملوا کر نہلایا ہو اور اسے صاف ستھرے کپڑے پہنائے ہوں۔ اور اُسے شریک کر کے دوبارہ کھانا شروع کیا ہو۔ آپ نے کبھی نہیں کیا تو اور زیادہ کیا کریں گے۔ آپ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ سے جو اونچے ہیں وہ آپ کو اپنے برابر بٹھا لیں مگر آپ اپنے سے نیچے آدمیوں کو برابری کا درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اگر آپ فرسٹ کلاس کے مسافر ہیں تو سکنڈ کلاس کے مسافر کو اپنے درجہ میں گھسنے دیجئے۔ انٹر اور تھرڈ کلاس والے تو کس گنتی میں ہیں۔ چند گھنٹوں کے لئے مساوات کا عمل آپ نہیں کر سکتے۔ تو مستقل عمل کہاں ممکن ہے۔ قول اور عمل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تھیوری اور پریکٹس مختلف چیزیں ہیں۔ جو لوگ اپنے نوکروں کو اپنے دسترخوان پر بٹھا لیتے ہیں۔ انہیں آپ غیر متمدن کہتے ہیں اور وہ بھی دسترخوان پر بٹھانے کے سوا نوکروں کو نوکر ہی خیال کرتے ہیں۔

میرے ایک دوست تھے۔ وہ خود تو معمولی کرتہ پاجامہ پہنے رہتے تھے اور اپنے نوکروں کو کوٹ پتلون پہناتے تھے۔ لیکن نوکر نوکروں کی جگہ رہتے تھے اور وہ بنی جگہ۔ نوکر کوٹ پتلون پہن کر ان کی خدمت کرتے علاوہ وہ کرتہ پاجامہ پہنے آقا حکومت لیتے۔ اس سے انہیں بڑا مزا آتا۔ اس میں وہ اپنے اندر طرح طرح کا امتیاز محسوس کرتے۔

انسان طبعاً امتیاز کا خواہاں ہے۔ انسان کی فطرت چاہتی ہے کہ دوسرے اُسے بڑا جانیں۔ اسکی دھونس مانیں۔ دوسروں میں نباتات، حیوانات، انسان سب شامل ہیں۔ حتیٰ کہ میاں بیوی، ماں باپ، بیٹا بیٹی بھی۔ میاں کی تمنا ہوتی ہے کہ بیوی پر غلبہ رہے۔ بیوی کوشش کرتی ہے کہ میاں غلام بن جائے۔ ماں باپ بیٹا بیٹی کی سرتابی برداشت نہیں کر سکتے۔ بیٹا بیٹی ماں باپ کی حکومت سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ حاکم محکوم کو دبا کر رکھتا ہے۔ محکوم حاکم کو پچھاڑنے کی فکر میں کرتا رہتا ہے۔

ذرا تصور کیجئے اُس زمانہ کا کہ انسان حیوانوں کی طرح جنگل میں زندگی گذارتا ہے۔ انسانوں اور حیوانوں میں کچھ فرق نہیں ہے۔ حیوان ننگے پھرتے ہیں تو انسان بھی ننگا پھرتا ہے۔ حیوان بھٹوں میں سوتے ہیں تو انسان بھی بھٹوں میں سوتا ہے۔ جو چیزیں حیوان کھاتے ہیں وہی انسان کھاتا ہے۔ غرض انسانوں اور حیوانوں میں سوائے وضع قطع کے کوئی فرق نہیں ہے۔ سو یہ فرق تو حیوانوں حیوانوں میں بھی ہے۔ حیوانوں کی وضعیں شکلیں بھی وضع وضع کی ہیں۔ دنیا میں جہاں اور بہت سے حیوان ہیں وہاں ایک حیوان انسان بھی ہے۔ ابھی انسان حیوانِ ناطق بھی نہیں ہے۔ انسان کی عقل بھی حیوان سے ابھی نہیں بڑھی ہے کہ یکایک انسان کی فطرت نے زور کیا۔ اُسے انسان حیوان سے افضل نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو ممتاز محسوس کیا۔ اُسے اپنے اندر بڑائی اور کبریائی کی جھلک دکھائی دی۔ انسان انسان متحد ہو گئے اور سب نے مل کر حیوانوں پر حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جو جانور قابو میں رہ سکتے تھے انہیں قابو میں کر لیا ان سے خدمت لینی اختیار کی۔ جو قابو میں نہیں رہ سکتے تھے انہیں بیکار قرار دے کر کہہ دیا۔ "نکل جاؤ ہماری مملکت سے ـــــ دور ـــــ بہت دور جہاں ہم ہوں وہاں تمہارا کام نہیں۔ زمین کے مالک ہم ہیں۔ جو زمین ہمارے تصرف میں ہو اُسکے قریب مت دکھائی دو۔"

مدنیت کا یہ پہلا قدم تھا۔ تمدن کی اس طرح بنیاد رکھی گئی۔ پہلے انسان اور حیوان رلے ملے رہتے تھے اور یکساں زندگی بسر کرتے تھے۔ اب انسانوں کی دنیا الگ ہو گئی حیوانوں کی دنیا الگ ہو گئی لیکن ابھی انسانوں انسانوں میں امتیاز نہ تھا۔ انسان انسان پر حکومت نہیں کرتا تھا۔ انسان انسان برابر تھے۔ یہ انسانوں کی واقعی مساوات کا دور تھا۔ انسان کی عقل نے ترقی کی طرف قدم اٹھایا۔ کسی انسان کی عقل زیادہ بڑھی کسی کی کم۔ زیادہ عقل والا کم عقل والے کو جانور سمجھنے لگا۔ زیادہ عقل والا کم عقل والوں سے جانوروں کا سا سلوک کرنے لگا۔ کم عقل والوں کو قابو میں رکھنے اور کم عقل والوں سے خدمت لینے کے طریقے تجویز کرنے لگا۔ زیادہ عقل والا غالب آگیا۔ کم عقل والا مغلوب۔ زیادہ عقل والا سردار بنا۔ کم عقل والے اُس کے تابعدار۔ عقل کے دو ایک تیر مقابل تھے۔ عقل

سے ساتھ ساتھ جسمانی طاقت کی بھی پرستش ہوتی تھی اور شجاعت کو بھی درجہ دیا جاتا تھا۔ اہل عقل نے غلبہ حاصل کیا اور غلبہ حاصل کرنے کو وہ سامان فراہم کر لئے کہ اہل طاقت اور اہل شجاعت اہل عقل سے تو مغلوب نہ ہوئے تھے مگر ان سامانوں سے مرعوب ہو گئے۔ طاقت کو عقل نے شیر قالین بنا دیا۔ شجاعت کو لڑنے مرنے کے کام پر لگا دیا اور زر و زیور یا تدبیر کی شکل میں نمودار ہو کر آہستہ آہستہ تمام دنیا پر چھا گئی۔ یہاں تک کہ آج عقل ہی عقل کارفرما ہے۔ آج وزیروں کے آگے بادشاہوں کی حقیقت نہیں ہے۔ عاقل وزیروں بادشاہوں کو پردے پر بٹھا رہا ہے۔ اہل طاقت اور اہل شجاعت اہل عقل سے چھپے چھپے پھرتے ہیں۔ اہل عقل کی ایک ایجاد بمبار لاکھوں پہلوانوں اور لاکھوں بہادروں کے چھکے چھڑا دینے کے لئے کافی ہے۔

غرض تمدن یہی ہے کہ جانور اپنی جگہ رہیں۔ معمولی انسان اپنی جگہ اور غیر معمولی انسان سب کے اوپر اس طرح ہوں جیسے انسانی جسم کے اوپر سر ہوتا ہے۔ سر کو جسم کی ضرورت ہے اور جسم کو سر کی۔ لیکن سر کو سر کی جگہ رہنا چاہیئے اور جسم کو جسم کی جگہ۔

آپ اپنے سر کو قابو میں کئے بغیر کہیں نہیں پہنچ سکتے۔ جب تک سر بے قابو ہے دیواروں سے سر ٹکراتے رہیئے۔ دنیا کی رونق تو تضاد سے ہے۔ آپ کے پاس عقل ہے تو آپ اندھیرے کی بجائے اُجالا۔ دکھی کی بجائے سکھی اور غریب کی بجائے امیر بن سکتے ہیں۔ انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی۔ لیکن اب یہ عقل جانوروں اور معمولی انسانوں کو مغلوب کرتے کرتے عقل ہی سے لڑنے لگی ہے۔ دیکھئے اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ کہیں تمدن کی تعریف بدل جائے۔ تمدن پہلے بھی بدلتے رہے ہیں۔ خدا نے دنیا کو تضاد سے رونق بخشی ہے لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ عاقل بے عقلوں کو، طاقتور کمزوروں کو اور امیر غریبوں کو بالکل کچل کر رکھ دیں۔ وہ ایسے نیک بندے پیدا کرتا رہا ہے جنہوں نے اسکی منشا کے مطابق عقل، طاقت اور امیری کے استعمال بتائے اور عقل، طاقت اور امیری کو سنت اور بے آپے نہ ہونے کی تلقین کی۔ ایک نیک بندے کی تعلیم مجھے یاد ہے۔ اُس نے خدا کا یہ پیغام بندوں کو پہنچایا کہ ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو (انھیں اولڈ فیلو اور اولڈ ڈاگ یعنی بڑھو اور بڈھا کتا کہنے کی بجائے جیسا کہ آج کل یورپ میں کہا جاتا ہے) اُن کے سامنے "ہوں" تک مت کرو۔ ان سے کوئی بات کہو تو ادب سے کہو اور محبت کے ساتھ اُن کے آگے جھکتے رہو۔ اور اُن کے واسطے دعا کرتے رہو کہ اے پروردگار جیسے انہوں نے مجھے چھوٹے سے کو پالا پوسا ہے۔ اسی طرح تو بھی ان پر رحم کیجو۔ اس نے بتایا کہ خدا مانتا ہے کہ مرد عورتوں کی نسبت طاقتور ہوتے ہیں۔ لیکن طاقتور کو طاقت پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ طاقتور کو کمزور کا سر دھرا اور مددگار رہنا چاہیئے۔ طاقت کے فرق کے سوا عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مردوں پر لازم ہے کہ عورتوں کے ساتھ آدمیت سے پیش آئیں۔ عورتیں مردوں کی زینت ہیں اور مرد عورتوں کی زینت۔ اُس نے خدا کا یہ حکم سنایا کہ افلاس کے ڈر سے اولاد کو قتل نہ کیا کرو کہ ہم ہی تمہارے رازق ہیں۔ پہلے زمانہ میں لوگ اولاد کو پیدا ہونے کے بعد قتل کر دیا کرتے تھے جس طرح آجکل برتھ کنٹرول کے ذریعہ پیدا ہونے سے پہلے قتل کیا جاتا ہے۔ اُس نے فرمایا کہ خدا نیکی صرف اسے نہیں سمجھتا کہ مغرب کی طرف یا مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ خدا کے نزدیک نیکی یہ ہے کہ خدا پر ایمان لاؤ۔ اسکے احکام کی تعمیل و عدم تعمیل کی جزا و سزا پر ایمان لاؤ۔ اُس کے فرشتوں اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور اپنا مال خدا کی محبت میں اپنے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دو اور لوگوں کی گردنیں غلامی سے چھڑاؤ۔ اُس نے ارشاد کیا جنت میں تین قسم کے لوگ جائیں گے۔ اوّل رعایا کے ساتھ احسان کرنے والا اور نیکی اور بھلائی کی توفیق پایا ہوا منصف بادشاہ۔ دوسرا وہ شخص جو رشتہ داروں کے ساتھ اور جن کے ساتھ اُس کا روز کا واسطہ پڑتا ہے ان کے ساتھ مہربانی کرتا ہو۔ تیسرا وہ بیوی بچوں والا پارسا جو حرام سے باز رہتا ہو اور تنگدستی کی پریشانی ظاہر کرتے شرماتا ہو۔ اُس نے خدا کا یہ پیغام پہنچایا کہ دنیا بھر کے انسان ایک کنبہ اور ایک برادری ہیں۔ تم نیکی کے کاموں اور پرہیزگاری میں سب کے ساتھ شریک رہو اور بدکاری اور ظلم کے کاموں میں کسی کا بھی ساتھ نہ دو۔ مضبوطی کے ساتھ انصاف پر قائم رہو اور کبھی گواہی دو تو خدا لگتی گواہی دو۔ خواہ وہ گواہی تمہارے اپنے یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں ہی کے خلاف کیوں نہ پڑے۔

پودوں کو پانی نہیں ملتا تو وہ جل جاتے ہیں۔ مکانوں کی مرمت نہیں ہوتی تو وہ دانت نکوس دیتے ہیں۔ فرنیچر پر رنگ روغن نہیں ہوتا تو اس کی شکل بگڑ جاتی ہے۔ انسان بھی نگہداشت کے محتاج ہیں۔ نگہداشت کے بغیر ان میں اور جانوروں میں واقعی فرق نہیں رہتا۔ آپ پودوں کو پانی دیتے ہیں۔ پودوں کو درخت بنانے اور اُن میں اچھے پھل لانے کی تدبیریں سوچتے ہیں۔ اینٹ پتھر کے مکانوں کا خیال رکھتے ہیں اور ان میں نئی نئی خوبصورتیاں پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ فرنیچر بھی اچھی وضع قطع کا اور چمک دمک والا آپ کی آنکھوں کو بھاتا ہے۔ جانوروں کا اگر شوق ہے تو ان کی آرام و آسائش اور تندرستی بھی آپ کے نزدیک اہم ہے۔ لیکن یہ جیتے انسان، آپ ہی کے جد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد۔ جن میں بہت سوں کے ساتھ دو چار یا دس پانچ پشتوں کے بعد آپ کا کنبہ نکل سکتا ہے۔ جن کے بزرگ اور آپ کے بزرگ سگے بھائی تھے، آج پھٹے کپڑے اور خالی پیٹ پریشان اور سرگرداں پھرتے ہیں۔ اُن کے عادات و اطوار خراب ہیں۔ جہالت اور افلاس نے ان میں تمام عیب جمع کر دیئے ہیں۔ یہ سچ مچ انسان سے حیوان ہوئے جاتے ہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر۔ انہیں آپ درختوں ہی کی طرح پانی دیجئے۔ مکانوں اور فرنیچر ہی کی طرح ان کی نگہداشت کیجئے۔ جانور ہی سمجھ کر ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھیئے۔
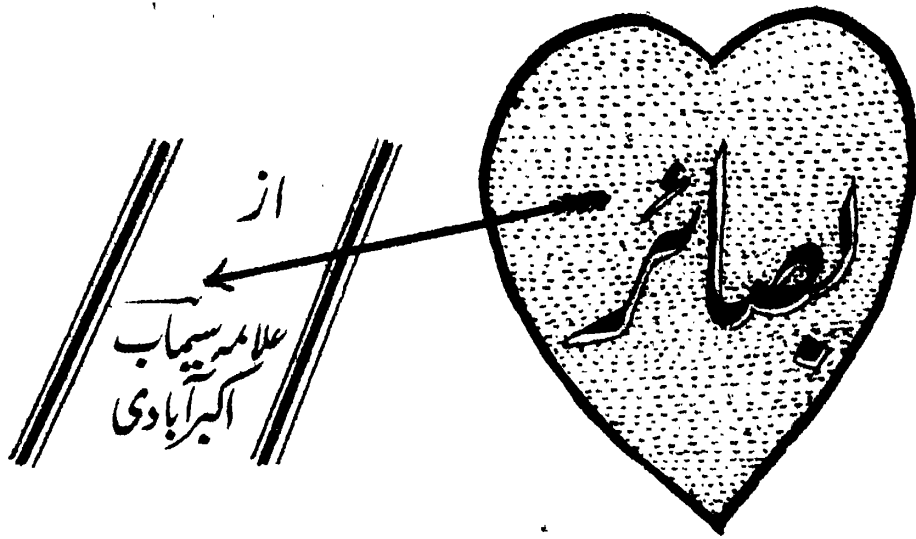
گذر جا مسکراتا قیدو بندِ دارِ فانی سے
کہ رونے سے اجل کی چیرہ دستی رک نہیں سکتی

پہاڑوں کی طرح، کر فطرتِ بالیدگی پیدا
جو پستی کو ابھرنا ہے تو پستی رک نہیں سکتی

ابھی انسان کی تقدیر، مجبورِ غلامی ہے
ابھی دنیا میں شخصیت پرستی رک نہیں سکتی

قناعت پیشگی جب تک نہ کچھ سوچے علاج اسکا
کسی صورت وبائے تنگدستی رک نہیں سکتی

سحر ہو، شام ہو، فصلِ خزاں ہو، موسمِ گل ہو
کسی محور پہ جولانگاہِ ہستی رک نہیں سکتی

سمٹ رہیں فنا کے آج ڈوبی، اور کل ڈوبی
لیے جو ریگِ ساحل پر وہ بستی رک نہیں سکتی

اگر قسمت میں ہے تو جبر سے پہنچائی جائے گی
تری روزی گراں ہو یا ہو سستی رک نہیں سکتی

بغیرِ ظرف، ذوقِ سرخوشی اک خبطِ مطلق ہے
خطا ہے میکشی، جب تجھ سے مستی رک نہیں سکتی

خودی و خود نمائی میں ہے کوئی مصلحت پنہاں
خدا جب تک نہ روکے، خود پرستی رک نہیں سکتی

گرتی دیوار کے معمار آصف جاہ اوّل

(از حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ)

اللہ کے کلام قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کا ایک قصہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰ ایک روحانی مرشد سے ملے اور ان مرشد کے پاس رہنے اور فیض صحبت حاصل کرنے کی درخواست کی۔

ان روحانی مرشد کا نام قرآن میں نہیں ہے لیکن مفسرین کا بیان ہے کہ ان کا نام خواجہ خضرؑ تھا۔

خواجہ خضرؑ نے حضرت موسیٰ جیسے نامور پیغمبر کی درخواست کے جواب میں کہا۔ آپ میرے غیبی اسرار کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس واسطے میں آپ کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔

قرآن کا بیان ہے کہ موسیٰ نے اصرار کے ساتھ کرر درخواست کی اور کہا کہ میں آپ کی کسی بات میں دخل نہیں دونگا اور صبر سے کام لونگا۔

خواجہ خضرؑ نے موسیٰ کو اپنے ساتھ رکھ لیا اور ایک سفر کیلئے روانہ ہوئے۔ پہلے ایک کشتی میں سوار ہوئے کشتی والوں نے ان دونوں سے نیک آدمی سمجھ کر کرایہ نہیں لیا۔ خواجہ خضرؑ نے کشتی میں سوراخ کر دیا کشتی والے دوڑے اور کشتی کی مرمت کرنے لگے۔

حضرت موسیٰ نے یہ حرکت دیکھی تو ان سے نہ رہا گیا اور انہوں نے خواجہ خضرؑ سے کہا کشتی والوں کا تو یہ احسان کہ انہوں نے کرایہ لئے بغیر ہم کو کشتی میں سوار کر لیا۔ اور آپ کی یہ بدسلوکی کہ ساری کشتی مسافروں سمیت ڈوب جاتی۔ اگر کشتی والے جلدی اسکی مرمت نہ کر لیتے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

خواجہ خضرؑ نے جواب دیا۔ دیکھو موسیٰ! میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میری غیبی باتوں کو سمجھ نہ سکیں گے۔ اور دخل درمعقولات کرینگے۔ وہی ہوا کہ آپ سے صبر نہ ہوسکا اور آپ نے سوال کرنے شروع کر دیئے۔

حضرت موسیٰ نے کہا بے شک مجھ سے غلطی ہوئی۔ درگذر کیجئے۔ اب میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گا۔

کشتی سے اترے تو راستہ میں ایک ... کھیلتا ... [illegible]

خوبصورت تھا۔ خواجہ خضرؑ نے چھری نکالی۔ اس خوبصورت بچے کو پکڑا اور زمین پر پچھاڑ کر ذبح کر ڈالا۔ حضرت موسیٰ یہ حرکت دیکھکر بہت پریشان ہوگئے۔ اور ایک دفعہ ہی خفا ہوکر انہوں نے کہا۔ آپ نے یہ کیا غضب کیا؟ ایک بے گناہ معصوم بچے کو بلاوجہ مار ڈالا۔

خواجہ خضرؑ نے جواب دیا۔ آپ پھر بولے! پھر آپ سے صبر نہ ہوسکا۔ میں کہے دیتا ہوں۔ خبردار میری باتوں میں دخل نہ دینا۔

حضرت موسیٰ نے پھر معذرت کی اور وعدہ کیا کہ آئندہ دخل نہیں دوں گا۔

اور آگے چلے۔ شام ہوگئی تھی۔ ایک بستی میں پہنچے بستی والوں نے ان کو ٹھہرنے کی جگہ دی نہ کھانے کو کچھ دیا۔ مجبوراً یہ دونوں بستی کے باہر ایک ٹوٹی دیوار کے پاس رات بھر بھوکے پیاسے پڑے رہے۔ صبح ہوئی تو خواجہ خضرؑ نے حضرت موسیٰ سے کہا۔ اٹھو! اینٹیں جمع کرو۔ گارا بناؤ! تاکہ ہم دونوں ملکر اس ٹوٹی دیوار کی مرمت کر دیں۔

حضرت موسیٰ چپ چاپ کھڑے ہوئے اور خواجہ خضرؑ کے ساتھ ملکر دیوار کی درستی کر دی۔ جب دیوار تیار ہوگئی تو حضرت موسیٰ سے صبر نہ ہوسکا۔ اور انہوں نے بے اختیار سوال کیا جس بستی کے آدمیوں نے ہمارے ساتھ یہ بدسلوکی کی کہ ہم کو آبادی میں ٹھہرنے نہ دیا۔ اور کھانا نہ دیا اس بستی کی دیوار کو بنانا عجیب بات تھی۔

خواجہ خضرؑ نے خفا ہوکر کہا۔ بس! موسیٰ!! اب میری اور آپ کی جدائی ہے۔ آپ نے ایک وعدہ توڑا۔ دوسرا وعدہ توڑا۔ اور اب پھر تیسری دفعہ میری غیبی باتوں میں دخل دیا۔ اب میں آپ کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ یہ کہکر کہا۔ اب سنئے! میں اپنی تینوں باتوں کی وجہ بتاتا ہوں۔

کشتی میں سوراخ کرنیکی وجہ یہ تھی کہ راستے کا ایک حاکم نئی کشتیوں کو لوٹ لیتا تھا اور کشتی والے نیک لوگ تھے۔ اس لئے میں نے کشتی کو عیب دار بنا دیا تاکہ ظالم کی لوٹ سے کشتی بچ جائے۔ اور بچے کا قتل کرنا اس لئے تھا کہ بچے کے ماں باپ بہت نیک خصلت تھے اور بچہ بہت بدخصلت تھا اس واسطے میں نے خدا کے حکم سے اس بچے کو مار ڈالا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اللہ تعالے بچے کے ماں باپ کو ایک اور نیک خصلت بچہ دینے والا ہے۔ دیوار بنانے کی حقیقت یہ ہے کہ اسکے نیچے چند لاوارث بچوں کا مال دفن تھا۔ اگر دیوار گر جاتی تو دفینہ کھل جاتا۔ اب بچے جوان ہونگے تو ان کا مال غیبی مدد سے ان کو مل جائے گا۔

یہ میری تینوں باتوں کا راز تھا۔ جن کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے آپ باوجود ... [illegible]

تفسیر

قرآن کی ان آیات کی تفسیر میں مختلف مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر میں اپنے ایک خاص مقصد کی حقیقت بیان کرنے کیلئے ان آیات سے حسب ذیل نتیجے نکالتا ہوں۔

(۱) پیغمبری کا میں بھی روحانیت ہوتی ہے۔ لیکن پیغمبر کے فرائض کا تعلق انسانوں کی سیاست یعنی ظاہری زندگی سے ہوتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے علاوہ ایسے انسان بھی پیدا کرتا ہے جو دنیا کی ظاہری زندگی میں مگر باطنی حالات سے باخبر ہوتے ہیں۔ اور خدا کے غیبی احکام ان کو ملتے ہیں اور غیبی احکام کی بنیاد پر وہ دنیا کے ظاہری کاموں میں دخل دیتے ہیں۔

(۳) قرآن کے اس بیان کی بموجب غور کرنے والے پر یہی اثر ہوتا ہے کہ باطنی آگاہی والوں کا درجہ پیغمبروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ ورنہ حضرت موسیٰ جیسے بڑے پیغمبر کو خدا حکم دے کر خواجہ خضرؑ[1] کے پاس نہ بھیجتا۔

(۴) چونکہ پیغمبروں کے فرائض سیاست اور انسانوں کی ظاہری حالت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس واسطے وہ اہل باطن کی غیبی باتوں سے ناواقف اور آگاہ ہوتے ہیں۔ جتنا وحی کے ذریعہ خدا ان کو آگاہ کرے۔

(۵) اہل باطن کی عظمت دلوں اور عقائد تک محدود رہتی ہے۔ دنیا کے چرچے اور تاریخوں میں عظمت انہی کی مانی جاتی ہے۔ جن کا تعلق انسانوں کی سیاست اور ظاہری زندگی سے ہو اور جن کی باتیں انسانوں کی عقل میں آسکتی ہوں۔

(۶) اس قرآنی مثال سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلام میں اہل شریعت اور اہل سیاست ظاہری پیغمبروں کے قدم بہ قدم ہوتے ہیں۔ اور اہل باطن یعنی درویش اور اہل طریقت ان انسانوں کے قدم بہ قدم ہوتے ہیں۔ جیسے خواجہ خضرؑ تھے۔

(۷) نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کے بادشاہ اور دنیا کے علماء ظاہری سیاست اور ظاہری شریعت اور ظاہری عقل یعنی مناہدات پر چلتے ہیں۔ اور اہل باطن اور اہل طریقت غیبی ہدایات اور غیبی احکام اور باطنی ہدایات کے کارندے ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں چرچا اور دھوم دھام اہل سیاست اور اہل شریعت کی ہوتی ہے۔ لیکن عقائد اور دلوں اور دماغوں پر قبضہ اہل باطن اور اہل طریقت کا ہوتا ہے۔

آصف جاہ اول

اب مجھے اس تمہید کی روشنی میں ہندوستان کی تاریخ پر کچھ لکھنا ہے۔ اگرچہ ہندوستان میں اور ساری دنیا کے ملکوں میں ہمیشہ سیاسی تبدیلیاں جاری رہتی ہیں۔ یعنی ہر ملک میں مختلف قومیں اور مختلف خاندان حکومتیں کرتے رہتے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں۔ اور ان تبدیلیوں اور انقلابات کے کچھ نہ کچھ اسباب بھی ہوتے ہیں مگر مجھے جس تبدیلی اور انقلاب پر کچھ لکھنا ہے۔ وہ ہندوستان کے موجودہ باشندوں کے لئے بہت زیادہ سبق آموز ہے۔ کیونکہ آج کل یہاں ایک بڑی اور آزاد خیال اور لائق اور شائستہ قوم حکمراں ہے جو ہندوستانی قوموں کو اپنی آزاد خیالی اور شائستگی کی بنا پر حکومت خود اختیاری دینے والی ہے جس سے ایک بڑا انقلاب پیدا ہوگا۔

اس واسطے میں اس وقت کی تاریخ کا ایک حصہ لکھنا چاہتا ہوں۔ جب وقت کہ مغل حکومت زوال میں مبتلا تھی۔ اور قدرت موجودہ انگریزی حکومت کے لئے میدان صاف کر رہی تھی۔ تاکہ وہ اپنا ایوان حکومت اس میدان میں بنا سکے۔ جب کسی حکومت کے رسم و رواج اور طرز معاشرت بدل جاتے ہیں یا ان میں بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ اور ان کی جگہ نئی حکومت کے رسم و رواج اور معاشرت کا طرز قابض ہو جاتا ہے

قدرت کا یہ بھی قاعدہ رہا ہے کہ وہ جب کسی حکومت میں تبدیلی پیدا کرتی ہے تو آنے والی حکومت اور اس ملک کے باشندوں کی عبرت اور سبق آموزی کے لئے کچھ پرانی نشانیاں ایک مخصوص مقام پر جمع کر دیتی ہے۔

پس ایسا ہی ہوا کہ جب مغل حکومت کا نامور اور زبردست اور صفات حکومت سے آراستہ شاہنشاہ اورنگ زیب دنیا سے رخصت ہوا تو کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ جس حکومت کو اورنگ زیب نے اکیاون (۵۱) برس سلطنت کر کے تمام ہندوستان میں مضبوط کر دیا تھا۔ وہ حکومت اورنگ زیب کے مرتے ہی اس طرح بکھر جائیگی جس طرح کہ وہ بکھر گئی۔

کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب کی اولاد میں خانہ جنگی ہوئی اور مرہٹوں اور سکھوں کی انقلابی تحریکوں نے اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا اس لئے مغل حکومت بکھر گئی اور پاش پاش ہوگئی۔ مگر میں اس خیال کا ساتھی نہیں ہوں۔ کیونکہ میں تاریخوں میں پڑھتا ہوں کہ تیمور کی اولاد ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے بادشاہوں کی اولاد حکومت کے لئے آپس میں خانہ جنگی کرتی آئی ہے۔ بابر کا بیٹا ہمایوں بھائیوں کی خانہ جنگی کے سبب ہندوستان سے بھاگا اور شیر شاہ کی افغان حکومت قائم ہوئی۔ اکبر کے خلاف اسکے بھائی حکیم مرزا اور اسکے بیٹے جہانگیر نے بغاوتیں کیں۔ جہانگیر کے خلاف اسکے بیٹے خسرو نے بغاوت کی۔ شاہجہاں نے تخت نشینی سے پہلے اپنے بھائیوں کو قتل کرا دیا تو پھر اورنگ زیب کی اولاد میں خانہ جنگی ہوئی۔ تو یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اسی طرح ہر زمانے میں انقلابی پارٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور وہ سلطنت سے ٹکراتی رہتی ہیں کبھی خود فنا ہو جاتی ہیں اور کبھی سلطنت کو تباہ کر دیتی ہیں۔

[1] خواجہ صاحب کے قلم سے یہ کیا الفاظ نکل گئے ہیں۔ غالباً خواجہ صاحب کا مطلب کچھ اور ہوگا۔ خواجہ صاحب آنکھوں کی معذوری کے سبب دوسرے سے لکھواتے ہیں۔ واحدی

لہٰذا اورنگ زیب کے بعد جو زوال ہوا اسکی وجہ خانہ جنگی نہ تھی اور مرہٹوں اور سکھوں کے انقلابات بھی نہ تھے۔ بلکہ قدرت اپنے ایک کُلیّے کو پُورا کرنا چاہتی تھی۔ اور اس کا کُلیّہ ہے کہ ایک شخص حکومت کو قائم کرتا ہے اور اس کے دو جانشین اسکے عروج کو انتہا تک لے جاتے ہیں۔ اور اسکے بعد قدرت ایسے اسباب پیدا کرتی ہے کہ زوال شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہندستان میں سب سے پہلے سلطان شہاب الدین غوری کے غلام قطب الدین ایبک نے سلطنت قائم کی۔ اور اس کے دو جانشینوں شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن نے اس حکومت کو عروج تک پہنچایا۔ اسکے بعد زوال شروع ہوگیا۔ اور حکومت خلجی خاندان میں آئی جس کا بانی جلال الدین خلجی ہوا۔ اور اسکے دو جانشین علاء الدین خلجی اور قطب الدین خلجی عروج کی تکمیل کا باعث بنے پھر قدرت نے تغلق خاندان کو کھڑا کیا۔ پہلا بادشاہ غیاث الدین تغلق ہوا جس کے دو جانشین محمد تغلق اور فیروز تغلق عروج میں رہے۔ پھر لودی خاندان آیا۔ بانی بہلول لودی تھا۔ جانشین سکندر لودی اور ابراہیم لودی تھے۔ اس کے بعد حکومت ختم ہوگئی اور بابر آیا۔ اس کے بیٹے ہمایوں کو شیر شاہ نے نکال دیا۔ شیر شاہ کے بعد سلیم شاہ اور عادل شاہ دو بادشاہ ہوئے۔ پھر بابر کے پوتے اکبر کو حکومت ملی۔ اور اس کے دو جانشین جہانگیر اور شاہجہاں عروج میں رہے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں اگرچہ زوال پیدا نہیں ہوا لیکن زوال کی بنیادیں قدرت نے رکھدیں۔

اورنگ زیب کے پانچ بیٹے تھے اور پانچ بیٹیاں تھیں۔ پانچوں بیٹے بھی حافظ قرآن تھے اور پانچوں بیٹیاں بھی حافظ قرآن تھیں۔ علوم دین اور علوم دنیا بھی بیٹوں اور بیٹیوں نے پورے حاصل کئے تھے۔ اور باپ نے اپنی اکیاون (۵۱) سالہ حکومت کے زمانے میں کوئی دقیقہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا باقی نہ چھوڑا تھا مگر قدرت کی مرضی غالب آئی۔ باپ کے مرتے ہی بیٹے آپس میں لڑے اور سب ختم ہوگئے۔ ایک بیٹا سلطنت کا وارث ہوا۔ جو بہادر شاہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ایک بیٹا جہاندار شاہ بادشاہ ہوا۔ جس کی تعلیم و تربیت خود اورنگ زیب نے نہایت ہی عمدگی سے کی تھی۔ مگر وہ تعلیم و تربیت کام نہ آئی۔ اور جہاندار شاہ اپنی لمبی ڈاڑھی سمیت لال کنور نام کی بیسوا کے ایسے دیوانے بنے کہ صوبوں کے گورنر اس رنڈی کے بھائی بنائے گئے۔ اسد خاں ایرانی وکیل مطلق کا بیٹا ذوالفقار خاں وزیر اعظم تھا۔ لال کنور نے بادشاہ سے شکایت کی کہ میرے بھائی کو آپ نے ملتان کی گورنری دی تھی مگر وزیر نے اب تک آپ کے فرمان کی تعمیل نہیں کی۔ بادشاہ نے وزیر سے وجہ پوچھی۔ وزیر نے جواب دیا۔ مجھے کچھ سارنگیوں اور طبلوں کی ضرورت تھی اب تک لال کنور کا بھائی نہ سارنگیاں لایا، نہ طبلے لایا۔ جہاندار شاہ نے ہنسکر پوچھا ذوالفقار خاں! تم سارنگیاں اور طبلے کیا کروگے؟ وزیر نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ آصف جاہ جیسے بہت سے امیر بیکار بیٹھے ہیں۔ کیونکہ صوبوں کی حکومتیں ڈوموں اور گویّوں کو دی جارہی ہیں۔ اس واسطے میں چاہتا ہوں کہ طبلے اور سارنگیاں مذکورہ امیروں میں تقسیم کردوں تاکہ اُن کی بے کاری کا مشغلہ ہو جائے۔

اب غور کرنے کی یہ بات ہے کہ اورنگ زیب نے جس طرح اپنے پوتے جہاندار شاہ کی تعلیم و تربیت میں کوشش کی تھی۔ آصف جاہ اوّل کی تعلیم و تربیت میں بھی کی تھی۔ مگر قدرت یہ چاہتی تھی کہ آصف جاہ کے ذریعہ مغل حکومت کی نشانیاں اور ہندستانی تہذیب اور اسلامی معاشرت کے آثار ہندستان کے ایک حصّے میں جمع کئے جائیں۔ اور مغل حکومت کو ختم کر دیا جائے اس لئے اورنگ زیب کی تعلیم و تربیت کا اثر جہاندار شاہ پر کچھ نہ ہوا۔ اور آصف جاہ پر سب کچھ ہوا کہ انہوں نے ہندستان کے جنوب میں ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی جس میں مغل حکومت کے آثار قدیم اور ہندستانی تہذیب و معاشرت اور اسلامی تہذیب و معاشرت کے تمام محفوظ ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ آج تک وہ سلطنت باقی ہے جس کی بنیاد قدرت کی مرضی کے موافق آصف جاہ اوّل نے رکھی تھی۔

آصف جاہ کے بزرگ توران سے ہندستان میں آئے تھے۔ جو ایک نامور درویش حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رضی کی اولاد میں تھے سہروردیہ خاندان کے روحانی خلیفہ صدیوں پہلے ملتان میں حضرت شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی تھے۔ جن کی اولاد کا تغلق اور خلجی بادشاہوں میں بڑا رسوخ تھا۔ مگر آصف جاہ پر اورنگ زیب کی نظر بہ حیثیت پیرزادے اور درویش کے نہیں پڑی تھی۔ بلکہ اورنگ زیب نے آصف جاہ کو بہ حیثیت ایک تورانی امیرزادے کے تعلیم و تربیت دی تھی۔

اورنگ زیب کے بعد اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوئی تو اسد خاں ایرانی وکیل مطلق کے بیٹے ذوالفقار خاں نے دانستہ اس خانہ جنگی کو اس طرح بھڑکایا کہ سب دعوے دار ختم ہو گئے اور صرف بہادر شاہ باقی رہ گیا۔ بہادر شاہ کے بیٹے جہاندار شاہ کے دور میں بھی ذوالفقار خاں وزیر اعظم رہا اور اس کا باپ اسد خاں وکیل مطلق رہا۔ اورنگ زیب کا ایک پوتا فرخ سیر پٹنے میں تھا۔ اُس نے اور اس کی ماں نے بارہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے دو سیدوں عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کی خوشامد کرکے اپنا مددگار بنایا۔ اور اُن کو ساتھ لیکر جہاندار شاہ سے لڑنے گیا۔ دلّی کے قریب لڑائی ہوئی۔ جہاندار شاہ اپنی رنڈی لال کنور کے ساتھ میدان جنگ سے

تو حسین ہے تیرا حسن لازوال
مجھ کو محوِ آرزو رکھتا ہے کیوں
"میں تو تم کو جانتا تک بھی نہیں
کس لئے ——— پھر
میرے دل میں اضطراب شوق کی یہ دھڑکنیں
مجھ کو بیداری کا دیتی ہیں پیام

اور ———
جانب آسماں کے اک ستارہ دیکھ کر
غم میں کھو جاتا ہوں" میں"
وفعتاً
مجھ کو یہ ہوتا ہے گمان
تو بھی میرے غم میں ہے باہم شریک
کیا یہ ممکن ہے ؟
یہ ممکن ہی نہیں ! ———
میں تو تم کو جانتا تک بھی نہیں
مفلسی کے آنسوؤں میں کس طرح
جرأتِ اظہار پیدا ہوگئی
اور
افشا کر رہے ہیں میرا راز
جو چھپا رکھا تھا میں نے
آج تک
تاکہ تجھ سے آشنا ہو جائے
تو ؟ ——— "میں تو تم کو جانتا چاہتا نہیں"

خاموش ارادے

از جناب علی احمد رفعت بہاولپور

ناتواں جان کے خاموش ارادوں کی قسم
تو اگر کہہ دے کہ" طوفان کی موجوں سے لڑو
میں تمہاری ہوں جو باہمت مردانہ بڑھو"
عمر بھر گردشِ دوراں سے لڑے جاؤں گا
مجھ کو گرداب یہ درماندہ نہ کر پائیں گے
بحرِ ذخار بھی کم کر نہ سکے گا بے دم

ہاتھ میں دہشت و تخریب کا پرچم لے کر
داغ ذلت کے مٹا دوں گا سبھی
اور پھر رکھوں گا تعمیر کی بنیاد نئی
توڑ کر" اطلس و ابریشم و کمخواب" کا جال
اپنے اسلاف کی عزت کو چھڑا لاؤں گا
اپنا خون، اپنی یہ بے داغ جوانی دے کر

اور اگر تو نے مری جانِ بہار
جنبشِ گوشۂ ابرو سے اشارا نہ کیا
یعنی بازوئے محبت کا سہارا نہ دیا
ایک دن پستی و ذلت کے گڑھے میں گر کر
یونہی گمنام ہی، بے نام ہی مر جاؤں گا
سوئی تقدیر نہ ہوگی بیدار

سید سجاد حیدر یلدرم
بحیثیت شاعر

(از جناب مشتاق احمد صاحب زاہدی)

سید سجاد حیدر صاحب یلدرم کی شہرت بحیثیت ایک ایسے مصنف اور مضمون نگار کے ہے جس نے ایک پسندیدہ طرز تحریر کی طرح ڈالی۔ لیکن عام طور پر ان کے مضامین کے شائقین کو یہ معلوم نہیں کہ سید صاحب موصوف شاعر بھی تھے۔ اگرچہ انہوں نے شاعری کو کبھی خود یہ عزت نہیں بخشا۔ اور نہ کبھی شاعر ہونے کا دعویٰ کیا۔ بلکہ جب ان کو لکھنؤ کے ٹریننگ کالج والوں نے اپنے مشاعرے کا صدر بنایا تو انہوں نے تمسخر کے طور صدارت کرتے ہوئے ذیل کی نظم میں اس طرح شاعری کے دعوے سے انکار کیا ہے۔ اور آئندہ کیلئے صدارت سے معافی مانگی ہے۔

کیا مجھ کو کیا ہے صدر مجلس — کیوں مجھ کو عطا ہوئی یہ جاگیر
اب دیکھئے تخت پہ ہوں بیٹھا — منبر پہ ہو جیسے واعظ پیر
مانا کہ ہے میرا نالہ دلکش — ہے دل میں تڑپ زباں میں تاثیر
رنگینی بھی ہے سخن میں ایسی — ہوتا ہے جوان عالم پیر
ہے توسن طبع شوخ و طرار — چال اس کی کڑی کمان کا تیر
لیکن نہیں شاعری کا دعویٰ — ہاں نثر میں کچھ کیا ہے تحریر
یہ تو تی محض ہے دگرنہ — کیا ہیچمداں کی ہیچ تحریر
گو مانتا ہوں شعر کا میں شیدا — بس اس لئے ہے مری یہ توقیر
مشکور ہوں سبھی نوجوانان — کی قدر ادب شناس تقصیر
اس بزم میں ایک ادیب کہنہ — کیوں لائے ہیں آپ بہر تشہیر
تھا گوشہ انزوا میں مخفی — کیوں کھینچ کے لائے پا بہ زنجیر
ممنون کرم ہوں لیکن اب تو — ہے تیسری مرتبہ یہ تقریر
رسم است کہ مالکان تحریر — آزاد کنند بندۂ پیر

سید سجاد حیدر صاحب اس معنی میں شاعر یقیناً نہ تھے کہ وہ بڑے بڑے مشاعروں میں داد سخن حاصل کرتے اور صاحب دیوان ہوتے۔ لیکن اس معنی میں شاعر ضرور تھے کہ شعر کہتے تھے اور اچھا شعر کہتے تھے۔ ان کا توسن طبع جس طرح نثر میں شوخ و طرار تھا اسی طرح نظم میں بھی بگولے باتیں کرتا تھا۔ "مرزا پھویا" کے عنوان سے جو نظم انہوں نے طالب علمی کے زمانہ میں اب سے چالیس برس قبل لکھی تھی۔ ان کے مضامین کے مجموعے خیالستان میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ نظم شروع میں "متفنن طبع" ایک دو ورقی اخبار میں نکلی تھی۔ یہ اخبار علی گڑھ کالج میں خفیہ طور پر طلبا کے تفنن طبع کے لئے وقتاً فوقتاً نکلا کرتا تھا۔ کبھی دستی لکھا ہوا اور کبھی چھپا ہوا۔ یہ نظم چونکہ عام طور پر مشہور ہے۔ اس لئے اس موقعہ پر اسکے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اسکی شان نزول دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ اس نظم میں لکھنؤ کے ایک نوجوان علی گڑھ کالج میں نئے نئے داخل ہو کر اپنے گھر خط لکھتے ہوئے کالج کی زندگی کی مصائب کا رونا روتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ ان نوجوان صاحب کی تصویر جو سید سجاد حیدر صاحب نے کھینچی ہے وہ "مرزا پھویا" کے نام ہی سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ "مرزا پھویا" کالج میں "خالہ اماں" کہلاتے تھے۔ کیونکہ جس دن پہلی دفعہ یہ اکے سے اتر کر بورڈنگ میں داخل ہوئے ہیں تو حضرت ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے تھے اور پاؤں میں گھیتلی جوتی۔ اور لطف یہ ہے کہ ہاتھ میں ایک پاندان لٹکائے ہوئے تھے۔ اس ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی یار لوگوں نے ان پر خالہ اماں کی پھبتی کہدی۔ جو ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ گئی۔ مگر سید صاحب نے اپنی نظم میں انکو "مرزا پھویا" کا خطاب دیکر ان کے حلئے کو بدل دیا۔ ان صاحب کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں صرف اتنا پتہ کافی ہے کہ وہ ہمارے مشہور قومی کارکنان میں سے ہیں۔ ایک زمانے میں جیل کی ہوا بھی کھا آئے ہیں۔ مزدوروں کے زبردست حامی ہیں اور ہندوستان کے مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ اگرچہ وہ بہت مالدار بھی ہیں اور اس لئے جاہ پرست ان کو لیڈر نہیں مانتے۔ لیکن ان کو لیڈر بننے کی حسرت بھی نہیں۔

سید صاحب موصوف کی چند ایسی نظمیں میں پیش کرتا ہوں جو انہوں نے گذشتہ چند سال میں لکھی ہیں۔ ان میں سے بعض اخباروں میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ "خطاب بہ نوجوانان" کے عنوان سے ۱۵ دسمبر سنہ ۴۲ء کو انہوں نے ایک نظم لکھی تھی جس میں شاعر ادیب و اہل قلم کی زندگی کو ناکامیاب اس لئے دکھایا گیا ہے کہ ان لوگوں نے علم کو عمل سے جدا کر دیا۔ فرماتے ہیں ؎

میدان جد و جہد میں اے نوجوان اٹھ — کب تک پڑے رہوگے یونہی کوئے یار میں
کب تک تتبع دلبری شاہد سخن — مانا کشش بلا کی ہے اس سحر کار میں
میں جانتا ہوں لذت ذوق سخن ہے کیا — پھنس رہ چکا ہوں میں اسکے خمار میں
دنیائے حسن و عشق ہی پیش نظر رہے — داخل ہوا نہ زیست کے میں کارزار میں
بیٹھا رہا ہوں سوز بتاں سے کئے ہوئے — غالب کا بن شعر کے ہوں انتظار میں

سید تجاد حید ر صاحب خوش نصیب تھے لہذا انکو اس عمر میں بھی عزت کی زندگی بسر کرنے کو ملی۔ جب نواب صاحب چھتاری حیدرآباد میں اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوئے وطنی ہونے کے ناطے سے جو ان کو علی گڑھ والوں سے تھا سید صاحب موصوف نے ذیل کے چند اشعار سر احمد سعید خاں صاحب کی شان میں معنون کرکے "سرگزشت" میں شائع کروائے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نواب صاحب والا شان نے ان اشعار کو خوشخط لکھوا کر اپنے کمرے میں نصب کرا لیا ہے۔ حقیقت میں سید صاحب نے جو نصیحت کی ہے وہ سونے کے حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہو۔۔۔

وہ فاتح قلوب دلوں کا وہ حکمراں — پرچم ظفر کا کھول کے ہوتا ہے پھر رواں

ہندوستاں کے جب ہے فتح دکن کا عزم — نصرت تمہیں نصیب سر احمد سعید خاں

اللہ نے کیا ہے تمہیں صاحب نفوذ — اور شاہ نے کیا ہے رعایا کا پاسباں

کوشش یہ ہو کہ خلق خدا کا رہے خیال — اور یہ نہ ہو، ہمارا ہی ہیں شہ کا آستاں

سونپی گئی ہیں تم کو دکن کی مقدرات — اب اس کو خار زار بناؤ کہ گلستاں

ہو معدلت اساس سیاست مدار کار — نصفت شعار نیک کردار کا رہاں

لازم ہو قلع قمع کرو اہل جور کا — اوروں کے واسطے ہو خطا بخش و مہرباں

بلوامد دل نواز و کرم گستر و جواد — زرپاش و سیم پاش و گہر بار و گلفشاں

ہو غلغلہ دکن میں کہ ہاں آ گیا وزیر

حق کوش حق شناس بہی خواہ و قدرداں

سید صاحب موصوف گو کہ اب خاصے عمر رسیدہ ہو گئے تھے اور جتنے کے ہمیشہ سے دھان پان تھے اور ذیابیطس جیسی بیماری نے انکا کس اور بھی نکال دیا تھا لیکن ان کی سیماب طبیعت ان کو ایک جگہ نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ اور جیسا پہلے ذکر ہو چکا ہے بیماری میں بھی وہ سفر سے نہ گھبراتے تھے۔ چنانچہ مرنے سے ایک سال قبل کابل کی بھی سیر کر آئے تھے۔ اور یہ سب کچھ وہ اس وجہ سے کر سکتے تھے کہ وہ کبھی ہمت نہ ہارتے تھے اور زندگی کی کشمکش میں وہ آخر وقت تک چلتے رہے۔ اور یہ ہمت نہ ہارنے کا سبق وہ اوروں کو بھی پڑھاتے رہتے تھے۔ چنانچہ راقم الحروف نے ایک دفعہ طویل بیماری کی اذیتوں سے تنگ آکر دو سال ہوئے ایک مایوسانہ خط ان کو لکھا۔ افسوس ہے کہ اس کی نقل میں نے اپنے پاس نہیں رکھی۔ اس لئے وہ شائع نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو اس کا جواب سجاد صاحب نے دیا وہ پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ چونکہ میرا خط منظوم تھا۔ اس لئے جواب بھی نظم میں ہے۔ اس نظم سے ان کے اصلی خیالات خوب واضح ہوتے ہیں۔

ایک غمزدہ دوست کے نام

نہ مرنے کی کرنا کبھی آرزو — شکستہ نہ کر اپنا جام و سبو

بچاتا ہے جاں کو ہر اک جاندار — وہ بدبخت ہو یا کہ ہو کامگار

وہ بلبل کہ جو ہے اسیر قفس — اسے بھی ہے جینے کی از بس ہوس

ادھر دیکھو ہر ایک شیر ژیاں — وہ سلطان صحرائے وحشت نشاں

ادھر ہے اک آہوئے چالاک و تیز — وہ آنکھیں رسیلی ہوا میں وہ خیز

جھپٹتا ہے آہو پہ شیر ژیاں — وہ آہو چلا جیسے تیر از کماں

یہ کیا ہے؟ یہ ہے آرزو زیست کی — اسی سے ہے سب آہ و ہو زیست کی

وہ شہباز جنگ اور تیز پر — ادھر آسماں سے ہے جس کا گزر

کبوتر کو پنجے میں اس نے لیا — کبوتر چھٹا بھی تو کے دن جیا

مگر کس قدر پھڑپھڑاتا ہے وہ — اور اپنے کو آخر چھڑاتا ہے وہ

ہے آغشتہ خوں سے تن نازنیں — مگر خواہش زیست دل میں مکیں

اگرچہ امید رہائی نہیں — قفس میں بھی ہے نعرۂ دلنشیں

غرض زاہدی یہ نصیحت سنو — جیو گرچہ جینے میں غم ہی سہو

مگر کر رہا ہے یہ جو وعظ و پند — نہیں خود نصیحت پہ وہ کاربند

وہ دنیا سے نومید و بیزار ہے — الم و رنج کا اس پہ انبار ہے

وہ قلب حزیں و دل دردمند — وہ سوز دروں و فغان بلند

شب و روز و صبح و مسا تلخ کام — چہ خوش دادہ ام زندگی را نظام

پھر بھی ہم پہلو ہماری وہی تنہائی ہو

[illegible]

عشق میں حسن کے جلووں کی جو رعنائی ہو
میرے ہاتھوں سے مکمل تری انگڑائی ہو

دل بھی اٹکا ہو طبیعت بھی کہیں آئی ہو
خوبیٔ عشق اِسی میں ہے کہ رسوائی ہو

کیا عجب باعثِ بربادی و رسوائی ہو
وہ طبیعت جو کہیں پہلے پہل آئی ہو

دیکھنا حسن کے جلووں کا ہنسی کھیل نہیں
جس کو بننا ہو تماشا وہ تماشائی ہو

آرزو ہے کہ برا بھی کہیں تو آپ کہیں
حسن کے ساتھ مرے عشق کی رسوائی ہو

مجمعِ حشر میں کیا اُن سے کہوں راز کی بات
یہ تو جب ہو کہ میسر مجھے تنہائی ہو

جان سکتے نہیں اِس رمز کو بے جان دیئے
ہم جو مر جائیں تو اظہار مسیحائی ہو

اب جو میں نام بتا دوں تو قیامت آجائے
مجھ سے وہ پوچھتے ہیں کس کے تمنائی ہو

اے فغاں کیا کہوں کہنے میں حجاب آتا ہے
تیرے ہوتے مرے جذبات کی رسوائی ہو

عاشق و عشق زمانے میں رہیں گے کیونکر
اُن کو یہ ضد ہے نہ سودا ہو نہ سودائی ہو

حشر میں یہ کبھی چاہے گی نہ غیرت میری
ساری دنیا ترے جلووں کی تماشائی ہو

سجدۂ عشق و وفا کی یہ نرالی تاکید
آستاں ہو کہ نہ ہو ذوقِ جبیں سائی ہو

دل بھی کہتا ہے برا وہ بھی سمجھتے ہیں برا
اور اب اِس سے سوا کیا مری رسوائی ہو

توڑ لے ہاتھ بڑھا کر جو فلک کے تارے
کیا عجب وہ کسی مخمور کی انگڑائی ہو

دل میں آئے تو مرے دل سے نکل جائے بھی
ہے تمنا کہ تمنا کی نہ رسوائی ہو

ناوک و دل کبھی ملتے ہیں تو کس لطف کے ساتھ
جیسے اِن دونوں میں برسوں کی شناسائی ہو

پھر دکھائے جو محبت اسے دیکھے کوئی
شرط پہلی ہے یہی پہلے تمنائی ہو

ہم اِسی وجہ سے فریاد کئے جاتے ہیں
خامشی بھی نہ کہیں باعثِ رسوائی ہو

چشمِ بد دور فروغِ رخِ تاباں نہ سہی
کوئی جگنو بھی چراغِ شبِ تنہائی ہو

شوقِ دیدار تو کہتا ہے کہ چلئے چلئے
اور جو حشر میں جا کر مری رسوائی ہو

پردہ داری کا تقاضا کہ نگاہیں نہ اٹھیں
خود نمائی کا اِشارا کہ تماشائی ہو

کیا کہا، اور اٹھاؤ کوئی طوفان جدید
آپ یہ چاہتے ہیں نوحؔ کی رسوائی ہو

ساون رین کا سپنا

(از جناب سید ممتاز علی شکوہ لاہور)

نیلے آکاش پر کالے کالے بادل ——— جیسے اندر لوک سے نگھم ودت جی کا رتھ نکلا ہو۔ یا جیسے شری گنیش جی مہاراج جھومتے جھامتے چلے آتے ہیں۔

مست ہاتھیوں کی طرح ادھر اُدھر دوڑنے والے بادل دیکھتے ہی دیکھتے سارے آکاش پر چھا گئے۔

دور بادلوں میں کہیں سارسوں کی کوئی قطار نظر آ جاتی ہے تو برہ کی ماری شیاما تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ آج وہ خود اُڑ کر اُن میں شامل ہو جانے کیلئے بیاکل ہے۔ دکھی شیاما مجبوری ہی کبھی اس طرح بازو پھیلا دیتی ہے جیسے پر تول رہی ہے۔ سارسوں کو پردیسی موہن کے نام سندیسہ دینا چاہتی ہے۔ اور کہتی ہے۔

"کب آؤ گے شیام۔ ساون بیت چلا"

وہ وچاروں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر بڑبڑانے لگتی۔

"شیام موہن نے کہا تھا۔ میری اپنی شیاما شروع ساون ہی میں آ جاؤں گا۔ پر تم کتنا ہی بیاکل نہ ہوتا"

پرنتو آدھا ساون بیت گیا اور موہن نہیں آیا۔ مُرلی کی ٹیر جس پر تن کے ہرگز رُک جایا کرتے تھے۔ گو نہیں کان کھڑے کر کے سُنا کرتی تھیں۔ نہیں سُنائی نہیں دیتی۔

——— ۲ ———

بجلی کوندی ——— بادل گرجا ——— ننھی ننھی پھوار پڑنے لگی۔ سکھیوں نے انبہ کے پیڑوں میں جھولا ڈالا ——— کہیں اور پکوان پکنے لگے ——— کڑاہی میں بڑا پڑا ——— بھینی بھینی خوشبو اُڑنے لگی ——— مدھر گیتوں کی آواز سے شیاما کے ہردے میں ہوک اُٹھی ——— سکھی نے اُداس دیکھ کر کہا۔

"اری شیاما ——— ساون رُت میں مینہا کی بہاریں چپ بیٹھ کر کھو رہی ہو ——— چل سکھی ——— آ جھولا جھول۔ نہیں تو رُت کا اپمان ہوگا۔ اری! تیری انکھیاں تو نیر سے بھری ہیں۔ یہ کیوں؟

بھولی! اے چل اُٹھ ——— نہیں تو میں موہن سے کہہ دوں گی پھر وہ تجھ سے روٹھ جائے گا ——— تیرے منائے بھی نہ منے گا"

شیاما نے نیر پی کر کہا:۔

"اے سکھی! موہن سے نہ کہنا ——— میں چلتی ہوں۔ موہن کی یاد میں جھولوں گی۔ بھیگی ہوئی ڈالیاں چھو لوں گی۔ اور گاؤں گی :۔

ایک جھولا ڈالا میں نے

موہن کی یاد میں۔ موہن کی یاد میں

مینہا کی بوندیاں دی۔ ڈالی کا مورا چومنا

پرنتو موہن کا دھیان کرنا، کہیں دھکا نہ دیدے۔ وہ جھولا جھلائے گا۔ میں جھول کر گاؤں گی۔

ایک جھولا ڈالا میں نے

موہن کی یاد میں۔ موہن کی یاد میں

چھوٹی بڑی کلیاں دی۔ پی پی کے مورا جھومنا

ایک جھولا ڈالا . . . .

موہن ہنسے گا۔ ٹھٹھول کریگا ——— میں لجاؤں گی۔ پھر تم سب چپکی رہنا پرنتو تم تو سب ٹھٹھے لگاؤ گی۔ تالیاں بجاؤ گی۔ اور مجھے اکیلی چھوڑ کر بھاگ جاؤ گی ——— بڑی چنچل ہو ——— مجھ میں نہیں جاتی ——— پر یہ تو بتاؤ ——— وہ ——— کیوں نہیں آیا ——— میرا موہن

——— ۳ ———

شیاما نے سپنا دیکھا ساون رین کا سپنا

مینہ کا شور بڑھا مور کی پکار نے اُسے بیاکل کر دیا۔ کوئل کی کوک نے کومل ہردے میں ٹیس پیدا کر دی۔ اُس نے کھڑکی سے ہاتھ باہر کیا اور موٹی موٹی بوندیں اُس کے ہاتھ پر گریں۔ جن کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے

"کتنا سندر سپنا تھا"

ساون رین کا سپنا

غزل

باثروت ہیں وہ نظریں کس قدر میرے لئے
بن گئی ہیں چاکِ دل کی بخیہ گر میرے لئے

اے قیامت یہ ترا نا شور و شر میرے لئے
تجھ کو آتا تھا یہ اندازِ دگر میرے لئے

اہتمامِ خاص کرتی ہے سحر میرے لئے
پھول کے دامن میں بھرتی ہے گہر میرے لئے

چاندنی سے شب کو لیتا ہوں ردائیں نور کی
دن کو لاتی ہیں شعاعیں تاجِ زر میرے لئے

میری خاطر گھومتی ہے اپنے محور پہ زمیں
اور ستارے ہیں سرگرمِ سفر میرے لئے

مسکرانے جو شفق سے وہ کرن بن بن گئی
پردۂ زر تار میں ترچھی نظر میرے لئے

دل کی دھڑکن میں اضافہ دم بدم ہوتا گیا
جانے کیا پیغام لائی وہ نظر میرے لئے

رات بھر آنکھوں میں ناچیں موت کی پرچھائیاں
دیکھئے کیا رنگ لاتی ہے سحر میرے لئے

حسن کا پرتو نظر آتا ہے دھندلایا ہوا
کیا قیامت بن گئی ہے چشمِ تر میرے لئے

کوئی تو منظور اپنا بھی انیسؔ غم ہوا
بادلوں کی آنکھ روئی رات بھر میرے لئے

اندھا

ایک اندھا بارِ ہستی سے نڈھال
اپنا پھیلائے ہوئے دستِ سوال
بے نیازِ مرحبا و الاماں
ناشناسِ فکرِ ہر اوج و زوال
آشنائے گردشِ فردا و دوش
محرمِ ضرباتِ نبضِ ماہ و سال
انقلابِ دہر پیشانی پہ ثبت
یادگارِ عیشِ ماضی خستہ حال
دوشِ ہستی پر گراں، بارِ الم
بارِ فرقِ عمر پہ گردِ ملال
ہر قدم پر تنگ میدانِ حیات
فرطِ غم سے سلب پروازِ خیال
نعشِ ہستی کا کفن موئے سفید
ماتمِ عہدِ جوانی خندہ و حال
ہر نفس میں موت کی سی ہچکیاں
سر سے پا تک ایک گرجے کی مثال
کھا رہا ہے در بدر کی ٹھوکریں
بے خبر ہیں صاحبانِ جاہ و مال
حیف تجھ پر عالمِ تہذیب نو
کیا یہی ہے تیرا آغاز کمال

اسمعیل ڈاکو

از فصیح الدین احمد

۱۸۵۵ء کا ذکر ہے جبکہ ہندوستان میں ہر جگہ ریل کا جال نہیں پھیلا تھا۔ اس وقت قافلوں کے ساتھ پولیس کے دستے یا فوج کے سپاہی نگہبانی کے لئے جاتے تھے۔ مسلح ہونے کے علاوہ یہ قافلے اونٹوں، خچروں اور ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے۔ شمالی ہند سے ایک بڑا قافلہ دکن کی طرف روانہ ہوا۔ اس قافلے میں بارہ سو مرد، عورتیں اور بچے شامل تھے۔ یہ قافلہ دکن سے صرف چند منزل کے سفر پر تھا کہ بارش شروع ہوگئی اور موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہوا۔ برساتی ندی نالے سب بھرے ہوئے تھے بلکہ کہیں کہیں طغیانی بھی آرہی تھی۔ راستہ بہت دشوار گزار ہوگیا تھا۔ اس لئے قافلہ کو ستارا پر دو ہفتہ کیلئے ٹھہرنا پڑا۔

ستارا اس زمانہ میں معمولی قصبہ کی حیثیت رکھتا تھا جس کے چاروں طرف وندھیاچل پہاڑ کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ گھنے جنگل تھے جو جنگلی درندوں کا مسکن بنے ہوئے تھے۔ قافلہ کے ساتھ ایک انگریز پولیس افسر سمتھ نامی بھی تھا شکار کا بہت شوقین تھا اور نشانہ بھی اچھا لگاتا تھا۔ قافلہ کی بدقسمتی سے شیر کا ایک جوڑا جس کے منہ کو انسان کا لہو لگ چکا تھا روزانہ قافلہ پر شب خون مارا کرتا تھا۔ اور دو چار آدمیوں کی جانیں تلف ہوجاتی تھیں۔ لوگ بہت خوفزدہ اور پریشان تھے۔ انہوں نے محافظوں سے امداد مانگی۔ انگریز افسر سمتھ نے ایک سپاہی کو ساتھ لیا اور ایک پرانے اور سدھے ہوئے ہاتھی پر ہودہ لگاکر شام ہوتے شیر کی تلاش میں جنگل میں نکل گیا۔ یہ لوگ تھوڑی دور گئے ہونگے کہ ہاتھی کا پاؤں پھسلا اور سپاہی گر کر زخمی ہوگیا۔ سمتھ نے سپاہی کو واپس [illegible] بھیج دیا۔ اب سمتھ اور حسین مہاوت باقی رہ گئے۔ دونوں آدمی ہاتھی پر سوار جنگل میں چلے جارہے تھے کہ یکایک آندھی اور مینہ کا طوفان آیا۔ اور یہ راستہ سے بھٹک گئے۔ اتنے میں رات ہوگئی۔ اور ان کو مجبوراً ہاتھی کی پیٹھ پر رات بسر کرنی پڑی۔

رات بھر مینہ برستا رہا [illegible] صبح کو یہ لوگ بہت سست اور مضمحل ہو رہے تھے۔ ہاتھی سے اُتر پڑے اور ادھر اُدھر پھر کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ دُور دُور جہاں تک نظر جاتی تھی گھاس، ٹیلے اور جنگل کا لامتناہی سلسلہ دکھائی دیتا تھا۔ مجبوراً پھر ہاتھی پر سوار ہوئے اور سورج کی سمت سے اندازاً راستہ تلاش کرتے ہوئے چلنے لگے۔ کوئی دو گھنٹے کے قریب چلے ہونگے کہ انہیں کچھ فاصلہ پر چیلیں اور کوے اُڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہ سمجھے کہ شاید نزدیک ہی کہیں آبادی بھی ہوگی۔ اس لئے جلدی جلدی ہاتھی کو ہنکاتے ہوئے اس طرف روانہ ہوئے۔ جب اُس مقام پر پہنچے جہاں چیل اور کوے منڈلا رہے تھے تو انہوں نے دیکھا کہ درختوں کے جھنڈ کے درمیان کچھ نیم خوردہ انسانی لاشیں پڑی ہوئی ہیں جن کو غالباً شیر نے ہلاک کیا تھا۔ یہ دیکھ کر اور اس خوف سے کہ شاید شیر پھر اپنے پس ماندہ کی تلاش میں واپس آجائے۔ یہ لوگ جلدی واپس لوٹے اور ہاتھی پر سوار ہوگئے۔ بھوک اور تکان کی وجہ سے اب ان میں [illegible] کی ہمت باقی نہ رہی تھی۔ ہاتھی پر سوار ہوکر پھر چلنا شروع کیا۔ راستہ میں ان کو ایک ندی دکھائی دی۔ یہ لوگ اُتر پڑے۔ ہاتھ منہ دھویا۔ پانی پیا اور وہیں ہری گھاس پر لیٹ گئے۔ سمتھ سو گیا اور مہاوت پہرہ دیتا رہا۔ پھر سمتھ اُٹھ بیٹھا اور مہاوت سوگیا۔ جب دو تین گھنٹے [illegible] آرام کر لیا تو یہ لوگ ہاتھی پر سوار ہوکر ندی کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ کوئی دو تین فرلانگ گئے ہونگے کہ ان کو جنگل سے شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی۔ یہ چوکنے ہوگئے اور سمتھ نے بندوق سنبھال لی۔ کچھ دیر تک شیر کی آواز آتی رہی پھر کچھ آدمیوں کا غل سنائی دیا۔ غل سنکر ان کی جان میں جان آئی اور ان کو امید ہوئی کہ کہیں قریب ہی انسانی آبادی کا سراغ بھی مل جائیگا۔ یہ لوگ اسی غل کی طرف روانہ ہوئے لیکن کچھ دور جانے پر معلوم ہوا کہ گاؤں سے شیر گائے اُٹھا لایا تھا اور دیہاتی اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ جب شیر گائے کو کھا رہا تھا دیہاتی اس کے سر پر پہنچ گئے۔ شیر نے گائے کو چھوڑ دیا اور ان سب کی خبر لے ڈالی۔ تین آدمی مر چکے تھے اور ایک نیم مُردہ تھا جس نے ساری واردات بیان کی۔ اور یہ بھی پتہ لگا کہ کوئی دو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے جہاں سے یہ لوگ شیر کے تعاقب میں نکلے تھے۔ انہوں نے زخمی کے پٹیاں باندھیں اور ہاتھی کے ہودہ میں ڈال لیا اور گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔ تھوڑی دُور گئے ہونگے کہ جنگلی کتوں کے ایک لشکر نے ان کو گھیر لیا۔ جنگلی کتا شکل و صورت میں بھیڑیے سے مشابہ ہوتا ہے اور بھیڑیے سے کچھ کم خونخوار بھی نہیں ہوتا۔ یہ تینوں ہاتھی پر سوار تھے۔ اور کتے چاروں طرف سے ان پر یورش کر رہے تھے۔ وہ لمبی لمبی جست لگاتے اور ہاتھی کی پیٹھ تک پہنچ جاتے تھے۔ ہاتھی حتی الامکان کتوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اکثر

کوئی بہت گھبرائے ہوئے بیٹھے ہونگے جو ڈاکو واپس گاؤں لوٹے جیسا کہ گاؤں میں داخل ہوکر اپنے ٹھکانوں میں پہنچے تو وہاں کی تواضع ہندوؤں کی گولیوں سے کی گئی۔ بہت سے مارے گئے اور باقی گرفتار کر لئے گئے۔

ڈاکوؤں کے اس خوفناک گروہ کے گرفتار ہو جانے سے ضلع ... کا علاقہ انسانی درندوں سے پاک ہوگیا۔

یاد!

از جناب تمکر تونسوی

نشیلا باد اپنے ریشمیں بالوں کو بکھرائے
فلک کے ساز پہ جب جھومے ہوئے گنگنا ئیگا
تو اس مدہوش عالم میں تڑپ کر آٹھیگا دل تیرا
اور اس دھڑکن میں اک مغموم سایہ تھرتھرائیگا

تب اے جانِ بہاراں! میں تجھے یاد آہی جاؤنگا

کبھی جب بانسری کی نے میں اپنی سسکیاں گھولے
کوئی مہجور چرواہا لب جو آ کے گائے گا
تو روکے گی اسے پلکوں پہ اپنی لاکھ روکے گی
مگر رخسار پہ آنسو کا آنسو ڈھل جائے گا

تب اے جانِ بہاراں! میں تجھے یاد آہی جاؤنگا

بنی ہوگی افق پہ شام کو جب شنگرفی دھاری
اور اس رنگین دھاری پہ دو آغوشیں کھلی ہونگی
ترقی باہوں میں کبھی اک دائرہ بن بن کے ٹوٹے گا
گئی گزری ہوئی شامیں نظر میں گھومتی ہونگی

تب اے جانِ بہاراں! میں تجھے یاد آہی جاؤنگا

بھری برسات میں جب کہ سہانی گیت گانے کو
کئی سکھیاں انگن میں چھم چھم کرکے آئینگی
بگاڑ میری چنچل سکھیں گی اس جانی ہوئی لے پر
کئی بوجھل ہونٹوں کو چھیڑ کر اس لے کو ڈھونڈینگی

تب اے جانِ بہاراں! میں تجھے یاد آہی جاؤنگا

کھنچ گیا میں جب پریشاں دوستی پائی گئی — دل میں ہے جو بھی نظر میں وہ بھی پائی گئی
ظاہری چشمک تو ہوتی ہے محبت کی دلیل — روح کی گہرائی میں برگشتگی پائی گئی
اس میں کیا میرے غرورِ عشق پہ الزام ہے — تیری جانب سے محبت میں کمی پائی گئی
تیرے جلووں سے مرا ذوقِ نظر تھا فیض یاب — تو نظر آیا جہاں تک روشنی پائی گئی
رفتہ رفتہ تو مری نظروں سے اوجھل ہوگیا — خود ہی پردے پڑ گئے جب تیرگی پائی گئی
ہوش والوں سے یہ راہ و رسم نبھ سکتی نہیں — تیرے ہر انداز میں دیوانگی پائی گئی
جب بھی میں پاتا تھا الفت میں فقط سچی خلوص — اِس گماں میں اب یقیں کی پختگی پائی گئی
وہ تکلف بار رسم و راہ تھا جس کے سبب — انتہائے ربط میں بیگانگی پائی گئی
یوں کمی دنیا کے ہر انساں میں ہوتی ہے مگر — تجھ میں تو انسانیت کی بھی کمی پائی گئی

ایسے ربط و ضبط سے اے دوست کچھ حاصل نہیں
جس میں قلب و روح کی گہرائیاں شامل نہیں

دوستی عریاں حقیقت دوستی اسرار بھی — دوستی تشنہ لبی بھی دوستی سرشار بھی
دوستی ایثار پیہم دوستی ربط و خلوص — دوستی آساں بھی ہے دوستی دشوار بھی
اس میں اپنے سے سوا رہتا ہے ہمدم کا خیال — دوستی اک کیف بھی ہے دوستی آزار بھی
دوستی گل کا تبسم دوستی بستہ کلی — دوستی خوابیدہ بھی ہے دوستی بیدار بھی
دوستی گویا رضائے دوست ہی کا نام ہے — دوستی انکار بھی ہے دوستی اقرار بھی
دوستی جبر و تحمل دوستی عجز و نیاز — دوستی مجبور بھی ہے دوستی مختار بھی
دوستی میں اور طلبِ منفعت کی آرزو — دوستی ناکار بھی ہے دوستی بیکار بھی
خود فراموشی یہاں دراصل عین ہوش ہے — دوستی مدہوش بھی ہے دوستی ہشیار بھی
دوست کی مرضی پہ ہر سانچے میں ڈھل جائے دوست — دوستی مے خوار بھی ہے دوستی دیندار بھی

زندگی میں اپنے قول و فعل کو یکجا بنا
دوستی کو ظاہر و باطن کا آئینہ بنا

لُبابُ السَّلَف (مسلسل)

سلسلہ کیلئے ادب ماہ اگست ۱۹۲۳ء ملاحظہ فرمائیے

از علامہ سیماب اکبرآبادی

میر تقی میر اکبرآبادی نوّر اللہ مرقدہ

(۴)

انتخاب کلام میر

دیوان اوّل

* * *

مرے رونے کی حقیقت جس میں تھی　　ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا
صبح پیری شام ہونے آئی میر　　تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

* * *

دہر میں، میں خاک بسر ہی رہا　　عمر کو اس طور بسر کر گیا
کس کو مرے حال سے تھی آگہی　　نالۂ شب سب کو خبر کر گیا
مجلس آفاق میں پروانہ ساں　　میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

* * *

ہر گل زمیں یہاں کی رونے ہی کی جگہ تھی　　مانندِ ابر ہر جا، میں زار زار رویا

* * *

ہم صید رمیدہ ہوں بیابانِ جنوں کا　　رہتا ہے مجھے موجبِ وحشت مرا سایا
یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ　　یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

* * *

دل جو زیر غبار اکثر تھا　　کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا
بارے سجدہ ادا کیا تہِ تیغ　　کب سے یہ بار میرے سر پر تھا

* * *

قتل بہت ہو ہم سا پھر کوئی ہاتھ آتا　　یاں مارنا تو پیارے آسان ہے ہمارا

* * *

دھوپ میں جلتی ہیں غربت وطنوں کی لاشیں　　تیرے کوچہ میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا

* * *

بے طاقتی سکوں نہیں رکھتی ہے ہم نشیں　　رونے نے ہر گھڑی کے مجھے تو ڈبو دیا

* * *

حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ　　میر کا کھول کر کفن دیکھا

* * *

آئی اگر بہار تو اب ہم کو کیا صبا　　ہم سے تو آشیانہ گیا اور چمن گیا

* * *

کہاں تھے میسر مجھ کو تجھ سے خود نما اتنے　　بحسنِ اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

* * *

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے　　چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

* * *

جو اس شور سے میر روتا رہے گا　　تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں　　جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے　　جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا
بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو　　تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

* * *

ہم اسیروں کا بھلا کیا، جو بہار آئی نسیم　　عمر گذری کہ وہ گلزار کا جانا بھی گیا

* * *

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا　　اب جس جگہ کہ داغ ہے، یہاں آگے درد تھا
اک گرد راہ تھا پئے محمل تمام راہ　　کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا
دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں　　واں چیں جبیں پر آئی کہ یاں رنگ زرد تھا
عاشق ہیں ہم تو میر کے اس ضبطِ عشق کے　　دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

* * *

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ ساغر نہ ہووے گا　　مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا
کیا ہے خوں مرا پامال، یہ سرخی نہ چھوٹے گی　　اگر قاتل تو اپنے پاؤں مہندی سے دھووے گا

* * *

داد دے ورنہ ابھی جان پہ کھیلے ہوتا ہوں　　دل جلانا نہیں دیکھا کسی فریادی کا

تا صبح میں نہ سوئے تا کے   کیا ہو تو کم ہوا ہے سینے پر
جو دلبر سے کیا ہوں آزردہ   تیر اُس یاروں کے جینے پر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
ضعف یاں تک کھنچا کہ صورت گر   رہ گئے ہاتھ میں قلم لے کر
دل لگا کب اکتفا کرے ہے عشق   جائیگا جان بھی یہ غم لے کر

غنچے چمن چمن کھلے اس باغ دہر میں   دل ہی مرا ہے جو نہیں ہوتا ہے وا ہنوز
توڑا تھا کس کا شیشۂ دل تونے سنگدل   ہے دلخراش کوچہ میں تیرے صدا ہنوز
بے بال و پر اسیر ہوں کنج قفس میں میر   جاتی نہیں ہے سر سے چمن کی ہوا ہنوز

ضبط کرتا نہیں کنارہ ہنوز   ہے گریبان پارہ پارہ ہنوز
آتش دل نہیں بجھی شاید   قطرۂ اشک ہے شرارہ ہنوز
عمر گذری دوائیں کرتے میر   دردِ دل کا ہوا نہ چارہ ہنوز

لیکن ان بال فشانی ہم ہوئے تھے خوش ہوکر   ہیں غم دل کی اسیری میں گرفتار ہنوز
کوئی تو آبلہ پا دشت جنوں سے گذرا   ڈوبا ہی جائے ہے لوہو میں سر خار ہنوز

بعد مرنے کے بھی آرام نہیں میر مجھے   اُس کے کوچہ میں ہے پامال مری خاک ہنوز

ہو چکا خونِ جگر، رونا نہیں کچھ کم ہنوز   ہیں مژہ دستور سابق ہی پہ میرے نم ہنوز

حرماں تو دیکھ پھول بکھیرے تھی کل صبا   اک برگ گل گرا نہ جہاں تھا مرا قفس
مجنوں کا دل ہوں محمل لیلیٰ سے ہوں جدا   تنہا پھروں ہوں دشت میں جوں نالۂ جرس

گرم ہوگا حشر میں ہنگامۂ دعویٰ بہت   کاشکے مجھ کو نہ لیجائیں مرے قاتل کے پاس

مر گیا میں ملا نہ یار افسوس   آہ افسوس صد ہزار افسوس
رخصت سیر باغ تک نہ ہوئی   یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

پان تو لیتا جا فقیروں کے   برگ سبز است تحفۂ درویش

ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ   کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ
غلط غلط کہ رہیں تم سے ہم تنک غافل   تم اور پوچھو ہماری خبر دروغ دروغ

محبت نے شاید کہ دی دل میں آگ   دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف
کیسے منزلِ دلکش و دہر میں   نہیں میل خاطر، سفر کی طرف

اب وہ نہیں کہ شورش رہتی تھی آسماں تک   آشوب نالہ اب تو پہنچا ہے لامکاں تک
مانند طیر تو پر اٹھے جہاں گئے ہم   دشوار ہے ہمارا آنا پھر آشیاں تک

کب سے متحمل ہے جفاؤں کا دل زار   زنہار وفا ہو نہ سکی یار سے اب تک
وعدہ بھی قیامت کا بھلا ہے کوئی وعدہ   پر دل نہیں خالی غم دیدار سے اب تک
مدت ہوئی گھٹ گھٹ کے ہمیں شہر میں مرتے   واقف نہ ہوا کوئی اس اسرار سے اب تک
اس باغ میں اغلب ہے کہ سرزد نہ ہوا ہو   یوں نالہ کسی مرغ گرفتار سے اب تک
کیا جانئے ہوتے ہیں سخن لطف کے کیسے   پوچھا نہیں اُس نے تو ہمیں پیار سے اب تک

ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ   ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک

آہ کرنے میں دم کو سادھے رہ   کہتے ہیں دل سے ہے جگر نزدیک
دور اب بیٹھتے ہیں مجلس میں   ہم جو تھے تم سے بیشتر نزدیک
دور پھرنے کا ہم سے وقت گیا   پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک
مر بھی رہ میر شب بہت رو یا   ہے مری جان اب سحر نزدیک

جیسے شب آگ سا دیکھا سلگتے   آئے پھر خاک ہی پایا سحر تک
گلی تک تیری لایا تھا ہمیں شوق   کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک

عشق کا شور کوئی چھپتا ہے   نالۂ عندلیب ہے گل بانگ

گلیں بھی کیے نہ کہ گلشن تھا میر کے   لخت جگر پڑے ہیں، نہیں برگ ہائے گل

غزل

میرے حصے کی جو واعظ آپ پی کر دیکھتے — اپنے ساغر میں چھلکتا حوض کوثر دیکھتے
میکدے تو شیخ صاحب آج آئے ہی نہیں — وہ اگر آتے تو ہم اُن کو برابر دیکھتے
صحبتِ اہلِ نظر میں وہ کبھی بیٹھے نہیں — دیکھتے بھی حضرتِ موسیٰ تو کیونکر دیکھتے
ہاں نہیں ایسے نہیں اب ہم کریں تو کیا کریں — وہ چھپانے کے اگر ہوتے چھپا کر دیکھتے
منحصر ہوتا اگر دیدار مرنے پر ترا — دیکھتے اپنی قسم بے موت مر کر دیکھتے
بادہ خواروں میں جو ہوتے شیخ تو انکے بھی پاس — رحمتِ حق کا وسیلہ یعنی ساغر دیکھتے
عاشقانِ باوفا قائم ہیں اپنی وضع پر — ایک مدت ہو گئی اُن کو برابر دیکھتے
یاد آجاتی جو کوئی بات اُن کو راز کی — وہ مقرر میری جانب مسکرا کر دیکھتے
غمزۂ خونریز کا خنجر چلا ہوتا سے کے جب — شان تو قاتل کی وہ اللہ اکبر دیکھتے
زہد و تقویٰ کی نظر آتیں ہزاروں تربتیں — شیخ صاحب تم جو میخانے کے اندر دیکھتے
اس طرح تو ضد نہ کرتے حضرت موسیٰ اگر — پاؤں پھیلانے سے پہلے اپنی چادر دیکھتے
داستانِ عشق میری ہی نظر آتی انہیں — مصحفِ رخ وہ کہیں سے بھی اٹھا کر دیکھتے
شیخ کے تقویٰ کے ملنے کی یہی تھیں دو جگہ — زیرِ شیشہ دیکھتے یا زیرِ ساغر دیکھتے
جلوۂ جاناں ہی کی نیرنگیاں آتیں نظر — شمعِ سوزاں دیکھتے یا ہم گُلِ تر دیکھتے
ہاں مٹا دیتے دوئی تو وہ ہی وہ آتا نظر — دل کے اندر دیکھتے یا دل کے باہر دیکھتے
دید کی حسرت نکل جاتی کلیم اللہ کی — خاک اہلِ دل جو آنکھوں میں لگا کر دیکھتے
ہم وطن اپنا مآل اندیشیوں کو جانتے — جب شباب آباد میں ان کا کہیں گھر دیکھتے
نامرادِ عشق کی دنیا اگر تھی دیکھنی — بے تکلف آپ آجاتے مرے گھر دیکھتے
آدمی ہوتا تو وہ روتا ہمارے حال پر — غم کدے میں دہر کے ہم جس کو ہنس کر دیکھتے
رحمتِ حق جوش پر آتی اور آتی عاصیو — اپنی کرنی پر تو دو آنسو بہا کر دیکھتے

رنگ دنیا دیکھنا تھا ہر طرح ہم کو صبا
خواہ ہنس کر دیکھتے ہم خواہ رو کر دیکھتے

جناب صبا
[illegible]

رخصت

(از جناب نصرت تسکین)

تری رخصت کا وہ منظر ابھی تک یاد ہے مجھکو
تری آنکھوں میں آنسو، لب پہ اِک پھیکا تبسّم تھا
نگاہوں میں تھی گویائی، خموشی میں تکلّم تھا
تبسم اور آنسو، آگ اور پانی کے طوفاں تھے
یہ سب میرا سکوں برباد کر دینے کے ساماں تھے

مرے دل پر وہی افسردگی سی چھائی جاتی ہے
مجھے اس طرح وہ رخصت کی ساعت یاد آتی ہے
کہ جیسے صبحدم کوئی پریشاں خواب دیکھا ہو
بھلاتا ہوں مگر اب بھی وہ باتیں یاد آتی ہیں
دمِ رخصت تری آنکھوں میں دو آنسو جو آئے تھے
نمستے کے لئے تو نے جو دونوں ہاتھ اُٹھائے تھے
مری آنکھوں میں اب بھی بجلیاں سی کوند جاتی ہیں
ہوئی مدت مگر اب بھی یہ سب کچھ یاد ہے ایسے
کہ میں محسوس کرتا ہوں گئی ہو تم ابھی جیسے

اسباب ویرانی

(از جناب ایم۔ اسلم)

دوست! آ! میں تجھے ایک کہانی سناؤں۔ ایک دلفریب گیت
قسامِ ازل سے کسی کو پھول عطا ہوا اور کسی کو خار۔ لیکن جب میری باری آئی قسمت
لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی تجھے!

ایک روز حسن کی دیوی کے مندر پر جاتریوں کا ہجوم تھا۔ بے پناہ ہجوم! لوگ نذریں پیش کر رہے تھے۔
کسی نے آگے بڑھکر پھولوں کا تحفہ پیش کیا۔ لیکن اُس نے پھول مسل کر پھینک دیئے۔
ایک اور نے زمیں بوس ہوکر جواہرات کشتی میں پیش کئے۔ نذر قبول ہوئی اور اُس نے قرب حاصل کیا۔
اب میری باری آئی۔ میں تہی دست کیا پیش کرتا۔ میرے پاس ایک دل تھا میں نے وہی پیش کر دیا۔ اس دل میں محبت کی شراب چھلک رہی تھی۔

حُسن کی دیوی کے لبہائے سیمیں پر تبسم رقص کرنے لگا۔ اسکی نرگسی آنکھوں میں مستی کی جھلک نظر آنے لگی۔ اُس کا خوبصورت سینہ اُبھرنے اور بیٹھنے لگا۔ اور حُسن خفتہ کی رعنائیاں بیدار ہو ہوکر تلاطم جذبات برپا کرنے لگیں۔
وہ میرا دل۔ وہ دل جس میں محبت کی شراب چھلک رہی تھی۔ لینے کو آگے بڑھی۔
لیکن جواہرات کی کشتی جو پاس رکھی تھی اُلٹ گئی۔
اُس نے جھک کر جواہرات کی طرف دیکھا۔ جواہرات کی جھلک نے اُس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اور اُس نے میری طرف سے مُنہ موڑ لیا۔
دوست! دولت محبت سے بازی لے گئی۔ لیکن شاید تو اس رمز سے آگاہ ہے کہ دولت فانی ہے اور محبت غیر فانی! ؎

بر در دوست چہ گوئیم و چہ عنواں رفتیم
ہمہ شوق آمدہ بودیم ہمہ حرماں رفتیم

[illegible] ہوتے گئی
[illegible] خراب ہوگئی ہے اس کے یہ حالت ہوئی۔

میرے ذہن میں اب سے سالہا سال پیشتر کی وہ بات اور وہ سماں بستہ تھا۔ آخری وداع! اس کا مدد کر کے الوداع کہنا ۔۔۔ سامنے دیوار پر [illegible] جاذب نظر تصویر آویزاں تھی ۔۔۔ اور قیمتی آبنوسی مسہری پر اس کا [illegible] زرتار [illegible] ستونوں کا ہے [illegible] حالت میں پڑا نظر آرہا تھا ۔۔۔ آہ میری [illegible]!

رات میں نے جوں توں کرکے کاٹی۔ صبح بیگم شوکت نے مجھے اپنی خوابگاہ میں [illegible] اور اپنے کمرہ منتقل کرا دیا۔ تاکہ اپنا حال دل سنا کر کچھ غم غلط کریں گی۔ دوسرے میں زیادہ دن اپنی پریکٹس چھوڑ کر یہاں قیام بھی نہیں کر سکتی تھی۔

(۱۳)

بیگم شوکت اپنی مسہری سے اتر کر آرام کرسی پر لیٹ گئیں۔ اور میں ان کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

انہوں نے پیار سے میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یاسمین! مجھ پر خفا تو نہیں ہوگئیں۔ میں تمہاری مصروفیتوں میں رکاوٹ ڈال رہی ہوں۔ مجبور ہوں۔ پیاری! جب تک میں اپنا حال دل بیان کر کے بوجھ ہلکا نہ کروں موت نہیں آئیگی۔ میں جانتی ہوں کہ تم ڈاکٹر ہو۔ اور تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ معذور اور بے بس انسان کیلئے مختنمات سے ہے۔ تمہارا وقت بے حد قیمتی ہے۔ اس کے باوجود میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ میری حسرت ناک الم انگیز داستان کو سن لو پیاری یاسمین! میں نے سمجھا تھا کہ تمہاری شادی بھی ہوگئی ہوگی۔ مگر کلکتہ آنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر یاسمین یہاں پرائیویٹ پریکٹس کر رہی ہیں۔ لیکن ابھی روز سے تمہاری تلاش کروانی شروع کردی۔ آخر ڈائرکٹری سے تمہارا ٹیلیفون نمبر معلوم کرکے ایکسچینج سے تمہارا پتہ حاصل کیا۔ شکر ہے تم آگئیں"
وہ [illegible] مسکراہٹ کے ساتھ بولی "آہ! دوست!! ایک مرتبہ تمہیں کم گشتہ [illegible] کے بعد یہ بازیافت کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ اگر رات جاگ سکو تو میں اپنی داستان حیات کا الم ناک باب دہرا دوں۔ تم ڈاکٹر ہو۔ روزانہ حوادثات سے زندگی کے غم انگیز واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہوگا۔ لیکن ایسی سینکڑوں کہانیاں سنی ہونگی۔ شاید تمہارے نزدیک اسکو کوئی خاص اہمیت نہ ہو۔ مگر یہ تمہاری بچپن کی سہیلی کی داستان حیات ہے۔ ہم ایک ساتھ پلے اور بڑھے۔ زندگی کے [illegible] ہیں۔ اور ہم تم اسی قدر قریب ہو کر بھی دور [illegible] دوست تم جانتی ہو

[illegible] کرتی [illegible] اور [illegible] محبت اندروں سے بالکل جدا تھا۔ میں محبت میں امارت یا ظاہری اثرات کو دخل نہیں دیتی تھی۔ سکول و کالج میں میری بہتری سہیلیاں ایسی تھیں جو غریب [illegible] چندے پر تعلیم پاتی تھیں۔ جنکے پاس نہ موٹریں نہ شاندار محلوں کی مالک۔ صرف ان کے حسن اخلاق، حسن صورت کی میں گرویدہ ہوتی تھی ۔۔۔ تمہیں یاد ہے ہماری اراضیات کے دیوالیہ نمبردار کا وہ لڑکا؟ وہ مردانہ وجاہت، صحت اور جوانی کی خوش رسائیوں میں قدرت کا دلفریب نمونہ قرار دیا جاسکتا تھا ۔۔۔ خاموش کیوں ہوگئیں ۔۔۔ سردار حسین سر زادہ! تمہیں یاد نہیں؟"

"اوہو خوب یاد آیا ۔۔۔ وہی جو [illegible] پر [illegible] رہتا تھا۔"

"ہاں وہی!" بیگم شوکت بولیں۔ اس کی [illegible] آنکھوں کو بھی بھول گئیں ۔۔۔ وہی حسین دیہاتی لڑکی جو ہمیشہ شرمیلی نگاہیں [illegible] ناز و انداز سے اٹھلاتی ہوئی آتی۔ اور اس دیہاتی نوجوان کی [illegible] بین نوازی۔ اور سُریلی دلکش آواز پر اس کے سنہرے رخساروں پر شباب کی سرخی ۔۔۔ مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ اور جب ہم اسے چھیڑتیں تو باوجود ضبط کے اسکی نرگسی حسین آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے۔ لیکن جذبات کو چھپاتے ہوئے وہ اپنے حسین اور دلکش چہرے پر ایک لطیف مسکراہٹ پیدا کرتی۔ کبھی جب کئی ہفتے تک سردار گاؤں سے باہر چلا جاتا تو اس کی آنکھوں سے حسرت و انتظار نمایاں ہوتا۔ اور وہ فکر مند کسی کونے میں پژمردہ پھول کی طرح مرجھائی ہوئی خوابوں کی دنیا میں کھوئی کھوئی سی رہتی۔ مجھے رفتہ رفتہ اس پر رشک آنے لگا۔ اس کے حسین چہرے کے دلکش خدوخال کسی ماہر فن یونانی سنگتراش کی چابکدستی کا نتیجہ معلوم ہوتے۔ وہ مجھے بھی سراپا نظم نظر آنے لگا اسکی پرسوز آواز مجھے مسحور کرنے لگی۔ میں اس ساحر بین نواز پہ رشک کرنے لگی۔ اس وقت مجھے اپنی یورپین گورنس کی وہ بات بالکل صحیح معلوم ہونے لگی کہ محبت اور جنگ آزمائی کے وقت ہر فعل جائز ہوتا ہے۔ اس وقت میں اپنی نوابی شان اور امارت سب کچھ بھول گئی۔ اور اس ساحر بین نواز کو بین بجانا سکھانے کے بہانے ایک معقول تنخواہ پر رکھ لیا۔ اس کی آواز میں اپنا درد تھا کہ خواہ مخواہ بھی سننے والوں کو اپنی پرسوز خوش گلوئی سے مسحور کر لیتا تھا ۔۔۔ میں نے اسکی زبانی معلوم کیا کہ وہ حسین آنکھوں والی لڑکی شاموں کو اپنا دل دے چکا ہے۔ شامو ہمیشہ اپنے بالوں کو گلاب اور دوسرے خوش رنگ پھولوں سے آراستہ کیا کرتی تھی۔ اس نے گاؤں میں وہ پھولوں والی لڑکی مشہور تھی۔ [illegible] مسکرا گئی

وہ کچھ دنوں سے بہت ہی لاغر اور زرد ہوتا جا رہا تھا۔ اور ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ تم پر مرنا مجھے اپنی جان سے پیارا ہے۔ آپ نے میری باتوں پر غور کیا ہوتا؟ اور جہیز کے کھٹکے نے مجھ کو بالکل کمزور کر دیا تھا۔ اور وہ بیچارہ تمام دیہاتیوں کی طرح شہر میں [illegible] مزید چھ کہ ۱۵ سال کا [illegible] ڈاکٹر [illegible] کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی — یہ نوجوان حسین [illegible] محبت کی بھڑکتی آگ [illegible] کا شکار ہو گیا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر [illegible] حسرت، ناکامی اور محرومی برس رہی تھی۔ آتشدان میں آگ کے بے قرار شعلے بھڑک رہے تھے۔ میرا دل اور نصیبہ دھڑک رہا تھا۔ کلیجے میں چھریاں سی چل رہی تھیں۔ دریچوں سے سرد ہوا ٹکراتی ہوئی اندر آتی تھی۔ مختصر کچھ اس قدر الم ناک اور بھیانک ہو رہی تھی کہ میں اپنے حواسوں میں معلوم نہ ہوتی تھی۔ اس وقت کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے مشورے سے اس مصیبت ناک مصیبت کو آسان کر سکتی۔ آہ! وہ بے قراری و ہیجان کا عالم، میں اس دن کو کوستی تھی کہ یہ جرأت میں نے کیوں کی۔ کبھی مستونی کو دل ہی دل میں برا بھلا کہتی جس نے مجھے اس قدر دیوانہ بنا دیا تھا۔ کچھ دیر میں آتشدان کے پاس کھڑی سوچتی رہی۔ آخر ایک خیال بڑی سرعت سے میرے دماغ میں چکر لگانے لگا۔ ہاں ہاں جلد اس کو یہاں سے ہٹا دینا ہی عقلمندی ہے۔ اس طرح ہمارا عقد بھی ہمیشہ کیلئے ایک راز بنا رہ جائیگا کسی کو اسکی مطلق ہی خبر نہ ہو گی — قدرت رقص کر رہی تھی۔

— ۴ —

میں نے اپنے محبوب کو جی بھر کے پیار کیا۔ اس کی جیب ٹٹولی تاکہ میرا فوٹو یا خط اس قسم کا کوئی ثبوت اس کے پاس نہ ملے۔ آہ! اسکے سینے کی جیب سے میری تصویر کا لاکٹ اور ایک خط نکلا — بس میں نے وہ اپنے ڈسک کے صندوق میں مقفل کر دیا۔

اس کے بعد بے پاؤں باہر آئی۔ برآمدے سے ہوتی ہوئی باہر نکلی۔ چوکیدار وغیرہ سب سو رہے تھے۔ ساری کائنات پر خاموشی چھا رہی تھی۔ میں دوڑ کر واپس آئی۔ اور اپنے محبوب کی لاش کو بڑی مشکل سے اٹھایا۔ اور زینے سے دھرتی دھرتی اتار لائی۔ اب تو میری طاقتوں نے جواب دے دیا تھا۔ لیکن بمشکل کھینچتی گھسیٹتی باغ کے پچھلے دروازے سے اسکو باہر نکالا۔ دیہات کا راستہ تھا۔ اتفاق سے طوفان اور بارش کی وجہ سے ہر کوئی اپنے گھروں میں محفوظ تھے۔ میں نے اسکو غنیمت سمجھا۔ اور جہاں تک ممکن ہوسکا لاش کو گھسیٹتی دور تک لے گئی۔ اور راستہ پر اس طرح اوندھا لٹا دیا۔ جیسے فطرتی طور پر وہ اسی مقام پر گر کر مر گیا ہو۔ اس کے تمام کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو رہے تھے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ اس کے بعد اور بھی سخت بارش اور ژالہ باری ہوئی۔ ورنہ ہمارے پھاٹک سے گھسیٹتے ہوئے نعش کے تمام نقوش گیلی مٹی پر نمایاں ملتے۔ اگر خدا کو اس وقت میری عزت بچانی تھی۔ دوسرے روز تمام دیہات میں یہ غل مچا ہوا تھا کہ نمبردار کے لڑکے کی نعش کھیت میں پڑی ملی۔ تمام لباس کیچڑ میں لت پت تھا۔ کسی سے دھینگا مشتی ہوئی ہو گی یا طوفان میں بیچارہ گر پڑا اور مر گیا۔ مجھے صبح کو زوروں کا بخار چڑھ آیا۔ اس سے بہت کچھ مجھے مدد ملی۔ اور میں تمام باتوں سے الگ تھلگ رکھی گئی میرے سامنے اس کا ذکر بھی کسی نے کرنے نہیں دیا۔ ایسے موقعوں کیلئے ایسے واقعات تو گاؤں میں اکثر ہوا کرتے ہیں۔ فضول میں نواب صاحب کی لاڈلی بچی بیماری میں یہ ہولناک حادثہ کیوں سنکر پریشان ہوتی۔ جب میری طبیعت کئی روز بعد درست ہوئی تو قصہ کہانیوں کی طرح یہ واقعہ میں نے بھی سنا۔ پھر اپنی ہمدردی جتانے کو میں شاموں کے پاس گئی۔ غم سے اسکی حالت غیر تھی ماں کو گلے لگا کر تسلی ادا کرتے ہوئے میں بھی خوب روئی۔ دراصل دل کی بھڑاس نکالی۔ شاموں سے مجھے لپٹ کر اپنا درد و غم

[illegible] پہلے ہی [illegible]
[illegible] کی زندگی [illegible]
[illegible] اس نے عہد کیا کہ وہ
تمام عمر یوں ہی سر جھکا کر گزار دیگی ۔

وہ دن یوں ہی طرح بے کیف گزر گئے ۔ زندگی کے گزرے ہوئے رومان کے آخری واقعات بھلاتے رہتے تھے ۔ بلا ارادہ ہر وقت متاثر رہتا ۔ میں اپنی جلد بازی کے خطرناک انجام کو سوچ رہی تھی ۔ مجھ میں ماں بننے کے آثار نظر آ رہے تھے ۔ آہ ! قسمت کا یہ ستم انگیز انجام کس قدر خوفناک تھا ! میں تاریخ کے خیال سے کانپ کانپ جاتی ۔ بے ہوش و حواس کھوئے ہوئے تھے ۔ خدایا ابا جان میری اس آزادی کو کیا خیال کرینگے تیں اس کے کہ خاندانی عزت ـــــ اور اپنی ذلت کا اندازہ کروں مجھے زندگی سے نفرت سی محسوس ہونے لگی ۔ آخر ایک تدبیر ذہن میں آئی ۔ میں نے شاموں سے گہری دوستی پیدا کی ۔ ہر دم اُسے اپنے پاس بلاتی یا خود اُس کے پاس چلی جاتی ۔ رفتہ رفتہ اُسے اپنا رازداں بنا لیا ۔ اس کو یہ سنکر پہلے بہت صدمہ ہوا کہ اس کے عاشق نے اس سے بیوفائی کی ۔ مگر یہ کہکر دل کو سمجھا لیا کہ مردوں کی یہی عادت سدا سے رہی ہے ۔ پھر میرے حسن دل افروز کو دیکھکر اُسکو یہ تسلی ہوئی کہ جہاں گلاب میسر ہو تو جنگلی خودرو پھولوں کی رعنائی سے کون متاثر ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ وہ میری مدد پر آمادہ ہو گئی ۔ لیکن پھر یک لخت اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا ۔ اور وہ بولی بیگم آپ میری محسن سہی ۔ مگر میرا سہاگ آپ نے چھینا ۔ خیر میں اپنے پیارے منگیتر کی خاطر اس کی لغزش کو چھپاؤنگی اور ہر طرح آپ کی تائید کرونگی ۔ میں نے اکیس کے نوٹ اس کو پیش کئے ۔ مگر اس نے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیئے ۔ اس کے بعد میری امی کو کچھ شک ہونے لگا ۔ شاید میرے جسمانی تغیرات پر جو جنس برائے نام تھیں انہیں کچھ خیال ہو گیا ۔ ان کے بے حد اصرار پر میں نے سارا حال سنا دیا اور روتی ہوئی ان کے قدموں پر گر پڑی کہ آپ کا جو جی چاہے کیجئے ۔ ان کو پہاڑ کے قاضی صاحب کا دیا ہوا کابین نامہ بھی دکھایا ۔ جس میں مہر فاطمی پر سردار حسین کے ساتھ میرا عقد باندھا گیا تھا ۔ مگر میری امی نے یہی صلاح دی کہ تو یا تو تبدیل آب و ہوا کے بہانے کسی اور جگہ چلی جا ۔ یا نہیں تو شاموں کو ساتھ لیتی جا ۔ اور دیہات والوں پر ہرگز یہ ظاہر نہ ہونے دے کہ تو نے شادی کی یا تیرے بچہ ہونا ہے ۔ کیونکہ شادی اور پھر ایسے ذلیل خاندان میں ہونے کی خبر سے تمہارے ابا جان کی سخت تضحیک ہوگی ۔ اور وہ جب تک تیری جان لیکر اپنی جان نہ دینگے اس وقت تک انہیں قرار نہ آئے گا ۔ اس لئے اخفا ہی میں مصلحت ہے ۔ چنانچہ شاموں کو لیکر میں پھر نینی تال پہاڑ پر

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] محبت [illegible]
[illegible] اعتراف [illegible]
[illegible]
[illegible]
وہ یہ سنکر مسکرائی ۔ اور جرأت کر کے بولی ۔ آپ کو اب تک [illegible] کیا چیز ہے ۔ اگر سردار آپ کو [illegible] ہوتا تو آپ اس بیچارے [illegible] کو حقیر نہیں خیال کرتیں ۔ معاف کیجئے گا ۔ یہ کہکر وہ خاموش ہو گئی ۔ [illegible] محبت کا وہ فلسفہ مجھے بتایا جو اُس کو میری نگاہوں میں [illegible] تھا ۔ اس کے خواب آلود حسین آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے ۔ اُس نے مجھ کو سینہ سے لگایا ۔ اور وہاں سے چلی گئی ۔

۵

کئی سال گذر گئے ۔ میری شادی ابا جان نے بڑی دھوم دھام سے اپنے بھتیجے نواب شوکت جنگ سے رچائی ۔ گو وہ عمر میں مجھ سے بہت زیادہ تھے لیکن دولت کی فراوانی نے سارے عیوب کی پردہ پوشی کر لی ۔ وہ [illegible] کا معاملہ تھا ۔ وہ ایک محنت شعار شوہر ضرور تھے ۔ مگر امارت اور دولت کے نشے میں اکثر میرے دلی جذبات کو مجروح کرنے کے عادی تھے ۔ انہیں عورتوں کی آزادی سے نفرت تھی ۔ وہ انہیں کھیلنے کی گڑیا اور ایک حسین بے جان مورت سمجھتے تھے ۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ شادی کو کئی سال گذر گئے مگر میرے ہاں کوئی بال بچہ نہ ہوا ۔ اس سے اُن کو بڑی فکر تھی کہ ان کے خاندانی نام اور جاگیر کا کون مالک ہوگا ۔ بنابریں اس قدر اثر انداز ہوا کہ نواب اب مجھ سے متنفر نظر آنے لگے ۔ آہ !

وہ کہتے کہ "میں ایسی [illegible] شمائل بیوی کو لیکر کیا کروں جو میرا نام قائم نہیں رکھ سکتی ۔ میں بدنصیب اب محل میں ایک پر شکستہ [illegible] تھی ۔ آزادی کی فضا میں پلی ہوئی فیروزہ سلطانہ اب نواب شوکت جنگ کے رحم و کرم پر ایک قفس کی قیدن تھی ۔

کمزوری سے اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے ۔ [illegible] اور انار کا عرق بھی دیا ۔ اُس سے کچھ تازہ دم ہو کر فیروزہ سلطانہ پھر کہنے لگی کہ ایک روز [illegible] نواب شوکت جنگ کو اُن کی [illegible]

[illegible] بچہ [illegible] کی تنہا [illegible] کی محبت [illegible] کے شاہانہ ٹھاٹ [illegible] سب کچھ پہلے سے موجود تھے مگر میری مامتا دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ مجھے حرارت رہنے لگی۔ مخملی بستر پر [illegible] آنکھوں میں بے چین کروٹیں بدلا کرتی۔ میرا دل محبت کا بھوکا تھا کاش اس وقت بھی بچہ میرے پاس ہوتا۔ جس کی ماں کہلانے میں میں اپنی ذلت محسوس کرتی تھی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں ایک دن شاموں کے پاس پہنچی۔ اس کے قدموں پر گر پڑی کہ میرا بچہ مجھے واپس دیدے۔ آہ! اس محبت و استقلال کی دیوی نے کاغذ کا پرزہ چھاتی سے نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ اُف! معبود!! میں کس قدر جلد باز تھی۔ شادی بھی جلد بازی کا نتیجہ تھی۔ اور بچہ سے لاوارث ہونا بھی جلد بازی کا مہلک ترین نتیجہ۔ آہ! خود کردہ را چہ علاج۔

میں نے کہا "اس قدر ظلم نہ کرو شاموں!"

اُس کی دراز پلکوں پر آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اُس نے کہا "ناممکن"

میں بے اختیار ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ شاموں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس نے کہا "پہلے شوہر چھینا۔ اب میرا لخت جگر جس کو کن کن شفقتوں سے پروان چڑھایا، چھیننے آئی ہے۔ ڈائن!"

اُس نے سردار حسین کی نشانی کو سرفراز کہہ کر پکارا۔ میں نے پوچھا "وہ کہاں ہے؟" وہ تیوری کے ساتھ بولی "تم بتاؤ تمہارے بچے کا ثبوت۔ اس کا نام بھی تم نے رکھا تھا؟"

اتنے میں ۱۹ سال کا ایک تندرست توانا قد آور حسین لڑکا اندر آیا۔ اور مجھے سلام کر کے بیٹھ گیا۔ شاموں نے اُس کے سامنے اس کی پیدائش ہماری شادی اور اس کو پرورش کرنے کا سارا ماجرا بیان کیا۔ اور لڑکے سے پوچھنے لگی کہ اب تم اپنی دولتمند اماں کے ساتھ جاؤ گے اور ان کے محل میں عیش و آرام سے رہو گے؟" لڑکے کا چہرہ یہ قصہ سُن کر سُرخ ہو گیا۔ غیظ و غضب کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اُس نے اپنی نووارد بیگم اماں کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔ اور شاموں کے کلیجے سے لگ کر بولنے لگا۔ کہ جب بیگم صاحبہ نے میرے باپ کو شوہر ظاہر کرنے میں ذلت محسوس کی تو وہ مجھے علی الاعلان اپنا فرزند ظاہر کرنے میں شرم محسوس کی تو مجھے بھی ایسی ماں کہاں سمجھنے میں شرم اور ذلت محسوس ہوتی ہے۔ میری دیہاتی اماں ہی اچھی ہے۔ جس نے میرے باپ کی محبت اور یاد میں اپنی زندگی کاٹ دی۔ حالانکہ وہ ان سے شادی بھی نہیں کر سکی۔ مگر تمام عمر بیوہ کی طرح بسر کی۔

اُف! اس وقت معلوم ہوا کہ رباب کے تار رو رہے ہیں۔ میرے کانوں میں بانسری کی وہی دل نواز آواز آئی۔ موسیقی ہوا کے پردوں کو چیرتی ہوئی سردار حسین کا حسرت ناک پیام سُنا گئی۔ میری بے چین روح گویا اسی وقت اس کے ساتھ ملک عالم بالا کو پرواز کر جانا چاہتی تھی۔

میں اس روز سے دل شکستہ ہو کر اسی بستر پہ پڑی ہوں۔ اور وہ دن دور نہیں ہے یاسمین! کہ اپنی ناکام زندگی کا خاتمہ کر لوں گی۔ اب دنیا میں میرے لئے دھرا کیا ہے۔ یہ دولت حشمت سب بیکار ہوئے۔ جب اس کا کوئی مصرف نہ ہو۔ آہ! میں نے سب کچھ کھو دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

"آہ! میں نے اپنی جلد بازی سے اپنی تمام عمر برباد کر ڈالی۔ اب میں اس کا سوداگراں نہیں ارزاں سمجھ کر اپنی زندگی سے چکا رہی ہوں —— یاسمین! میں شاموں کے گھر سے کس طرح زندہ واپس آئی۔ اسی کی مجھے حیرت ہے۔ کاش میں وہیں مر کر ڈھیر ہو جاتی" ——

پیاری یاسمین! جس وقت میں نے سُنا کہ تم کلکتہ میں پریکٹس کر رہی ہو تو میں یہاں اُفتاں و خیزاں پہنچی۔ اس لئے نہیں کہ تم سے اپنی جسمانی بیماریوں کا علاج کراؤں۔ مجھے تو روحانی معالجے کی ضرورت اور روحانی سکون درکار تھا۔ جو ضمیر کی آلودگی سے مفقود ہو رہا تھا۔ کچھ اعتراف معصیت نے میرے دل سے کوہ الم کو ہلکا کر دیا ہے۔ اچھا۔ خدا حافظ۔ شب بخیر پیاری سہیلی تمہارا بہت بہت شکریہ۔ لو یہ لفافہ گھر میں جا کر کھولنا۔ اور کچھ دیر آرام کر کے پھر میری خبر لینے ادھر آ جانا۔ ٹیکسی کا کرایہ میں دیدوں گی۔ یا داروغہ سے لے لینا۔ صبح قریب ہے۔ واللہ باتوں باتوں میں خیال نہ رہا۔"

میں نے خدا حافظ کہا۔ خدا آپ کو اطمینان قلب بخشے۔ اور اس غم کو آسان کر دے۔ اُس کے زرد ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

عظیم الشان محل چاندنی میں اور بھی شاندار نظر آ رہا تھا۔ اُس نے [illegible]

آغوشِ فلک میں [illegible] وہ کھلے ہوئے تارے
یا ساغرِ زر سلفِ مہ وش نے سنوارے

گلشن ہے یہ پھولوں کی چمن میں کہ مہِ نو
بکھرے ہوئے غنچے ہیں کہ چھٹکے ہوئے تارے

تاروں بھرا آکاش ہے یا نیند کی دیوی
پیشانی تہِ پاش پہ افشاں کو سنوارے

جھرمٹ میں ستاروں کے ہے مہتاب درخشاں
پہلو میں لئے ماضیٔ سوزاں کے شرارے

یا حلقۂ سیمیں [illegible] جہاں میں
ہے آئینہ سیما کوئی چہرے کو [illegible]

ہاں [illegible] انجم رخشندہ [illegible]
آنکھوں تلے پھرنے لگے ماضی کے نظارے

تاروں کی طرح میرے تصور میں ہیں روشن
وہ دن جو کبھی دوست کے پہلو میں گذارے

اظہارِ محبت میں بھی اِک طرزِ تغافل
پھر طرزِ تغافل میں توجہ کے اِشارے

آنکھوں سے اِدھر اشکِ گہر تاب کی بارش
گردوں پہ اُدھر سسکیاں بھرتے ہوئے تارے

کیا بھول گئے ہیں وہ محبت کی کہانی
کیا یاد اُنہیں اب نہیں گنگا کے کنارے

بھولے سے نہ وہ جن کو کبھی یاد کریں گے
جیتا ہے کوئی اب اُنہیں یادوں کے سہارے

دیدار میسّر ہو جو نظروں کو دوبارہ
روشن کروں سینے میں تمنا کے شرارے

میرے مہِ تاباں سے اَدا کون یہ پوچھے
تنہا کوئی کب تک شبِ مہتاب گذارے

ڈرامہ

ٹوٹے ہوئے گھر

از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی

(قسط دوم)

چوتھا ایکٹ

پہلی جھلک

سین:۔ شام کا وقت ہے۔ لیلاوتی ایک خوبصورت کوٹھی کے ایک سجے ہوئے کمرے میں کوچ پر بیٹھی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اداس ہے ۔ وہ سامنے لگے ہوئے پھولوں کی طرف دیکھنے لگتی ہے اور خود ہی کہتی ہے۔

لیلاوتی:۔ میرا دل بھی کبھی تمہاری طرح خوش تھا ـــــ اے سندر پھولوں میں بھی کبھی تمہاری طرح ہنسا کرتی تھی جس میں نہ جانے کتنی اُمیدیں اور آرزوئیں مچلا کرتی تھیں ۔ لیکن وہ تو اب نقش ونگار طاقِ نسیاں ہوگئیں

اُسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔

لیلاوتی میز پر سے وائلن اُٹھا کر گانے لگتی ہے۔

لیلاوتی:۔ سہاگ کی رات سجنیا کاہے بِسرے تورے نینا

(دروازہ کا پردہ ہلتا ہے۔ خادمہ اندر داخل ہوتی ہے)

خادمہ:۔ رانی جی! ـــــ ایک اجنبی شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

لیلاوتی:۔ جاؤ ـــــ کہدو کہ میں اس وقت نہ مل سکوں گی

خادمہ:۔ جو ـــــ مرضی ـــــ (چلی جاتی ہے)

خادمہ:۔ (اجنبی سے) ہماری رانی اس وقت نہیں مل سکتیں ۔

اجنبی نوجوان:۔ نہیں ـــــ میں ان سے ملے بغیر نہ جاؤں گا۔

خادمہ:۔ جناب وہ اس وقت آرام گاہ میں ہیں ۔

نوجوان:۔ کچھ بھی ہو جس وقت تک وہ نہ اٹھیں گی میں یہیں بیٹھا رہوں گا۔

(خادمہ اندر جاتی ہے)

[illegible]

میں نے کہا کہ رانی صاحبہ اِس وقت آرام کر رہی ہیں۔ وہ کسی سے نہیں مل سکتیں

لیلاوتی:۔ تو اس نے کیا جواب دیا؟

خادمہ:۔ حضور وہ کہتا ہے کہ جب تک رانی صاحبہ نہ اُٹھیں گی میں یہیں بیٹھا رہوں گا۔

لیلاوتی:۔ (وائلن رکھتے ہوئے) اچھا تو پھر اسکو اندر بلا لو۔

(خادمہ چلی جاتی ہے ۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کا پردہ اُٹھتا ہے اور ایک نوجوان داخل ہوتا ہے)

نوجوان:۔ (لیلاوتی کی طرف دیکھکر) کیا رانی جی آپ ہی ہیں

لیلاوتی:۔ بیٹھئے! ـــــ جی!! مجھ ہی کو "رانی جی" کہتے ہیں ـــــ میری انتہائی خوش نصیبی ہے جو آپ کے درشن ہوئے۔ کیا آپ اِس تکلیف فرمائی کا سبب بیان کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے۔

نوجوان:۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میں نے آپکو جس صورت میں دیکھنے کا تصور کیا تھا وہ سراسر دھوکا ثابت ہوا۔ اگر حقیقت اور صداقت کو دھوکا نہ دیا جائے تو میرے آنے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے آپ کے کچھ نامکمل حالات زندگی سُنے تھے جس سے میں اِس نتیجہ پر پہنچا کہ آپ بیسوا نہیں ہیں بلکہ زمانہ کی گردش نے آپ کو بیسوا بننے پر مجبور کیا ـــــ کیا میرا یہ خیال ٹھیک ہے۔

لیلاوتی:۔ آپ ان گندی ہوئی باتوں کو کیوں مجھے یاد دلاتے ہیں سچ مجھے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے ۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اپنی بیتی ہوئی زندگی کو بالکل ہی بھول جاتی۔

نوجوان:۔ رانی جی ـــــ مجھے آپ سے انتہائی ہمدردی ہوگئی ہے ۔ اور میں اس معاملہ میں آپ کی امداد کرنا چاہتا ہوں۔

لیلاوتی۔ ایک بیسوا کی امداد کرنا ـــــ اپنے لئے دوزخ کمانا ہے۔ میں نے ضرور کوئی بڑا پاپ کیا ہے جسکی سزا میں بھگت رہی ہوں۔

نوجوان:۔ رانی جی! آپ کی یہ باتیں میرا اشتیاق اور زیادہ بڑھا رہی ہیں ۔

لیلاوتی:۔ آہ ـــــ کس طرح کہوں کہ میں ایک دیہاتی لڑکی ہوں۔ ایک انجان پردیسی نے میرے ماں باپ کو دھوکا دیکر مجھے رانی بنانے کے بہلانے سے یہاں لاکر ایک بیسوا کے ہاتھ بیچ دیا ـــــ اور اب میں ایک بیسوا ہوں (وہ ٹھنڈی سانس بھرتی ہے)

نوجوان:۔ نہ تو آپ کو آج تک کسی نے سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش ہی کی۔

لیلاوتی:۔ (افسردگی سے) کیسی بھولے پن کی باتیں کرتے ہو بھلا بیسوا بھی کوئی سمجھنے کی چیز ہے؟ اور سمجھتا بھی کون ـــــ یہاں تو وہی آتے ہیں جنھیں دل سے کوئی

[illegible]

[illegible]

نوجوان:- میں [illegible]

ہیں دھن دولت [illegible]

لیلاوتی:- اچھی بات ہے۔ (نوجوان اٹھتا ہے)

لیلاوتی:- ہاں — جیسے تم ٹھیک کہتے ہیں — لیکن پھر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(نوجوان چلا جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

دوسری جھلک

سین:- رات کا وقت ہے۔ سنسان جنگل، کھیتوں اور میدانوں میں دھوپ سی چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔ آدمی اور جانور سب ہی میٹھی نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس وقت لیلاوتی اور اس کا ہی خواہ نوجوان سوشیل ایک طرف جا رہے ہیں۔

سوشیل:- دیوی! آپ کو میری وجہ سے بہت تکلیف پہنچی۔

لیلاوتی:- آپ ایسے الفاظ کہکر مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میں کن الفاظ میں آپ کی ان عنایات کا شکریہ ادا کروں۔

سوشیل:- (بات کاٹتے ہوئے) یہ آپ کی عزت افزائی ہے۔

لیلاوتی:- نہیں — نہیں — آپنے مجھ پر وہ احسان کیا ہے میں جسکا بدلہ نہ اتار سکوں گی۔

سوشیل:- دیوی! آپ کو یہ تمام تکلیفیں صرف میری ہی بدولت اٹھانی پڑی ہیں مگر میں ایسا کرنے کیلئے مجبور تھا۔ میرا کام دیش کی سیوا ہے۔ ملک اور قوم کی خدمت میرا فرض ہے۔

لیلاوتی:- آپ مجھے دیوی کہکر پاپ میں گھسیٹ رہے ہیں۔ نہیں — میں دیوی نہیں بلکہ وہی لیلا ہوں جسے آپ نے پاپ کے نرک سے نکالا ہے۔ سچ پوچھئے تو آپ دیوتا ہیں۔

سوشیل:- (دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے) وہ دیکھو لیلاوتی — سامنے پہاڑی پر تم کو کوئی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ وہی میری ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہم وہاں پہنچ جائینگے۔ مگر افسوس وہاں آپ کو دکھ کے سوا اور کچھ نہ ملے گا۔

لیلاوتی:- نہیں — انسان دھن دولت ہی سے سکھی نہیں رہتا۔ مجھے ایسی جھونپڑی میں جو سکھ ملیگا وہ عالی شان محلوں میں بھی نہ مل سکا۔

[illegible]

زندگی صرف اتنی ہی نہیں ہے۔

(اس کی آواز گلے میں پھنس جاتی ہے)

نوجوان:- ہاں — ہاں — خاموش کیوں ہوگئیں؟

لیلاوتی:- (ادھر اُدھر دیکھ کر) میری عمر صرف دس برس کی تھی تو میں جنگلوں میں اپنی بھیڑ بکریاں چرانے جایا کرتی تھی۔ وہاں ایک جوتشی نے مجھ سے کہا کہ "تو رانی کہلائیگی تیرے پاس بےشمار دھن دولت ہوگی۔ ہزاروں تیرے آگے اپنی دولتیں نچھاور کرینگے۔ مگر پھر بھی تو سکھی نہ ہوگی:" جوتشی کا ایک ایک حرف حقیقت میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے سب "رانی" کہتے ہیں میرے پاس بے شمار دھن دولت ہے۔ ہزاروں میرے آگے اپنی دولتیں نچھاور کرتے ہیں۔ لیکن —

نوجوان:- کہو — کہو — میں سن رہا ہوں۔

لیلاوتی:- ہاں۔ پھر بھی اس خوشی و مسرت سے بھری ہوئی دنیا میں — میری زندگی سکھ اور شانتی سے خالی ہے۔ اب میں اس جیون سے گھبرا گئی ہوں۔ مگر اس قید کی زنجیروں کو توڑ دینا میری طاقت سے باہر ہے اس لئے کہ یہاں ہر وقت کوئی نہ کوئی میری نگرانی کیلئے موجود رہتا ہے — اب مجھے حقیقی سکون کی تلاش ہے۔ اور اُس جگہ جانے کی آرزو ہے جہاں میرے بچپن کی یادگاریں بکھری ہوئی ہیں۔

نوجوان:- رانی جی! کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟

لیلاوتی:- میرے بچپن کا نام "لیلاوتی" ہے۔ یہاں پہلے لوگ مجھے "بائی جی" کہتے تھے جس سے مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اس لئے میں نے کہہ دیا کہ مجھے "رانی جی" کہا کریں۔ اس لئے میں اب رانی جی کے نام سے مشہور ہوں۔

(لیلاوتی کی آنکھیں پُر نم ہو جاتی ہیں)

نوجوان:- میں آپ کی امداد کرونگا اور آپ کو اس نرک سے نکالنے کی ہر امکانی کوشش کروں گا۔

لیلاوتی:- (سنجیدگی سے) دیکھئے۔ باتیں جتنی آسانی سے کہی جا سکتی ہیں انہیں عملی جامہ پہنانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اس کیلئے ہمت اور قربانی کی ضرورت ہے۔ مجھے اس نرک سے نکالنا آسان کام نہیں۔ آپکو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ کیا آپ میرے لئے ان تمام مشکلات کو برداشت کرنے کیلئے تیار ہیں؟

نوجوان:- لیلاوتی — میں ملک و قوم کی بہبودی کیلئے سب کچھ برداشت کرنے کیلئے تیار ہوں۔ آپ کی بھلائی گویا اپنی قوم کی خدمت ہے۔ جو میرا فرض ہے۔ خواہ راہ میں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں۔ لیکن میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔

سوشیل: — لیلا، آپ بہت تھک گئی ہو گی۔ اس لئے کچھ دیر اس درخت کے نیچے آرام کیجئے۔

لیلاوتی: — میں کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے "دیوی" اور "آپ" کہہ کر شرمندہ نہ کیجئے میں ان الفاظ کے لائق نہیں ہوں۔ میرا نام لیلو ہے۔ مجھے لیلا ہی کہہ کر پکارا کیجئے۔

سوشیل: — اچھی بات ہے۔ تم جس بات میں خوش ہو میں وہی کرونگا۔ اچھا تو لیلاوتی تم اس پیڑ کے نیچے آرام کرو۔ یہ میرا حکم ہے۔ (سوشیل زور سے ہنستا ہے)

لیلاوتی اور سوشیل درخت کے نیچے بیٹھ جاتے ہیں

لیلاوتی: — (افسوس سے) آہ — بیتے ہوئے سکھ دنوں کی یاد میرے دل کو مسل رہی ہے۔ ہاں ایک دن وہ تھا۔ جب میرے گھر بھی تھا۔ ماں، باپ، بہن، بھائی سب ہی تھے۔ نہیں — نہیں — میرے کوئی نہیں تھا — مگر — گر —

(لیلاوتی خاموش ہو جاتی ہے)

سوشیل: — (بات بدلنے کیلئے) لیلاوتی وہ دیکھو سامنے میرا گھر نظر آ رہا ہے۔

لیلاوتی: — (خاموش ہے)

سوشیل: — لیلاوتی کیا تم دیکھ رہی ہو — اب ہم بہت جلد گھر پہنچ جائینگے۔

لیلاوتی: — (بدستور خاموش ہے)

سوشیل گھبرا کر لیلاوتی کا شانہ ہلاتا ہے

سوشیل: — ارے بے ہوش ہو گئی —

(وہ کچھ دیر سوچتا ہے۔ پھر لیلاوتی کو وہیں لٹا کر ایک طرف کو چل دیتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک گاڑی لیکر واپس آتا ہے۔ اور لیلاوتی کو اس میں لٹا کر لیجاتا ہے)

سوشیل: — (افسردہ لہجہ میں) ڈاکٹر صاحب — ذرا مریضہ کو جلد دیکھ لیجئے

ڈاکٹر: — کیا بات ہے"

(ڈاکٹر لیلاوتی کے چہرہ سے کپڑا اٹھاتا ہے)

سوشیل: — یہ بات کرتے کرتے بے ہوش ہو گئی۔ آپ اسکو جلد ہوش میں لانیکی کوشش کیجئے۔

ڈاکٹر: — (مریض کی نبض دیکھتا ہے) کوئی خوف و تردد کی بات نہیں۔ کسی ذہنی و ذہنی تکلیف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی۔ جلد اچھی ہو جائے گی — آپ مطمئن رہیئے۔

(ڈاکٹر لیلاوتی کی پیشانی پر کوئی دوا ملتا ہے۔ اور پھر بجلی کا پنکھا چلا دیتا ہے نوجوان قریب ہی ایک کرسی پر کچھ دیر خاموشی سے بیٹھا رہتا ہے پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہوتا ہے)

سوشیل: — ڈاکٹر صاحب! میں ذرا گھر جا رہا ہوں۔ بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔

ڈاکٹر: — لیکن یہ مریضہ؟

سوشیل: — یہ آپ کی حفاظت میں رہے گی۔

ڈاکٹر: — نہیں — آپ ذرا دیر اور قیام کیجئے۔ ان کی طبیعت کچھ اور سنبھل جائے تو جایئے گا۔

سوشیل: — (کچھ دیر سوچ کر) نہیں ڈاکٹر صاحب — میں اس وقت ایک انتہائی ضرورت سے جا رہا ہوں۔ جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔

ڈاکٹر: — اچھا جایئے — لیکن کس وقت تک واپس آیئے گا؟

سوشیل: — کوئی گھنٹہ — ڈیڑھ گھنٹہ میں۔

(نوجوان دو چار قدم جاتا ہی پھر مڑکر ڈاکٹر کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے)

سوشیل: — ڈاکٹر صاحب — جب ان کو ہوش آ جائے تو کہدیجئے گا کہ کسی ضرورت سے گھر گیا ہے۔ کوئی گھنٹہ بھر میں آتا ہوگا۔

ڈاکٹر: — اچھی بات ہے۔ جایئے۔

سوشیل چلا جاتا ہے

(دو روز بعد لیلاوتی کو ہوش آتا ہے۔ وہ آنکھیں کھولتی ہے تو اپنے آپ کو ایک نئی جگہ پاتی ہے۔ اور ایک اجنبی کو پاس کھڑا دیکھکر گھبرا جاتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ کہتی ہے)

لیلاوتی: — پرماتما — کیا میں کوئی سپنا دیکھ رہی ہوں۔

ڈاکٹر: — (تسلی آمیز لہجہ میں) آپ گھبرایئے نہیں۔ آپ ہسپتال میں ہیں۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟

لیلاوتی: — اچھی ہے۔

ڈاکٹر: — (شیشی سے دوا انڈیلتے ہوئے) اچھا اب دوا پی لیجئے۔

لیلاوتی: — (گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے) مگر — وہ کہاں ہیں؟

ڈاکٹر: — کون —؟ وہ جو آپ کے ہمراہ آئے تھے۔

لیلاوتی: — جی ہاں — وہی —

ڈاکٹر: — وہ تو اسی وقت چلے گئے تھے۔ اور کہہ گئے تھے کہ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد آ جاؤں گا۔

لیلاوتی: — (بات کو کاٹتے ہوئے) تو کیا ابھی انکو گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر: — جناب ان کو گئے ہوئے دو دن گذر گئے۔ لیکن ان کا ابھی تک پتہ نہیں۔

لیلا وتی :۔ (ایک ٹھنڈی سانس لیکر) ... جتنی جلدی ... [illegible]

[illegible]

ڈاکٹر :۔ وہ آپ کے کون تھے ——— ؟

لیلاوتی :۔ میرے ——— میرے وہ کچھ نہ تھے ... میں اندھیرے میں تھی ——— [illegible] سوچ رہا تھا۔ مگر آہ مجھے دھوکا ہوا۔ خیر وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔

لیلاوتی :۔ (کچھ دیر سر جھکا کر سوچتی ہے اور پھر پوچھتی ہے) آپ کا گھر یہاں سے کتنی دور ہے۔

لیلاوتی :۔ میرا گھر ——— ڈاکٹر صاحب میرے گھر تو نہیں ہے۔ میں بیوہ تھی۔ اس نوجوان نے مجھے اس نرک سے نکالنے کا عہد کیا ——— مگر آہ ——— اس نے بھی مجھے دھوکا دیا۔

ڈاکٹر :۔ (زمین پر لکیریں بناتے ہوئے) آہ ——— کتنی بدنصیب ہے ——— اور کتنی بھولی ——— ابھی اس نے دنیا کے نشیب و فراز نہیں دیکھے ——— اور وہ شخص بھی کتنا خود غرض اور بے رحم تھا۔ غریب کو منجدھار میں چھوڑ کر چل دیا۔

(پردہ ہٹتا ہے۔ نرس ایک لفافہ ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوتی ہے۔ اور اسے ڈاکٹر کے سامنے رکھ کر واپس چلی جاتی ہے)

ڈاکٹر :۔ کیا آپ کا نام لیلاوتی ہے؟

لیلاوتی :۔ جی ہاں ———

ڈاکٹر :۔ تو لیجئے یہ آپ کے نام خط ہے۔ شاید انہیں صاحب کا ہے۔

لیلاوتی :۔ اگر تکلیف نہ ہو تو آپ ہی ذرا پڑھ کر سنا دیجئے۔ اس لئے کہ مجھ میں پڑھنے کی طاقت نہیں رہی۔

(ڈاکٹر لفافہ چاک کرتا ہے۔ اور خط پڑھتا ہے)

دیوی لیلاوتی ! ———

معاف کرنا۔ میں بڑا ہی خود غرض ہوں ——— آج میں ہمیشہ کیلئے تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اب شاید اس زندگی میں ملاقات نہ ہوگی۔ اس وقت تمہارے وہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ باتیں جتنی آسانی سے کہی جاتی ہیں انہیں عملی جامہ پہنانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اسکے لئے ہمت اور قربانی کی ضرورت ہے۔ دیوی ! آج اس دنیا میں مجھ سا بے رحم شاید ہی اور کوئی ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم جیسے غیر مستقل مزاج لوگوں کا کام دیش کی سیوا نہیں ہے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میں کس طرح تم کو اپنے حالات لکھوں۔ سنو ! میں دلی کے ایک رئیس کا بیٹا ہوں۔ میرے باپ نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ اور ایک اچھی نوکری پر میرا تقرر بھی ہو گیا تھا لیکن دیش سیوا میں لگ جانے کی وجہ سے نوکری، چاکری

[illegible] ... جو [illegible]

[illegible]

عجیب و غریب حالات تھے۔ ... [illegible] ... میں نے تمہیں اس وقت ... [illegible] ... ہی جاتی ہو مجھے افسوس ہے کہ میں ... نہ کر سکا۔ میری ... بار ——— سچ بولو کیا تم نے مجھے معاف کر دیا۔

میری لیلا ! میں نے تمہارا ساتھ کیوں چھوڑا۔ یہ ایک لمبی داستان ہے مختصر یہ کہ اس دن گھر لوٹنے پر مجھے پتا جی کا تار ملا۔ جس میں جلد دلی پہنچنے کی تاکید کی تھی۔ چنانچہ میں مجبوراً اسی روز دلی روانہ ہو گیا۔ اب میری شادی ایک بڑے گھرانے میں ہو رہی ہے لڑکی میں وہ سب خوبیاں ہیں جو ایک اچھی لڑکی میں ہونی چاہئیں ———

ہمارے ڈاکٹر صاحب بہت بھلے آدمی ہیں۔ تم ان کو میرا خط دکھا دینا وہ تمہاری ہر طرح امداد کریں گے ———

امید ہے کہ اب تم بالکل تندرست ہو گئی ہوگی ——— اچھا رخصت ———

آشیرباد کا طالب تمہارا خود غرض سوشیل

لیلا نے خط کو سنا اور اس کا جواب ایک حقارت آمیز مسکراہٹ سے دیا۔ پھر اپنے بالوں کو انگلیوں میں لپیٹتے ہوئے درد بھری آواز میں گنگنانے لگی۔

ڈاکٹر :۔ (لمبی سانس لیکر) لیلاوتی ایسے دکھ بھرے گیت کیوں گا رہی ہو؟

لیلاوتی :۔ ڈاکٹر صاحب۔ میری زندگی ہی کچھ ایسی دکھ بھری ہو گئی ہے۔ میرے دل میں بیتے ہوئے دنوں کی جو جوالا مکھی دہک رہی ہے اسے ٹھنڈا کرنے کیلئے اس طرح گنگنا کر اپنے دل کو نہ بہلاؤں تو بتلائیے دکھی دنوں کو کس طرح کاٹوں ———

اگر آپ کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو معاف کیجئے۔

ڈاکٹر :۔ نہیں لیلاوتی۔ اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ بلکہ میں یہ چاہتا تھا کہ تم کسی اور طرح اپنا دل بہلایا کرو۔ دیکھو سامنے کتنا خوبصورت باغیچہ ہے۔ کس قدر پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ تم اسکی سیر کیا کرو اور کسی دکھی خیال کو اپنے پاس نہ آنے دو۔

لیلاوتی :۔ ڈاکٹر صاحب ! اب میری زندگی کا سہارا یہی میری غمناک داستان ہے۔ مجھے اسی میں سکھ ملتا ہے۔ اب میں چاہتی ہوں کہ بیتے ہوئے دنوں کی یاد میں تڑپ تڑپ کر زندگی کے جو چند لمحات اور ہیں انہیں بھی ختم کر دوں۔

ڈاکٹر :۔ (بات کا رخ بدلتے ہوئے) لیلاوتی ! ——— تو اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟

لیلاوتی :۔ میں آج یہاں سے روانہ ہو جاؤنگی۔ میری وجہ سے آپ کو جو تکلیف پہنچی

اس کیلئے میں مانی جاتی ہوں۔ میں کسی کا احسان نہیں ۔۔۔ امید ہے کہ آپ ۔۔۔ (خاموش ہو جاتی ہے)

ڈاکٹر:۔ لیکن ۔۔۔ کہاں جاؤ گی؟

لیلاوتی:۔ وہیں ۔۔۔ جہاں میرے بچپن کے دن بیتے تھے۔ ہاں آپ سے ایک پرارتھنا ہے کہ اگر وہ نوجوان آپ کو کبھی ملے تو اس سے کہئے گا کہ آدمی کو اس کام کے کرنے کا ارادہ کبھی نہ کرنا چاہیئے۔ جو اسکی طاقت سے باہر ہو۔

(لیلاوتی پر بے ہوشی طاری ہونے لگتی ہے۔ وہ خاموش ہو جاتی ہے)

(پردہ)

تیسری جھلک

سین:۔ شام کا وقت ہے سورج ڈوب رہا ہے۔ لیلاوتی اور ڈاکٹر بیل گاڑی میں بیٹھے ہوئے گھنے جنگلوں سے گذر رہے ہیں۔

لیلاوتی:۔ (کراہتے ہوئے) ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ اب کتنی دور ہے؟

ڈاکٹر:۔ اب کچھ زیادہ دور نہیں ۔۔۔ وہ دیکھو ہرے بھرے درخت اور کوہ ہمالیہ کی سفید برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں اب بہت صاف دکھائی دے رہی ہیں۔

لیلاوتی:۔ (خوش ہو کر) ہاں۔ اب ہم آ پہنچے۔ وہ دیکھو یہ جھرنا ۔۔۔ اب بھی اسی طرح بہہ رہا ہے۔ جس طرح کبھی میرے بچپن میں بہا کرتا تھا۔ آہ ۔۔۔ اور اس ڈھاک کے پیڑ کو دیکھو یہ بھی اسی طرح اس آبشار کے کنارے کھڑا ہے۔ جہاں میں سہیلیوں کے ساتھ بھیڑ بکریاں چرایا کرتی تھی۔ ہاں یہ سب چیزیں اب بھی ویسی ہی ہیں۔ لیکن (اپنے ہاتھ پیروں کو دیکھتی ہے) میں اب ویسی نہیں رہی۔ یہ برس کے پھول کس قدر پیارے معلوم ہو رہے ہیں۔ ذرا مجھے اٹھا کر دکھا دیجئے۔ میں اس منظر کو جی بھر کر دیکھ لوں

(ڈاکٹر، لیلاوتی کو اتار کر ایک پیڑ کا سہارا دیکر بٹھا دیتا ہے)

لیلاوتی:۔ ہاں ۔۔۔ اب میں سکھی ہوں۔ اس شانتی سے بھری جگہ میں دنیا کے دکھوں سے دور پرماتما کی گود میں چین و سکھ کی نیند سوؤں گی۔ اور ہمیشہ سبزہ میرے گرد لہراتا رہے گا۔ ڈھاک کی چوڑی چوڑی پتیاں جھوم جھوم کر مجھے ہوا کرینگی۔ یہ سنہرا جھرنا مجھے ہمیشہ کیلئے اپنی گود میں چھپا لے گا۔

ڈاکٹر:۔ اب تم تھک گئی ہو گی ۔۔۔ ذرا لیٹ جاؤ ۔۔۔

لیلاوتی:۔ اچھا ۔۔۔ اب مجھے لٹا دیجئے ۔۔۔ ڈاکٹر صاحب مجھے جس زندگی کی خواہش تھی۔ وہ آج آپ کی بدولت میسر آگئی۔ اس کے لئے میں آپ کی شرمندۂ احسان ہوں۔

(لیلاوتی کروٹ بدلتی ہے اسکی نظریں ہمالیہ کی سفید چوٹیوں پر جم جاتی ہیں)

لیلاوتی:۔ (خود سے) اے ظالم دنیا! تو میرے بعد ضرور آنا ۔۔۔ دیکھ میں اس درخت کے نیچے سو رہی ہونگی جہاں ہر طرف ہری ہری گھاس اگی ہوگی۔ اور اس درخت کے نیچے پھولوں کی نازک پنکھڑیاں میرے اوپر بکھری ہوئی پڑی ہونگی۔ میں تم سے نہ بول سکوں گی۔ مگر ہاں ۔۔۔ یہ نازک پنکھڑیاں میری زندگی کی حسرت ناک داستان تم کو سنائینگی۔ کیا تم سمجھ سکو گے کہ یہ وہی دیہاتی لیلاوتی سو رہی ہے ۔۔۔

ڈاکٹر:۔ لیلاوتی! تم اس قدر بہکی بہکی باتیں کیوں کرتی ہو؟ اس سے تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

لیلاوتی:۔ ڈاکٹر صاحب! دیکھئے ۔۔۔ بھولئے گا نہیں ۔۔۔ یہ موتیوں کی مالا میری ماں نے دی تھی یہ دیہاتی سہاگ ہے۔ اسے میرے ساتھ ہی رکھ دیجئے گا ۔۔۔ اور پھر ۔۔۔

یہ کہتے کہتے لیلاوتی کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ ہمیشہ کی نیند سو گئی۔

ڈاکٹر:۔ (فرطِ اضطراب سے) اے دیہاتی لیلا! ۔۔۔ ہاں تیری آرزو تو پوری ہو گئی ۔۔۔ لیکن میری تمنا تیرے ساتھ اس درخت کے نیچے دفن ہے۔

(پردہ)

ضربِ غم

از محترمہ رابعہ پنہاں صاحبہ

شب سکوت افزا مناظر رات کے خاموش سے تھے
دن کے ہنگامے خمارِ نوم سے مدہوش سے تھے
جھلملاتے تھے فلک پر یوں ستاروں کے چراغ
جس طرح چمکیں دلِ مایوس میں حسرت کے داغ
عالمِ امکاں کی ہر شے پر برستا تھا تکان
ایک بے کیفی میں تھی ملفوف بزمِ آسماں
تھی تپش کی ابتدا گرمی ابھی سے تیز تھی
اور ہوا کافی تپش اندوز و حدت خیز تھی
گرم تھے دیوار و در کچھ آ رہی تھی سینک سی
روشنی شمعوں کی بےحد ناگوار آنکھوں کو تھی
دل بہت بےچین تھا گرمی کے اس انداز سے
طبیعت چاہتی تھی کچھ نہ ہرگز کیجئے
لیکن اس عالم میں بھی تسکین کچھ ہوتی نہ تھی
کچھ نہ کرنے سے بھی دل کو اور بےچینی ہوئی
کشمکش سے تھک کے پھر اخبار ہی پڑھنے لگی
غرق اس کے جزر و مد میں یہ کشاکش ہو گئی
پڑھتے پڑھتے دفعتہً دل میں ہوا پیدا خروش
بحرِ تخیلات میں اٹھا نئے طوفاں کا جوش
کائناتِ قلب و دل زیر و زبر ہونے لگی
اور دنیائے تخیل منتشر ہونے لگی
آنکھ خوں رونے کو تھی تیار ان حالات پر
ضربِ غم پڑنے لگی پھر لوحِ محسوسات پر
یوں کیا بیتاب دل نے آسماں سے پھر خطاب
اے ستمگر کب ورق الٹے گی یہ خونیں کتاب

آج تک چشمِ جہاں نے یہ سماں دیکھا نہ تھا
تجھکو اتنا سنگ دل اور فتنہ گر سمجھا نہ تھا
عالمِ امکاں میں ظالم کیا سے کیا ہو جائے گا
یہ نظامِ دہر یوں مٹ کر فنا ہو جائے گا
ریزہ ریزہ ٹوٹ کر ہو جائے گا جامِ حیات
یا الٰہی دیکھئے کیا ہو گا انجامِ حیات
گلشنِ آبادِ جہاں کی اس طرح تخریب ہو
تیری دنیا یوں اسیرِ پنجۂ تعذیب ہو
جورِ انساں کی فراوانی خدایا تابکے
خونِ انساں کی یہ ارزانی خدایا تابکے
بندۂ مجبور پر جابر کی قدرت تابکے
بےبسوں پر ظالموں کا جبر و شدّت تابکے
گرگِ خوں آشام ہیں یارب کہ یہ انساں ہیں
جس سے شرمائے جہنم وہ یہاں ساماں ہیں
کیا زمین و آسماں آپس میں ٹکرا جائیں گے
کیا قیامت یا الٰہی تیرے بندے لائیں گے
یہ تشدّد یہ تباہی یہ ہلاکت الاماں
جوشِ وحشت الحذر یہ قتل و غارت الاماں
کس طرح انسانیت انسانیت کی ہے عدو
کس طرح پیتا ہے انساں ایک انساں کا لہو
کس طرح کٹتے ہیں انساں ان گنت اور بے حساب
کس کی گردن پر رہے گا اتنے کشتوں کا عذاب
رونگٹے جس کے کھڑے ہوتے ہیں وہ منظر ہے یہ
ہے تصور لرزہ بر اندام وہ محشر ہے یہ

کہتے تھے دوزخ کو کہتے تھے جو افسانہ کبھی
اُن کی آنکھوں نے بھی دنیا میں دوزخ دیکھ لی
اُف یہ طوفاں آگ کا وہ بحرِ آتش ہر طرف
وہ لپک شعلوں کی وہ دودِ جہنم کف بہ کف
بے کئے تیار اب تعمیر ہوتی ہے چتا
خاکِ انساں خاک ہو کر آج ہوتی ہے فنا
مسلم و کافر سبھی کا حشر یکساں ہو گیا
یعنی نذرِ شعلۂ اعمال انساں ہو گیا

پردۂ تہذیب میں یہ خون کی گل کاریاں
اور ترقی کی بدولت یہ ہلاکت باریاں
آہ حیوانوں کی قربانی بھی یوں ہوتی نہیں
دیکھنا! یہ اشرف المخلوقات ہیں، صد آفریں
کس کی چشمِ فتنہ گر کی ہیں کرشمہ خیزیاں
کس نے کی ہیں جنبشِ لب سے ستم انگیزیاں
خونِ صد حسرت سے رنگیں کس کی پیشانی ہوئی
ہو گئی قربان کس کے آستاں پر زندگی؟

ہے ہوس کے دیوتا کی آہ یہ قربان گاہ
مانگتا ہے آسماں جس کے تظلّم سے پناہ
گردنِ انسانیت پر تیز ہے دندانِ آز
خونِ عالم کر رہا ہے حرص کا دستِ دراز
پنجۂ ظالم ہوس کا اور نظامِ کائنات
آ گئی ہے دستِ شیطاں میں زمامِ کائنات
علم و حکمت نے اڑا دیں دھجیاں تقدیر کی
چاک کر ڈالی ترقی نے قبائے زندگی
یہ دغا یہ مکر و فن اور یہ فریب آرائیاں
نت نئی عیاریوں کی یہ شگوفہ زائیاں
ہے خجل ابلیس بھی انساں کی حکمت دیکھ کر
یہ تدبر دیکھ کر اور یہ سیاست دیکھ کر
بندۂ بے دام ہے شیطان کا انسان آج
حکمراں نظمِ جہاں پر ہو گیا شیطان آج
حکمتِ ابلیس ہے انگشتِ حیرت در دہاں
جیت لی انساں نے بازی بر سرِ میداں یہاں

بیباک نگاہیں

(محترمہ عزیز جہاں بیگم صاحبہ آدا بدایونی)

ارزاں وہ نگاہیں ہیں زمانے میں کہ جن کو
ہر پھول کے دامن پہ کریں ناز سے سجدہ
گہ تشنگیٔ خار سے لیں درسِ تشکر

ہر منظرِ خوش رنگ کے انداز لبھا لیں
ہر غنچۂ نو اس کو کلیجے سے لگا لیں
ذروں کو کبھی ہمدم و ہمراز بنا لیں

کمیاب ہیں لیکن وہ جہاں سوز نگاہیں
بڑھ کر جو کمند انجم و خورشید پہ ڈالیں

اور بھرتی ہو رہی ہے!

(از محترمہ شیریں)

محبت کا سوز مجھکو تو بولے صبح ازل فرشتے
مثال شمع مزار ہے تو تری کوئی انجمن نہیں ہے (اقبال)

نیلوفر کتنی دیر سے اپنے کتب خانہ کی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی نگاہیں گھاس کے لان پر سے ہوتی ہوئی بنگلہ کی نیچی دیوار پر سے گذر کر سامنے میدان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جہاں آج ریکروٹنگ آفیسر کے خیمے نصب تھے۔

ماہ فروری کی آخری تاریخیں تھیں۔ آفتاب میں ہلکی سی تمازت پیدا ہو چکی تھی۔ موسم بہار کی ولولہ انگیز ہوائیں چلنی شروع ہو گئی تھیں۔ ٹنڈ منڈ درخت اپنا نیا دھانی لباس زیب تن کر رہے تھے۔ طرح طرح کے پرند اپنی میٹھی بولیوں سے دل میں گدگدی سی پیدا کر دیتے تھے۔ نارنگی کے پھولوں کی شعر انگیز خوشبو ہوا میں نشے بکھیر رہی تھی۔ دور تک نگاہ تک سرسوں کے حسین بسنتی کھیت دکھائی پڑتے تھے اور سامنے خیمے کے آگے بھرتی ہو رہی تھی۔

نیلوفر اکثر اپنی اسی محبوب کھڑکی میں بیٹھکر موسم کا لطف اُٹھایا کرتی تھی۔ یہیں سے وہ برسات میں اودی کالی بدلیوں اور موسلا دھار مینہ کا سما دیکھا کرتی تھی۔ یہیں بیٹھکر وہ پہروں کوئل کی دردناک اور دل کو برما دینے والی "کوک" پر غور کیا کرتی تھی۔ اور اسی جگہ بیٹھے ہوئے وہ طویل سحر انگیز افسانوں کے پلاٹ مرتب کرتی تھی۔ یہ کھڑکی گویا اُس کے دکھ سکھ کی شریک تھی۔ اس کے رازوں کی امین تھی۔ یہاں اُس نے کتنے کشیدہ کاری کے بہترین نمونے تیار کئے تھے۔ کتنی کتابیں پڑھی تھیں۔ کتنے افسانے لکھے تھے۔ کتنے گیت گنگنائے تھے۔ اور کتنے ہی آنسو بہائے تھے۔ لیکن آج نیلوفر یہاں بیٹھکر تخیل کے شہپر کے دوش پر پرواز نہیں کر رہی تھی۔ نہ ماضی کا کوئی سہانا سپنا دیکھ رہی تھی نہ کتاب ہی پڑھ رہی تھی۔ آج تو اُسکی نظریں سامنے میدان میں گڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک عجیب و غریب کھیل دیکھ رہی تھی۔ انسانی قوت وطاقت کے پرکھنے کا انوکھا کھیل۔

ایک دفعہ کہیں جاتے ہوئے راہ میں نیلوفر نے ایک مویشیوں کی بہت بڑی منڈی دیکھی تھی اور یوں ہی واقفیت کیلئے وہ کچھ دیر تک موٹر کو رکوا کر اس [illegible] میں تھے۔ [illegible] ان مویشیوں کو [illegible] جانچا پرکھا جا رہا تھا۔ کسی کے سینگوں کی لمبائی [illegible] کرتا۔ اور کسی کے بڑے بڑے تھن [illegible] کتنی دیر میں سودا پٹتا ہوگا۔

اور آج اسکی نظروں کے سامنے بالکل اُسی طرح ایک انسانوں کی منڈی لگی ہوئی تھی۔ ہر طرف سے آدمیوں کا دریا سا اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ سب [illegible] کے لوگ تھے۔ سیاہ فام تنومند۔ نیم برہنہ جسم۔ بڑی بڑی [illegible] بڑی پگڑیاں باندھے نڈر لوگ۔ انکے پیچھے تیز تیز بچھڑوں والے گنڈی [illegible] نوجوان۔ مریل سے ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ غریب مزدور اور [illegible] ڈرپوک سے شہری جوان۔ سب جوق در جوق آ کر ایک طرف کو بیٹھتے جاتے تھے۔ پھر ایک شخص ان سے باری باری کچھ پوچھتا جاتا۔ ایک ڈاکٹر معائنہ کرتا۔ [illegible] سینہ ناپا۔ کمر کی چوڑائی دیکھتا۔ بینائی جانچتا۔ اُن سے چند آلتی [illegible] لگوائی جاتیں اور ان کا نام رجسٹر میں درج کر لیا جاتا۔ اتنے لوگوں میں ایک شخص بھی ان فٹ نہیں ہوا تھا۔ کسی ایک کا بھی تو سینہ یا قد چھوٹا نہیں نکلا تھا۔ ایک کی بھی تو بینائی کمزور نہیں بتائی گئی تھی۔ اور نیلوفر سوچ رہی تھی کہ ہندستانی کس قدر تندرست وتوانا ہو گئے ہیں جو سو فی صدی فوجی خدمات کیلئے موزوں ہونے لگے ہیں۔ [illegible] اس فوجی ڈاکٹر کا اعتبار تھا کہ اس وقت بھارت کے فاقہ زدہ اور اکثر [illegible] کی بیماری میں مبتلا سپوت ایک سرے سے صحت مند و بہادر ہو گئے تھے۔ بہرحال کچھ بھی ہو اس وقت ہر جوان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آ گئی تھی۔ ہر ایک کے جسم میں ایک قسم کا تناؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت کسی چہرہ پر بھی خوف یا [illegible] نہیں تھی۔ کوئی بھی ناگواری کا احساس نہیں کر رہا تھا۔ پیٹ بھر روٹی اور آرام [illegible] کے تصور نے گویا ہر ایک پر نشہ کی سی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ جس نے اُنہیں کسی دوسری دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ جانبازوں اور بہادروں کی دنیا میں۔

لیکن ایک بات نیلوفر کے لئے بہت عجیب تھی۔ اس سارے مجمع میں اُس نے ایک بھی گنگا جمنی داڑھی والا چہرہ یا کھچڑی بالوں والا سر نہیں دیکھا تھا۔ کیا ہندستان کے تمام معمر لوگ امیر اور فارغ البال ہیں۔ انہیں روٹی کی ضرورت نہیں؟ ان پر ملک کی حفاظت فرض نہیں۔ اُن کے دل اس قدر مُردہ ہو جاتے ہیں کہ کوئی تحریک انہیں حیات نہیں بخش سکتی۔ بار بار اس قسم کے سوالات اسکے دماغ میں گونج رہے تھے۔ اور اُس کا دل سینکڑوں بے ترتیب خیالات کا مرکز بنا ہوا تھا

اُس [illegible] عالم میں بھرتی کا تماشہ دیکھنے جا رہی تھی۔

رات کو کھانا کھانے سے فارغ ہو کر ظفر حسبِ معمول بڑے سے صوفے پہ دراز اخبار پڑھ رہا تھا۔ نیلوفر ریڈیو کے نزدیک بیٹھی ہوئی کچھ سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گن گن کر خانہ اُٹھا رہی ہو۔ دراصل اُسکی نگاہیں ایک عجیب سا [illegible] دیکھ رہی تھیں۔ ایک [illegible] کے [illegible] سامنے تھا۔ [illegible] اُسکی محویت کو توڑ [illegible] جو ظفر بیٹھا ایک انگریزی رسالے میں سے تصویریں دیکھ رہا تھا۔ مگر [illegible] وہ پھر اُسی تصور میں کھو جاتی۔

"آج تو میں دن بھر بھرتی کا تماشہ دیکھتی رہی" نیلوفر نے کچھ دیر بعد سامنے دیوار پہ نگاہیں جمائے ہوئے ظفر کو مخاطب کر کے کہا۔ جو اخبار ختم کر کے اب سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اچھا" ظفر نے بدستور آنکھیں بند کئے ہوئے پوچھا "کیا دیکھا؟"

"آدمیوں کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا گویا" نیلوفر بولی "اتنے لوگ بھرتی ہوتے رہے کہ شام ہو گئی مگر ان کا تانتا ختم نہ ہوا۔ کتنی مسرت کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے نوجوانوں میں بھی خدمتِ وطن کا جذبہ پیدا ہو چلا ہے۔ جبھی تو ایسی آمادگی اور خوشی سے اس طرح جان پر کھیلنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ان سب کے ارادوں میں کتنا استقلال اور جوش تھا۔"

ظفر نے آنکھیں کھول لیں۔ اسکے چہرہ پہ کچھ ناگواری کی سی جھلک تھی۔ "یہ ملک کی خدمت کا جوش نہیں" وہ کہنے لگا۔ "روٹی کی تڑپ ہے۔ بیچارے بھوکوں مرتے آ کر بھرتی ہو جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں چلو پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھکنے کو کپڑا تو ملے گا۔"

"یہ تو نہ کہیئے" نیلوفر بُننے کا سامان تھیلے میں ڈالتے ہوئے بولی۔ "کتنے کھاتے پیتے جوان خود ہی جا جا کر اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بہتوں کو پیٹ کی بھوک ہی اس جانبازی پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن پھر بھی ہمت اور ولولہ چاہیئے۔ جوانی کا تقاضہ ہے کہ اُسے مشکلات اور ناممکنات میں پڑ کر لطف حاصل ہوتا ہے۔ خطروں کے سامنے سینہ سپر ہونے میں مسرت محسوس ہوتی ہے اور یہ بھرتی ہونے والے بھی تو سب کے سب جوان ہی ہوتے ہیں۔"

"اچھی جوانی ہوئی" ظفر کچھ جھنجھلائے انداز میں کہنے لگا۔ "دیوانہ سوچا۔ خواہ مخواہ جلتی آگ میں کود پڑتا۔ بھلا جن غریبوں کو روٹی کے لالے پڑے ہوں وہ تو چاہے اپنی جان کی بازی لگائیں۔ کسی اچھے بھلے کھاتے پیتے کو کیا ضرورت پیش آئی کہ جان پہ کھیل کر میدان میں پھاند جائے۔ کیا فوج میں جائے بغیر یہاں بیٹھ کر ملک کی کوئی خدمت نہیں کی جا سکتی؟ جنگ کیلئے کوئی امداد نہیں دی جا سکتی؟ یوں کہو محض ناتجربہ کاری۔ جلد بازی اور آتش بیچی کا جذبہ۔"

نیلوفر نے کبھی ظفر کے ساتھ بحث نہیں کی تھی۔ وہ اُس کے ساتھ بحث مباحثہ کرنا فضول سمجھتی تھی جو کسی موضوع پر فلسفیانہ نظر سے غور کرنے اور اُسکی گہرائی تک پہنچنے کا عادی نہ ہو۔ آج خدا جانے کیوں اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس موضوع پر طویل بحث کر ڈالے۔ اُسے ظفر کو قائل کرنے کی خواہش نہیں تھی۔ وہ محض اس بارے میں اپنے نظریے کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ مدت مدید کے دبے ہوئے احساسات کو گویا پھوٹ بہنے کا راستہ مل گیا تھا جیسے دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ وہ استقلال سے بولی "جلتی آگ میں وہی کودے گا جس کے دل میں ولولہ ہوگا۔ اُمنگ ہوگی۔ جذبات کی گرمی ہوگی۔ مضمحل دماغ اور تھکے ہوئے قویٰ اس قابل کہاں کہ کسی خطرے کے مقابلے کیلئے کھڑے ہو سکیں۔"

"تو گویا خطروں میں پڑنا ہی بہادری کی دلیل ہے" ظفر نے طنز سے کہا۔

"اور کیا ہوگا" نیلوفر نے جوش سے جواب دیا۔ "بلکہ یوں کہیئے خطروں میں پڑنا ہی زندگی کی دلیل ہے۔ کسی تبدیلی کے بغیر یکساں ساکت و صامت زندگی بسر کرنا تو گویا موت کے مترادف ہے۔"

ظفر چونک سا گیا۔ اُس کے دل میں ایک نامعلوم سا جذبۂ خوف پیدا ہو گیا تھا۔ نیلوفر کا یہ اندازِ گفتگو، یہ مضبوط لہجہ اسکے لئے بالکل انوکھا تھا۔ اُسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے نیلوفر اُسکی در پردہ تضحیک کر رہی ہو۔ "تم غلطی پر ہو" اُس نے نرمی سے کہا۔ "بہادری۔ ہمت۔ اُمنگ یا جوش کسی خاص حصۂ عمر کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اپنی اپنی طبیعت کی اُفتاد ہوتی ہے۔ بہتیرے جوان تمہیں ایسے ملیں گے جو بوڑھوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ اور اسکے برعکس سینکڑوں لوگ تم ایسے دیکھو گی جو بڑھاپے کی آخری منازل تک ویسے ہی زندہ دل اور پُرجوش رہتے ہیں۔ اشرف کو ہی دیکھ لو۔ پچاس سے کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ پچھلے سال بیچارے کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ بیٹے پوتے سبھی موجود ہیں۔ لیکن اُسے بیوی کے مرنے کے فوراً بعد ہی دوسری شادی کی دُھن لگ گئی تھی۔ اور اب اس مہینہ نئی شادی رچا رہا ہے۔ اب دیکھو یہ محض اُمنگ یا ولولہ ہی ہے نا جو اس عمر میں بھی ایسا زندہ دل بنائے ہوئے ہے۔ ہمیشہ خوش رہنے کا عادی ہے۔ رنج و فکر کو پاس تک نہیں پھٹکنے دیتا۔ جب دیکھو ظریفانہ گفتگو، ہنسی سے لوٹا دینے والی لطیفہ سنجیاں۔ صحت ایسی اچھی کہ کیا جوانوں کی ہوگی۔ ایسے مضبوط اعضاء۔ رنگ دیکھو جیسے سُرخ چقندر

نیلوفر ہلکی سی ہنسی ہنس دی۔ "اوہ! ابھی ابھی میں [illegible]
[illegible] نظر ہے جیسے کسی نے سنگلاخ [illegible] سامنے۔

"آپ نے تو اشرف صاحب کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی۔" نیلوفر نے کہا "میں بھی تو انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بے شک وہ ابتدا سے ہمیشہ خوش رہنے والی طبیعت لیکر آئے ہیں۔ اور جوانوں کی محفل میں بھی انہیں خاص شغف ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقی پیار، لطف اور جوش سے انہیں دور کا بھی علاقہ نہیں۔ یقین نہ ہو تو پوچھ دیکھئے۔ رہی شادی کی بات تو خدارا آپ اُمنگ اور ولولے کے مقدس الفاظ کی توہین نہ کیجئے ان کے بڑھاپے کو ایسے جذبات سے کیا سروکار۔ ان کی ڈھلتی ہوئی زندگی کو جوانی کے لطیف تخیل اور ارفع مقصدوں سے کیا واسطہ۔ کون نہیں جانتا کہ عمر کے ساتھ ساتھ انسان کے دل سے حرارت، جذبات اور لطیف احساسات ایک ایک کرکے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور وہ عروج کے اضمحلال کا علاج ہوس کے دامن میں ڈھونڈتا ہے۔ اس طرح ارفع تخیل کی جگہ اسکے دل میں ہوس ہی ہوس کارفرما ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آن کا بھی یہ جذبہ ہوس کا ہی رہین منت ہے۔ صریحاً ہوس ہے۔ اپنے غیر شاعرانہ خوابوں کی تکمیل اور حیوانی خواہشات کی تسکین کیلئے لوگ یوں ہی زندہ دلی اور جوانی کا دامن تھاما کرتے ہیں۔"

نیلوفر کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اسکی آواز میں ایک مترنم سی لرزش تھی۔ ایک دبا ہوا جوش تھا۔ ظفر کے دل کو جیسے کوئی آہنی پنجوں میں لیکر مسل رہا تھا۔ اس روحانی تکلیف کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ نیلوفر کی آج کی باتیں گویا اسکی آنکھوں کے سامنے سے کوئی بھاری پردہ سرکا رہی تھیں۔

"آخر جوانی سے تمہاری مراد کیا ہے؟" ظفر نے جیسے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح آخری پانسہ پھینکتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجہ سے دلی کرب اور ملال ظاہر ہو رہا تھا۔ "تمہارے نزدیک جوانی کا معیار کیا ہے۔ نیک و بد سے آنکھیں بند کرکے ہر ممنوع اور ناممکن کی طرف لپکنا۔ خواہ مخواہ کسی ناقابل حصول شے کیلئے زندگی اجیرن کرلینا۔ مجنونانہ خیالات اور مفتونانہ جذبات کی غلامی۔ ہر بات میں جلد بازی۔ ہر بات میں ناعاقبت اندیشی اور حماقت۔"

"وہ جنون ہو یا حماقت۔ عاقبت نا اندیشی ہو یا جذباتی ہیجان اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اصل میں زندگی انہی وارفتگی اور بے خودی کا نام ہے۔" یہ کہتے ہوئے نیلوفر کی آواز اس قدر دلآویز، اس قدر میٹھی ہوگئی تھی۔ جیسے آدھی رات کے وقت کہیں دور سے آتی ہوئی بانسری کی صدا —— اور وہ —— اسی خوابناک لہجہ میں کہتی رہی۔ "جب سینے میں مقدس جذبات کی آگ سرد پڑ جائے، لطیف خیالات مفقود ہو جائیں۔ اُمنگوں کی شمعیں بجھ جائیں [illegible] دل میں [illegible] کارفرما ہو تو تمہارے [illegible] کچھ کہ زندگی ——"

وہ یکایک نیلوفر کے [illegible] ایک مصنوعی کھوکھلے قہقہے کے درمیان بولا: "ہم بھی [illegible] کہاں کی بات کہاں لے گئے۔ جاؤ تھکے سو رہو۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔ تھکے آپ بھی؟"

لیکن ظفر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اس کی تو آنکھوں کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا چھا رہا تھا۔ بجلی کی روشنی کے قمقموں کی روشنی میں بھی اُسے کمرہ گھپ تاریک معلوم ہو رہا تھا۔ اسکے دماغ میں متعدد خیالات بھڑوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ اُسے معلوم تھا نیلوفر اس سے پورے بیس برس چھوٹی ہے وہ اسکی رفاقت کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کا بھی اسے احساس تھا۔ لیکن وہ اس بندھن سے اس درجہ متنفر، اس درجہ باغی تھی۔ اسکا تو اُسے کبھی بھول کر بھی خیال نہیں آیا تھا۔ نیلوفر کے دل میں اسکے لئے ایسے حقارت آمیز خیالات جاگزین تھے۔ وہ اُسے اور اُس کے سے اور سب معمر لوگوں کو اس قدر پست اور بےذوق سمجھتی تھی۔ یہ سب ظفر کیلئے بہت ہی عجیب تھا۔ آج تک نیلوفر نے کبھی بھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن آج کی گفتگو کا تو گویا ایک ایک لفظ اس کے دلی خیالات محسوسات کا ترجمان تھا۔ تو گویا اتنی مدت تک وہ غلط فہمی میں مبتلا رہا تھا۔

وہ تو سمجھ رہا تھا نیلوفر اسکے گھر میں بہت زیادہ خوش اور مطمئن ہے۔ پہلے پہلے وہ کبھی لڑ جھگڑ بھی لیتی تھی مگر اب تو بہت دنوں سے وہ بظاہر بیحد مسرور اور مطمئن نظر آتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا روپے پیسے کی فراوانی اور آسائش و آرام کی بہتات اُسے خوش رکھنے کیلئے کافی ہے۔ مگر آج یکایک اس پر ایسی حقیقت کا انکشاف ہوگیا تھا جو اسکے دل و دماغ کو شاید عمر میں پہلی مرتبہ ایسے اذیت دہ کچوکے لگا رہی تھی۔ اُسے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ نیلوفر کے الفاظ نہیں تھے پگھلا ہوا گرم سیسہ تھا جو کانوں کی راہ ظفر کے کلیجہ میں اُنڈیلا جارہا تھا۔ اس وقت اسے تمام پچھلی باتیں ایک ایک کرکے یاد آرہی تھیں۔ واقعی نیلوفر اپنی عمر کا بہترین حصہ اسکی پژمردہ زندگی پر نثار کر رہی تھی۔ اس وقت اسے خود محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہمیشہ کس طرح نیلوفر کے لطیف احساسات سے بے پرواہ رہا۔ کس طرح ہمیشہ ہر بات میں اسکی طبیعت و عادت میں نیلوفر سے اختلاف ہی رہا۔ واقعی اس نے نیلوفر سے کبھی بھی انصاف نہیں کیا اور یہ اس کا نہیں اسکی عمر کا۔ اسکی تربیت کا۔ اسکے ماحول کا قصور تھا۔ یہی وجہ ہے وہ نیلوفر کی نگاہوں میں اس قدر حقیر، اس قدر کمتر تھا۔ اس کا اسے خواب میں بھی گمان نہیں ہوا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے نیلوفر سے شادی

کر کے اُس نے اتنا بڑا جرم کیا ہے۔ کبھی نہ بخشا جانے والا گناہ۔ اور آج اسکے دل کے گوشے گوشے سے نیلوفر کیلئے محبت اور ہمدردی کا دریا اُمڈا آ رہا تھا۔ آج پہلی بار اُسے احساس ہوا کہ اسکے دل میں ایک ایسا جذبہ پیدا ہو گیا تھا جو عام حیوانی جذبات سے بالکل الگ اور بہت لطیف تھا۔ آج پہلی مرتبہ ظفر کے دل میں نیلوفر کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لینے کی بے لوث اور معصوم سی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ اپنی اس خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے قابل ہی کہاں تھا۔ اور اس رات ظفر کیلئے نرم و آرام دہ بچھونا انگاروں کا تختہ بن گیا تھا۔ اُسکے سارے جسم میں عجیب قسم کی آگ سی بھڑک اُٹھی تھی جیسے ایک سو پانچ ڈگری کا بخار چڑھ رہا ہو کتنی رات تک وہ خیالات کی اُدھیڑبن ۔ نیند کا کہیں پتہ ہی نہیں تھا۔

اگلے دن نیلوفر دوپہر کے وقت پھر اپنے کتب خانہ کے اُسی دریچہ میں بیٹھی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی اور سامنے میدان میں کل کی طرح برابر بھرتی جاری تھی مگر آج نیلوفر کو اس طرف کوئی خاص دھیان نہیں تھا۔ اچانک آہستہ قدموں کی چاپ سنائی دی اور ساتھ ہی اسکے کانوں میں ایک غیر مانوس سی آواز آئی۔ "نیلوفر!" نیلوفر نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ اس سے چند قدموں کے فاصلہ پر الماری کے پاس ظفر کھڑا تھا۔ کچھ بے چین بے چین سا۔ اُداس اُداس سا۔ نیلوفر حیران سی رہ گئی۔ یہ دلکش اور جذبات سے لبریز آواز ظفر ہی کی تھی۔ نیلوفر کو رہ رہ کر تعجب ہو رہا تھا۔ "نیلوفر!" ظفر نے پھر کہا۔

"جی" نیلوفر نے جواب دیا۔ "آپ آج اتنی جلدی ———"

"میرا مختصر سا سامان جلدی تیار کر دو نیلوفر!" ظفر نے نیلوفر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے ابھی چار بجے روانہ ہونا ہے۔ آج صبح یوں ہی اتفاقاً ریکروٹنگ آفیسر سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے جنگ کیلئے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ اُسے یقین ہو کہ مجھے شروع ہی میں کیپٹن لے لیا جائیگا۔ اس کا ابھی کوچ ہے۔ وہ کہتا ہے ابھی میرے ساتھ چلکر بڑے صاحب سے مل لو۔ پھر خواہ کچھ دن کیلئے لوٹ آنا۔ بس زیادہ سامان کی ضرورت نہیں۔ ایک سوٹ کیس اور ایک بستر کافی ہے" ظفر ایک ہی سانس میں سب باتیں کہہ گیا۔ نیلوفر کی حیرت کی کوئی انتہا ہی نہیں رہی تھی۔ وہ پتھر کی مورتی کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ جیسے کوئی ڈراونا خواب دیکھکر سہم گئی ہو۔ یا جیسے کسی نے مسمریزم کر دیا ہو۔ "فوج" ۔ "بھرتی" ۔ "کیپٹن" یہ الفاظ بہت ہی بے دردی سے اس کے دماغ میں نشتر سے چبھو رہے تھے۔ حالات اتنی جلدی تبدیل ہو سکتے ہیں اسکا اُسے کبھی وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ آخر ظفر نے دل میں کیا سوچا تھا کہیں یہ سب مذاق تو نہیں۔ ظفر اور فوج میں ملازمت۔ یہ اُس کیلئے بہت ہی اَن ہونی

سی بات تھی۔ وہ کبھی بھی اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہو سکتی تھی۔ پنشن سے دگنی تنخواہ اور اپنی ایسی معزز ملازمت چھوڑ کر۔ اپنا گھر بار۔ آرام و آسائش تج کے آخر کس بات نے ظفر کو فوج میں نام لکھوانے پر مجبور کیا۔ ملک کی خدمت کا یہ انوکھا جذبہ کب اس کے دل میں پیدا ہو گیا۔ یہ سب نیلوفر کے ادراک سے بالاتر تھا۔

ظفر ٹکٹکی لگائے نیلوفر کے چہرہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اور اس تھوڑے سے وقفہ میں وہ نیلوفر کے چہرہ کے اُتار چڑھاؤ دیکھکر اسکے دلی صدمہ اور اضطراب کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اور اُس سے اُسے گویا ایک گونہ مسرت سی ہو رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ نیلوفر جیسے ہوش میں آ گئی۔ اسکی آنکھوں کی ساکت پتلیوں میں زندگی کی حرکت پیدا ہو گئی۔

"آپ بھرتی کیوں ہو گئے ہیں؟" اُس نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا اور اسکے آگے وہ کوشش کے باوجود ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ جیسے حلق میں پھندا پڑ گیا ہو۔

"یوں ہی سوچا کچھ ملک کی خدمت ہی ہو جائے۔ مفلوج دماغ اور تھکے ہوئے قویٰ میں بھی کبھی کچھ کر کے دکھانے کا جوش آ ہی جاتا ہے" ظفر یہ کہتے ہوئے پھر سے نیلوفر کے چہرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نیلوفر کو جیسے اچانک طویل غشی کے بعد ہوش آ گیا تھا۔ اسکی آنکھوں کے سامنے اب تک جو بلند و بالا دیوار کھڑی تھی وہ دم زدن میں ہٹ گئی اب سب کچھ اسکی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ سب کچھ جان چکی تھی۔ ظفر اُسکی باتوں سے اتنا اثر لیگا۔ اس قدر رنجیدہ ہو جائیگا اسکے فرشتوں کو بھی اس کا خیال نہیں تھا۔ اُس کا جی چاہا چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ دھڑام سے زمین پر گر پڑے۔

"آخر یہ کیا دیوانگی سوجھی ہے؟" اُس نے بڑی مشکل اور کوشش سے کہا۔ اسکی آواز شدت صدمہ سے بیٹھ گئی تھی۔ "آپ مذاق تو نہیں کر رہے؟ خدا کیلئے نام کٹوا لیجئے۔ جو خرچ ہو دریغ نہ کیجئے۔ میں خود ریکروٹنگ آفیسر کے پاس جاتی ہوں۔ میں ہرگز ہرگز آپ کو نہیں جانے دونگی" اور اس صدمہ و جوش سے وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ اُس نے اپنا سر کھڑکی کی چوکھٹ سے لگا دیا۔ ظفر گھبرا سا گیا۔

"پاگل نہ بنو" وہ بولا۔ "ہوش میں آؤ۔ میں تو خود پچھتا رہا ہوں۔ یونہی صبح اسکی باتوں میں آ کر غلطی کر بیٹھا۔ کل بڑے صاحب سے ملکر پوری کوشش کرونگا کہ میرا نام کٹ جائے۔ یہیں کوئی خدمت اپنے ذمے لے لونگا۔ یہ لوگ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ لو اچھا دیر ہو رہی ہے سامان کیلئے تو میں آتا ہوا نوکر کو کہہ آیا تھا۔ اس نے تیار کر دیا ہوگا۔"

[illegible] دوسرے کوئی جواب نہیں دیا صرف ایک بار نظر اٹھا کر [illegible] ہوں سے [illegible] صرف دیکھا گویا زبان حال سے کہہ رہی ہو "آج تک جو ستم میں نے تم پر توڑے ہیں [illegible] توڑے گئے وہ گویا کہتے کہ تم نے مجھے اپنے گھر کے اس آخری [illegible] بنا لیا" ظفر کی نظریں اسکی نگاہوں سے ملیں اور آج پہلی مرتبہ اسے ان آنکھوں کے عمیق میں دبے بیٹھے جذبات موجزن نظر آئے پہلی بار اس نے ان نیلگوں آنکھوں میں ایک دنیا آباد دیکھی اور آج پہلی مرتبہ اسے یہ آنکھیں مقناطیس کے دو ٹکڑے نظر آنے لگیں بے اختیار اس کا جی چاہا وہ نیلوفر کے قدموں میں جھک کر اسکی آنکھوں کو غور سے دیکھے ان کے عقب میں جو شہزادے چھپے بیٹھے ہیں۔ ان کے افسوں میں خود کو گم کر دے۔ اور ——— اور ایک بار طویل لمحے کیلئے ان آنکھوں پر اپنے سرد ہونٹ رکھ دے۔ مگر یہ سب کچھ اب بعد از وقت تھا۔ اب ان باتوں کا وقت بیت چکا تھا۔ وہ جانتا تھا اسکی یہ کیفیت فوری غم و غصے کے سبب سے ہے۔ اچانک ایک قطعاتی صدمے سے اس کا عمر بھر کا سویا ہوا ضمیر بیدار ہو گیا تھا اور اسے اندیشہ نہیں یقین تھا کہ اگر ذرا بھی ڈھیل کی تو اسکی روح پر پھر وہی اس کا فطرتی جمود طاری ہو جائیگا۔ اس کا ضمیر پھر گہری نیند سو جائیگا۔ اسکے اخلاق پھر پستیوں میں جا گرینگے اور اسکے لئے اب وہ ہرگز ہرگز تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ نیلوفر کا جس قدر گنہگار بن چکا تھا اب وہ اس سے زیادہ بار اٹھانے کو تیار نہیں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر کچھ دیر اور اسی طرح کھڑا رہا تو نیلوفر کی مقناطیسی آنکھوں سے نکلتی ہوئی دلفریب شعاعیں جن کو اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے اسکے سارے منصوبے توڑ دینے پر مجبور کر دیں گی۔ اور نیلوفر کی آنکھوں میں آج پہلی مرتبہ اس نے جو نئی کیفیت نیا آباد دیکھی تھی اس میں زندگی بسر کرنے کی خواہش کو وہ روک نہیں سکے گا۔ جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ ہی نہیں ہوا تھا۔ مگر اب یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ رات کی گفتگو وہ بھول تو نہیں گیا تھا۔ اس کے متعلق نیلوفر کے دل میں جو حقارت آمیز تنفر تھا۔ اس کا ازالہ کرتا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔

" اچھا خدا حافظ نیلوفر! " اس نے اپنی ساری قوت صرف کر کے کہا اور اپنے بے حس اور سفلی جذبات کے مرکز دل میں پہلی مرتبہ نیلوفر کی آنکھوں کو ایک بار ۔۔ ۔۔۔ پیار کر لینے کی زبردست آرزو دل میں لئے ہوئے وہ بجلی کی سی تیزی سے کمرہ سے باہر نکل گیا۔

[illegible] نیم غشی کی حالت میں جانے کب تک وہیں خاموش و ساکت بیٹھی [illegible] اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جس طرح آج کوئی اسکا کل اثاثہ لوٹ کر لے گیا ہو [illegible] دنیا میں تنہا اور مفلس و قلاش رہ گئی ہے۔ جیسے وہ ناگہاں ایک لکھ سے

[illegible] جلاد بن گئی ہے

[illegible] وزن سے [illegible] اور [illegible] سے سال بیت گئے۔ مگر ظفر واپس نہیں آیا۔ جب تک وہ اسکی پاس کی چھاؤنیوں میں ٹریننگ لیتا رہا اس کے خطوط آتے رہے جن میں لکھا ہوتا تھا "میں یہاں کے کام سے بہت خوش ہوں۔ تم ذرا نہ گھبرانا۔ یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے" وغیرہ وغیرہ۔ مگر واپس آنے کا کہیں آثار تک نہ ہوتا تھا۔ اس کا آخری خط محاذ سے آیا تھا اور اسکے بعد اسکی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ اسکی رجمنٹ ہی کا پتہ نہیں تھا۔ نیلوفر نے ظفر کی خیریت معلوم کرنے کیلئے کیا کیا جتن نہیں کئے۔ حکام بالا سے ملی۔ جگہ جگہ تار بھیا دیں۔ دوسرے ملکوں کی غیر جانبدار سوسائٹیوں کو لکھا مگر ظفر کا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ حکام اسے طرح طرح کی تسلی و اطمینان دلاتے رہتے اور ہر بار ان کا یہی جواب ہوتا "آپ اطمینان رکھیں ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ عنقریب کیپٹن ظفر کا پتہ لگ جائیگا۔ وہ یقیناً زندہ و سلامت موجود ہیں" لیکن سمجھنے والے سمجھ رہے تھے قسمت اپنا خونیں کھیل کھیل چکی ہے۔ خود نیلوفر کو بھی معلوم ہو رہا تھا کہ قدرت اس سے کوئی زبردست انتقام لینے کا تہیہ کر چکی ہے لیکن ظفر کو مردہ سمجھ لینا اسکے لئے ناممکن سا تھا۔ اسکی زندگی کا ایک ایک لمحہ ظفر کے خیال میں بسر ہو رہا تھا۔ اسکا ہر تنفس ظفر کی یاد سے معمور تھا۔ انسانی فطرت بھی ایک عجیب معمہ ہے۔ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوتا کس طرح نفس انسانی کے عوامل میں یکلخت تبدیلی ہو جاتی ہے۔ ماہرین نفسیات ثابت کرتے ہیں کہ کس طرح بعض اوقات انسان اپنی محبوب ترین ہستی یا چیز سے محض ایک خفیف سے سبب کی بنا پر انتہائی متنفر ہو جاتا ہے۔ اور کس طرح ایک مردود و حقیر شے کو کسی غیر معمولی واقعہ سے دیوتاؤں کی طرح پوجنے لگتا ہے۔ یہی حالت نیلوفر کی تھی۔ ظفر کی اچانک تبدیلی اور ایثار نے نیلوفر کی نگاہوں میں اسے دیوتا کا درجہ دے دیا تھا۔ اسکی ساری نفرت۔ ساری حقارت عقیدت و احترام میں تبدیل ہو گئی تھی۔

کون جانتا تھا وہ اچانک ایسے خود دار ایسے حساس ہو جائیں گے۔ کسے پتہ تھا ان کے بے احساس دل میں اچانک ایسے مستقل عزم کا ظہور ہو جائیگا۔ میری اس روز کی باتوں نے انہیں جانے پر آمادہ کیا۔ صرف مجھے اپنی محبت کے ثبوت دینے کیلئے انہوں نے گھر بار تج دیا۔ یہ احساس اسے ملنے [illegible] تھا۔ وہ دنیا اور دنیا کی دلچسپیوں سے یکسر کنارہ کش ہو گئی تھی۔ اس کیلئے دنیا کی کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اب [illegible]

وہ ایک بھی افسانہ نہیں لکھ سکی تھی۔ ایک بھی مضمون سپرد قلم نہیں کر سکی تھی۔ کسے کسی بات کا خیال ہی کب تھا۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا شوق۔ نہ سیر و تفریح سے دلبستگی نہ کسی اور شغل میں دلچسپی۔ گھنٹوں اپنے کتب خانے کی اسی کھڑکی میں بیٹھی ہوئی یوں ہی خلا میں کچھ دیکھتی رہتی جیسے کوئی بھولا ہوا گیت یاد کر رہی ہو۔ اس کے عزیز رشتے دار۔ ظفر کے دوست احباب سمجھا سمجھا کر عاجز آ چکے تھے۔ بہتوں نے تو اب اس کے پاس آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ دنیا قہقہوں کی ساتھی ہوتی ہے آنسوؤں کی نہیں۔ پھر بھی بہتیرے ایسے تھے جو نیلوفر کی پر عظمت شخصیت اور اسکے بلند تخئیل سے اچھی طرح واقف تھے۔ جن کیلئے اسکی ہستی اس پژمردگی اور سوگواری میں بھی ویسی ہی دلکش ویسی ہی ارفع تھی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ جن کے لئے اب بھی اسکی صحبت میں گذری ہوئی چند ساعتیں بہشت میں گذارے ہوئے سینکڑوں برس پر بھی بھاری تھیں۔ لیکن نیلوفر کے سکوت کو توڑنا اس کے دل کے ناسور کو مندمل کرنا۔ کسی کی قدرت میں نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تھا اسکی لطیف روح پر یہ وار ایسا کاری پڑا ہے جس سے صحت یاب ہونا اس کیلئے ناممکنات سے ہے۔ یوں تو جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی اسکی روح کو اندر ہی اندر گھن لگ گیا تھا۔ یہاں ہمیشہ مسرت اور سکون اس کیلئے "خ" ہے یہ وہ لفظ جو شرمندہ معنی نہ ہوا" کے مصداق رہے تھے تاہم اس نے اپنے سینے میں بھڑکنے والی آگ کا دھواں کبھی باہر تک نہیں آنے دیا تھا۔ کبھی کسی پر اس کے دل کا بھید نہیں کھلا۔ وہ بظاہر ہمیشہ مسرور و متبسم رہی۔ لوگ اسکی غیر معمولی قابلیت۔ خوش مزاجی۔ بذلہ سنجی اور ظرافت آمیز مہذب گفتگو کے انتہائی دلدادہ تھے۔ شدید جدو جہد سے تھکے ہوئے دل و دماغ اسکی باتوں سے محظوظ ہو کر کچھ دیر کیلئے اپنی ساری کلفت بھول جایا کرتے تھے لیکن اب تو وہ یہ بظاہر واری کا سوانگ قائم نہیں رکھ سکی تھی۔ انسان ہی بوجھ اٹھایا جا سکے ہے۔ جو ناقابل برداشت نہ ہو۔ آخر کہاں تک طاقت و ضبط ساتھ دے۔

(باقی آئندہ)

بھولا ہوا نغمہ

از حجاب بنارسی۔ صدر ناگپور

آکاش کی ٹھنڈی چھاؤں میں!
برسات کی بھیگی راتوں ـــــ میں!
تاروں کی نازک فضاؤں میں!
ہم محو تماشا ہوتے تھے!
کچھ اور ہی دنیا ہوتی تھی!

جب کالی گھٹائیں چھاتی تھیں!
جب ٹھنڈی ہوائیں چلتی تھیں!
جب کلیاں کھلتی ہوتی تھیں!
ہم محو تماشا ہوتے تھے!
کچھ اور ہی دنیا ہوتی تھی!

سورج کی کرنیں آتی تھیں ـــ!
غنچوں کو چھیڑا کرتی تھیں!
شبنم سے کھیلا کرتی تھیں!
ہم محو تماشا ہوتے تھے!
کچھ اور ہی دنیا ہوتی تھی!

اب صحن چمن کی ہوا بدلی!
برسات کی کالی گھٹا بدلی!
وہ شام کی سرخ قبا بدلی!
دنیا کی ساری فضا بدلی!
تم کیا بدلے دنیا بدلی!

ان چاندنی راتوں کی سوگند!
ان پیاری باتوں کی سوگند!
بھولی ہوئی الفت یاد کرو!
گذری ہوئی صحبت یاد کرو!
ٹوٹی ہوئی دنیا پار کرو!
اجڑی دنیا آباد کرو!

نوجوانانِ وطن

(فوجیوں سے بھری ہوئی ایک گاڑی کو دیکھکر)

از نجمہ تصدق

سجیلے، رنگیلے جواں جا رہے ہیں   دلیر و قوی پہلواں جا رہے ہیں
یہ فولاد تن، قہرماں جا رہے ہیں   وطن کے جری پاسباں جا رہے ہیں
وطن کے جیالے جواں جا رہے ہیں

لب و چشم پر کھیلتی ہیں ضیائیں   حوادث کی آغوش میں مسکرائیں
یہ ہاری ہوئی بازیاں جیت جائیں   یہ مانندِ سیلِ رواں جا رہے ہیں
وطن کے جیالے جواں جا رہے ہیں

لہکتے، لہکتے، خراماں، خراماں   کبھی برقِ سوزاں، کبھی ابر باراں
بیاباں بیاباں، گلستاں گلستاں   کہیں کارواں کارواں جا رہے ہیں
وطن کے جیالے جواں جا رہے ہیں

وطن کی اُمیدیں جواں اُن کے دم سے   وطن کی زمیں آسماں اُن کے دم سے
وطن کی جبیں کہکشاں اُن کے دم سے   پئے حفظِ ہندوستاں جا رہے ہیں
وطن کے جیالے جواں جا رہے ہیں

جری، سُورما، شیر دل اور جیالے   یہ شہد اور گھی دُودھ، مکھن کے پالے
بڑی شان والے، بڑی آن والے   ہمالہ کے لختِ جواں جا رہے ہیں
وطن کے جیالے جواں جا رہے ہیں

آئیں مرے خیال میں وہ بار بار کیوں ؟ خوابوں میں آکے روز کریں بیقرار کیوں ؟

جب زندگی کا موت سے رشتہ ہے منسلک پھر ہم نشیں ہو خطرۂ لیل و نہار کیوں ؟

وہ حسرتِ بہار نہ وہ دورِ انبساط آتا ہے پھر رلانے کو ابرِ بہار کیوں ؟

آلام و غم کے تند حوادث کے واسطے اتنا لطیف دل دیا پروردگار کیوں ؟

مدت ہوئی وہ نقشۂ دل ہی بدل گیا اب چھیڑتے ہو سازِ محبت کے تار کیوں ؟

ترکِ وفا کے ساتھ ہو ترکِ خیال بھی آتے ہو اب خیال میں بھی بار بار کیوں ؟

وہ دن گذر گئے وہ زمانہ نہیں رہا پھر آنکی یاد اے دلِ امید وار کیوں ؟

جب ربط ضبط حسن و محبت نہیں رہا ہے بارِ دوش ہستیٔ ناپائیدار کیوں ؟

وہ شورشِ نشاط نہ طوفانِ آرزو اب کی چمن میں آئی ہے یادِ بہار کیوں ؟

بابِ کرم میں جب ترے لفظِ ستم نہ تھا بنیادِ زیست ڈال دی پروردگار کیوں ؟

رونا مجھے خزاں کا نہیں کچھ، مگر شمیم
اِس کا گلا ہے آئی چمن میں بہار کیوں ؟

میری یہ نظم غالباً ۱۹۴۰ء میں دلی ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہو چکی ہے۔ (شمیم ملیح آبادی)

دیوؤں کے ملک میں

از جناب اشرف صبوحی دہلوی

(گزشتہ سے پیوستہ)

تیسری قسط

اسی اثنا میں اس نے اپنے قریب ایک قسم کا شور سا سنا۔ دیکھا کہ بڑے بڑے چوہے ہیں۔ کوئی پائے پر چڑھ رہا ہے۔ تو کوئی پلنگ کی چادر پر آچڑھتا پھرتا ہے۔ چار دل فرصت سے تلوں ادھر ہیں جیسا کرتے دوڑتے ہیں۔ ان میں سے ایک گلیور کے قریب آپہنچا۔ اس نے خوفزدہ ہو کر اپنے بچاؤ کیلئے اپنی تلوار سونت لی۔ اب دو چوہوں نے دو طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔ اور ایک تو اسکی چھاتی پر آچڑھا۔ اپنے اگلے پنجوں سے اسکا گلا دبوچنا چاہا لیکن گلیور نے کوشش کر کے تلوار اسکے پیٹ میں گھسیڑ دی۔ باقی چوہے اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر بھاگ گئے۔ چوہوں کی شرارت مشہور ہے۔ وہ اپنی حرکت سے کب باز آنے والے تھے چند منٹ کے بعد پھر موجود ہوئے۔ گلیور نے بھی خوب تلوار چلائی۔ کئی کو زخمی کر ڈالا۔ اگر وہ پلنگ پر لیٹنے سے پہلے اپنی تلوار کھول ڈالتا اور ہتھیار اسکے ساتھ نہ ہوتا تو بلاشبہ چوہے اسے مار ڈالتے۔ اور وہ چوہوں کا شکار ہو جاتا۔ اس لئے کہ دیوؤں کی سرزمین کے چوہے بھی ہمارے ہاں کے چوہوں کے مقابلہ میں دیو تھے۔ وہ قد و قامت میں بھیڑیے اور کتے کے برابر تھے۔ بلکہ خطرناک اور شریر ہونے میں اُن سے بھی بڑھ کر۔

اتنے میں زمیندار کی بیوی کمرے میں آئی۔ گلیور کے کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھ کر چونک پڑی۔ ڈر گئی کہ یہ کیا ہوا۔ دوڑ کر اسے ہاتھ میں اٹھا لیا۔ اور پوچھنے لگی یہ خون کیسا ہے؟ کہیں چوٹ لگا لی یا کسی نے کاٹ کھایا؟ گلیور اسکا مطلب سمجھ گیا۔ مرے ہوئے چوہے کی طرف اشارہ کر کے مسکرایا۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ ان سے لڑائی ہوئی تھی۔ میں نے ایک کو مار ڈالا دوسرے زخمی ہو کر بھاگ گئے۔ یہ خون دشمنوں کا ہے مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی۔

چوہوں سے جنگ کی داستان سنانے کے بعد گلیور نے سوچا کہ اگر تھوڑی دیر کھلی ہوا میں چلنے پھرنے کی اجازت مل جائے تو طبیعت کا انتشار جاتا رہے۔ لیکن اجازت لے کس طرح یہاں کی بولی نہیں جانتا وہ اسکی بولی سے ناواقف۔ اشارے آخر کہاں تک مافی الضمیر کے ادا کرنے میں کام آسکتے ہیں۔ پھر اشاروں کے سمجھنے سمجھانے کا ملکہ بھی ہر ایک کو نہیں ہوتا تاہم اپنا مقصود مد نظر رکھکر گلیور نے زمیندار کی بیوی کو اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کی۔ بڑی

[illegible]

زمیندار اور اسکی بیوی جن کے پاس گلیور رہتا تھا دونوں بہت نیک دل آدمی تھے۔ انکی ایک چھوٹی لڑکی تھی۔ زیادہ سے زیادہ نو برس کی ہوگی لیکن اسکی باتیں بڑوں کی سی تھیں۔ بڑی تیز طرار اور سلیقہ شعار۔ سینے پرونے اور کاڑھنے میں نہایت ہوشیار۔ گڑیاں کھیلنے کا اسے بہت شوق تھا۔ رات دن انہی کے دھندوں میں لگی رہتی۔ گڑیوں کے سارے کپڑے خود کاٹتی اور خود سیتی۔

ماں کے کہنے سے لڑکی نے اپنی گڑیا کے بچے کا پنگوڑا خالی کر دیا تھا گلیور کا بستر اس میں جما دیا گیا۔ رات کو یہ اس پنگوڑے میں سویا کرتا۔ پنگوڑے کی کھٹولی چوہوں کے ڈر سے ایک الماری کے خانہ میں رکھ دی جاتی۔ جب تک یہ وہاں رہا۔ اسی طرح راتیں بسر ہوئیں۔

خدا کی قدرت کہ زمیندار کی چھوٹی لڑکی گلیور پر بڑی مہربان ہو گئی۔ اپنی گڑیوں سے زیادہ اسکو چاہنے لگی۔ وہ گونگی بیجان تھیں۔ یہ بولتا ہوا جاندار گڈا۔ جب کبھی وہ اسے اپنے ساتھ کہیں لے جاتی تو رسی میں باندھ کر لٹکا لیتی۔ لڑکی کا یہ طور اسے پسند نہیں تھا۔ دل میں برا معلوم ہوتا لیکن مجبوری تھی جس طرح ہوتا برداشت کرتا۔ کیونکہ اول اسکو کچھ کہنے کا حق نہ تھا دوسرے وہ اتنی لمبی تھی کہ اس طریق کے سوا حضرت اسکے ساتھ چلتے تو آخر کس طرح؟

لڑکی نے اپنے اس جاندار گڈے کیلئے اپنے ہاتھ سے سات قمیصیں سی کر دیں۔ کہیں کپڑا باریک سے باریک ڈھونڈ کر لائی لیکن یہ ان کے ہاں کا باریک سے باریک کپڑا بھی ٹاٹ سے موٹا ہی تھا۔ گلیور کے میلے کپڑے بھی وہ خود دھویا کرتی۔ اس کی دلچسپی اسی میں تھی۔ اس سگھڑ چھوٹی لڑکی نے گلیور کو اپنی بولی بھی سکھانی شروع کی۔ اس طرح کہ جب وہ کسی چیز کی طرف اشارہ کرتا تو لڑکی اس کا نام بتاتی اور کئی کئی دفعہ اس لفظ کو دہراتی۔ چنانچہ وہ تھوڑے ہی دن میں اس کو اتنا آگیا کہ جس چیز کی ضرورت ہوتی اسکا نام لیکر مانگتا۔ اشاروں کی مصیبت سے نجات ملگئی۔

یاد رہے دیوؤں میں اگرچہ یہ چھوٹی سی لڑکی بالکل بچہ تھی تاہم اس کا قد بھی گلیور سے ساڑھے چھ گنا بڑا تھا۔ وہ اسے چھوٹا کہا کرتی یعنی گڑیا کا بچہ۔ اور گلیور اس کو ماما بیرجی کہہ کر پکارا کرتا۔ دونوں خوش تھے۔ واقعی اگر یہ چھوٹی لڑکی نہ ہوتی یا اسے گلیور کے ساتھ اتنی محبت نہ ہو جاتی تو اس ملک میں ایک دن بھی نہ رہ سکتا۔ یا خود مر جاتا یا دوسرے مار ڈالتے۔

(باقی آئندہ)

نئی کتابیں

از فصیح الدین احمد

(۱) میراجی کے گیت

شائع کردہ مکتبہ اُردو لاہور۔ قیمت ۱۲؍

میراجی نے ادبی دنیا کی ایک عرصے تک ادارت کی ہے۔ ان کے گیت اور نظمیں بیشتر ادبی دنیا میں اور عموماً اکثر رسالوں میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوتی رہتی ہیں۔ میراجی کے گیت کس پایہ کے ہوتے ہیں۔ اس میں شاید کسی کو کلام نہ ہوگا۔ ان کے گیتوں کی زبان بہت سادہ ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں یہ گیت بھی واقعی احساسات کی پیداوار ہیں۔

نظموں اور غزلوں کے بے شمار مجموعے ہر سال ملک میں شائع ہوتے ہیں۔ لیکن گیتوں کی طرف شعراء نے کم توجہ کی ہے۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ گیت ہی کے ذریعہ ہر شخص اپنے احساسات کی صحیح ترجمانی کر سکتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ اپنا دکھ درد۔ اپنی بپتا۔ اپنی خوشی۔ اپنی کہانی موثر انداز میں دوسرے کے کانوں تک نہیں بلکہ دل تک پہنچا سکتا ہے۔

میراجی کے اس مجموعہ کو اُمید ہے کہ ملک میں خوش آمدید کہا جائے گا۔

(۲) گفت و شنید

از بشیر ہاشمی۔ شائع کردہ اُردو اکیڈیمی۔ لاہور۔ قیمت دو روپے

بشیر احمد صاحب ہاشمی ایم۔ اے، ایم۔ ایڈ (لیڈز) ڈائرکٹر آف ایجوکیشن۔ کوئٹہ

اس کتاب میں ہاشمی صاحب کی بیشتر وہ تقاریر ہیں جو انہوں نے ریڈیو سے نشر کی ہیں۔ اور چند مضامین ایسے ہیں جو شاید کتاب کی تکمیل کے لئے یا شاید دل کی یاد میں تحریر کئے گئے ہوں گے۔

ہاشمی صاحب کو میں نے پہلے مرے سکول اور مرے مشن کالج میں بھی دیکھا ہے یہ مجھ سے کئی سال سینیئر تھے۔ مگر مجھے ان کی وہ وضع قطع۔ بول چال اب تک یاد ہے۔ یہ ایک کافی زندہ دل آدمی تھے۔ ہنسنا اور ہنسانا ان کو خوب آتا تھا۔ کالج کی ٹیموں کے ممتاز رکن اور سوسائیٹیوں کے گرم جوش کارکن تھے۔ علاوہ ازیں خاصے فیشن ایبل انسان تھے۔

دوسری مرتبہ میں ان سے ۱۹۳۳ء میں ملا تھا جبکہ یہ ہی گارڈن کالج میں پڑھا رہے تھے۔ ان کا جبلی مسخرہ پن اب بھی موجود تھا۔ مگر اب اُس نے مزاح کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔

تیسری دفعہ ۱۹۴۱ء میں مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا مسٹر ادم ہسٹرنگ ڈائرکٹر تعلیمات صوبہ پنجاب سے "ادیب" کے سلسلے میں ملنے گیا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں نے مشن کالج میں تعلیم پائی ہے تو انہوں نے بتایا کہ ان کے دفتر میں بھی سٹیفنین موجود ہیں۔ پھر انہوں نے مجھے بشیر صاحب کا نام بتایا۔ بشیر صاحب کا کمرہ بھی قریب ہی تھا۔ میں ان سے بھی ملنے گیا۔ بشیر صاحب کا لب و لہجہ تو وہی تھا۔ شاید کالج کے زمانہ کے مقابلے میں متمدن بھی زیادہ ہوں۔ مگر ہاں ایک نمایاں فرق جو مجھے محسوس ہوا یہ تھا کہ ان کی زندہ دلی سرد پڑ چکی تھی۔ میں تقریباً کوئی پون گھنٹے اُن سے باتیں کرتا رہا۔ مگر اتنی دیر میں ایک دفعہ بھی ہنستے نہیں دیکھا۔

بشیر صاحب کی "گفت و شنید" جسے شاید صرف "گفتگو" کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ لاہور کے موسم گرما کی طرح خشک معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے بشیر صاحب کو ریڈیائی تقریر لکھتے وقت تعلیماتی انسپکٹری کا خیال ستا رہا ہو۔ اور یہ اور یہ فکر دامن گیر ہو کہ اگر ان تقاریر کو اپنی قدیمی وضع میں لکھا تو شاگردوں اور اُستادوں پر کیسے رعب باقی رہ سکے گا۔ یا شاید سنجیدگی اور تمکنت نے اب مزاج پر غلبہ پا لیا ہو۔ بہرحال اس سوال کا جواب ہاشمی صاحب ہی دے سکتے ہیں۔

اس مجموعہ میں بارہ مضامین ہیں۔ آپ کسی مضمون کو پڑھئے اتنی دلچسپی ضرور ہے کہ مضمون ختم بغیر آپ اُسے نہیں چھوڑیں گے۔ اگر ہاشمی صاحب کی زندہ دلی عود کر آتی تو یہ مضامین دلچسپ ہی نہیں دلکش بن جاتے۔

بھلا یہ کیونکر باور کر لیا جائے کہ جس شخص کے رگ و پے میں جمنا کا پانی سرایت کر چکا ہو اُسے راوی کا پانی راس آسکتا ہے؟

"فرنگی اردو" والے مضمون کے ختم پر جو شعر انہوں نے نقل کیا ہے اُسے ہم ہاشمی صاحب کی اجازت سے یوں لکھنا چاہتے ہیں۔

(۴) رنگ و نکہت

از جناب جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی۔ شائع کردہ اردو اکیڈمی [illegible]۔ قیمت [illegible]

جناب اثر لکھنوی اساتذہ شعرا میں سے ہیں۔ جن کی شاعری ملک کے ہر گوشے سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ جن لوگوں نے "اثرستان" اور "بہاراں" کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ ان کی غزل گوئی کے انداز سے واقف ہیں۔ ان کی غزلوں میں یکسر ایک شگفتگی اور ایک خاص قسم کا نکھار ہے۔ لیکن لوگ ان کو ایک غزل گو ہی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ انہیں نظم پر بھی کافی قدرت حاصل ہے۔ "رنگ و نکہت" بعض جرمن [illegible] انگریزی۔ فرانسیسی۔ یونانی۔ عربی اور ہندی نظموں کے منظوم ترجمہ پر مشتمل ہے۔ کسی دوسری زبان کی نظم ہی کا کامیاب ترجمہ کرنا بڑا مشکل کام ہے جو ایک قادر الکلام ہی کر سکتا ہے۔

جناب اثر نے نظموں کی مناسبت سے ترجمہ میں جدت سے کام لیا ہے۔ ترجمہ نظم معرا میں ہے۔ قوافی کی پابندی سے آزاد ہو کر بھی اثر سے خالی نہیں ہیں۔ کتاب کے آغاز میں محمد دین تاثیر صاحب کا مقدمہ ہے۔ جس میں انہوں نے اثر صاحب کی قادر الکلامی پر روشنی ڈالی ہے۔ "رنگ و نکہت" اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

(۶) سچی کہانیاں

شائع کردہ کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی۔ قیمت [illegible]

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے ایک زمانہ میں "پریم پجاری" کا بھیس بدل کر ماہنامہ "ساقی" میں سچی کہانیوں کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ کہانیاں بہت سے نوجوان اور نازک، گرم اور نرم دلوں کو دھڑکا چکی ہیں۔ مصنف کا دعویٰ ہے۔ (اور بظاہر اس دعویٰ کی صحت میں شبہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں) کہ ان کہانیوں میں واقعات کو من و عن بیان کر دیا گیا ہے۔ جو ان کا ذاتی تجربہ یا مشاہدہ ہیں۔ مغربی زبانوں میں تو بعض ایسے مخصوص رسالے بھی ہیں جو اس قسم کے افسانوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کسی واقعہ کو خصوصاً جس میں رومان کا پہلو ہو۔ بیان کرنے میں خاصی اخلاقی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔

پڑھا جائے گا۔

(۵) اشرم

از ایم۔ اسلم صاحب۔ شائع کردہ [illegible]

ایم اسلم صاحب ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ [illegible] بیدریغ لکھا ہے۔ تعداد میں ان کی تصانیف اس وقت [illegible] سے زیادہ ہیں۔ افسانہ اور ناول ان کا خاص میدان ہے۔ زیر نظر کتاب "اشرم" ان کا ایک تازہ ناول ہے۔ اس کتاب کا انتساب مصنف نے اپنی مرحومہ بیوی کے نام کیا ہے۔ جو ان کی اس مخلصانہ محبت کو ظاہر کرتا ہے جو انہیں مرحومہ سے تھی۔

کتاب پڑھتے وقت یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بیوی کے انتقال کا اسلم صاحب کی تحریر پر بہت اثر پڑا ہے۔ اب ان کی تحریر میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور سوز و گداز کی جھلک ملتی ہے یہ بات اس قدر نمایاں صورت میں ان کے ہاں پہلے نہیں ملتی تھی۔ یہ ناول مجموعی حیثیت سے ایک اصلاحی رنگ کا حامل ہے۔ پلاٹ کا ارتقا ایک عورت کی زندگی اور اس کے گرد سے وابستہ ہے۔ اس ناول میں عورت کا تصور قطعی طور پر مشرقی اور روایتی ہے۔ وہ مرد کے لئے صرف ایک خوشنما کھلونا نہیں ہے۔ وہ صحیح معنوں میں مرد کی شریک حیات ہے جو ہمیشہ اس کے دکھ درد میں ساتھ دیتی ہے۔ وہ ایثار قربانی اور صبر و استقلال کا مجسمہ ہے [illegible] کا ہر وقت احساس رہتا ہے۔ بڑے سے بڑے آزمائش کے موقعہ پر بھی وہ ثابت قدم رہتی ہے۔ اسے اپنی راہوں میں کانٹے بھی ملتے ہیں مگر وہ ان کانٹوں سے صاف دامن بچا لیتی ہے۔ بہت سی جھوٹی مسرتیں اسکو دعوت دیتی ہیں۔ مگر وہ انہیں ٹھکرا دیتی ہے۔ یہی نہیں کہ وہ خود نیکی شرافت اور پاکبازی کا مجسمہ ہے۔ وہ مرد کی غلط روی سے بھی مایوس نہیں ہوتی ہے۔ وہ ہر موقعہ پر ایثار و محبت اپنی ہمدردی اور غمگساری کا ثبوت دیکر مرد کے دل پر بھی ایک گہرا اخلاقی اثر ڈالتی ہے۔ وہ مرد کو ذلت اور رسوائی کے تاریک غار میں گرنے سے بچا لیتی ہے۔ اور صحیح راستہ پر لگا دیتی ہے۔

ٹکنیک کے لحاظ سے ناول میں کوئی خاص جدت نہیں ہے۔ مگر [illegible] حیثیت سے ناول دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی ہے۔

ڈائرکٹر:— محبوب
آسمانِ فلم کے درخشندہ ستارے:
اشوک کمار - وینا - ستارہ - کمار - یعقوب وغیرہ
کراچی

اداکاران
بہادری کے عجیب و غریب کارناموں سے لبریز

The Adeeb Registered No. L. 4795. September 19[illegible]

THE ADEEB

DELHI.

1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month.
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/- only, single copy Rupee one.
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th. please write to the office at once If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

only Title cover Printed at Dayals' Printing Press, Chandni Chowk Delhi.
by Fazl-ud-din Ahmad M. A. and M. I. Wahidi & Published from the office of the Adeeb, Chandni Mahal Delhi.

THE ADEEB DELHI
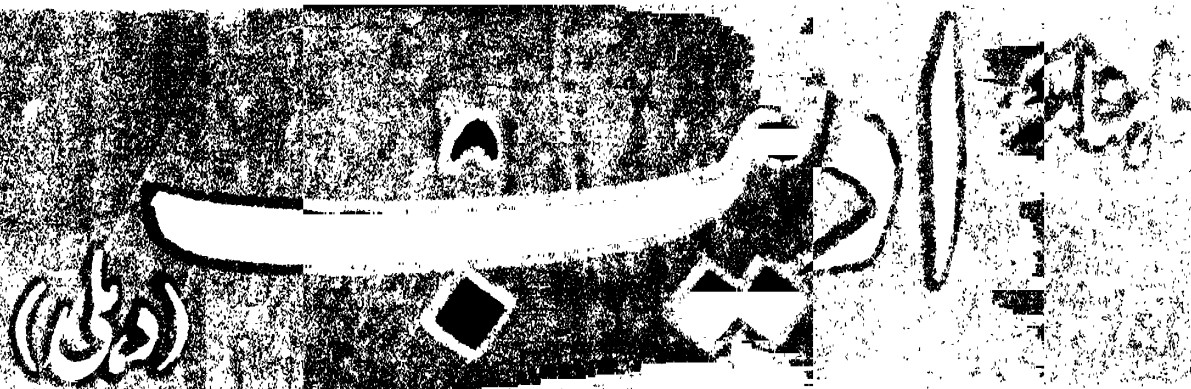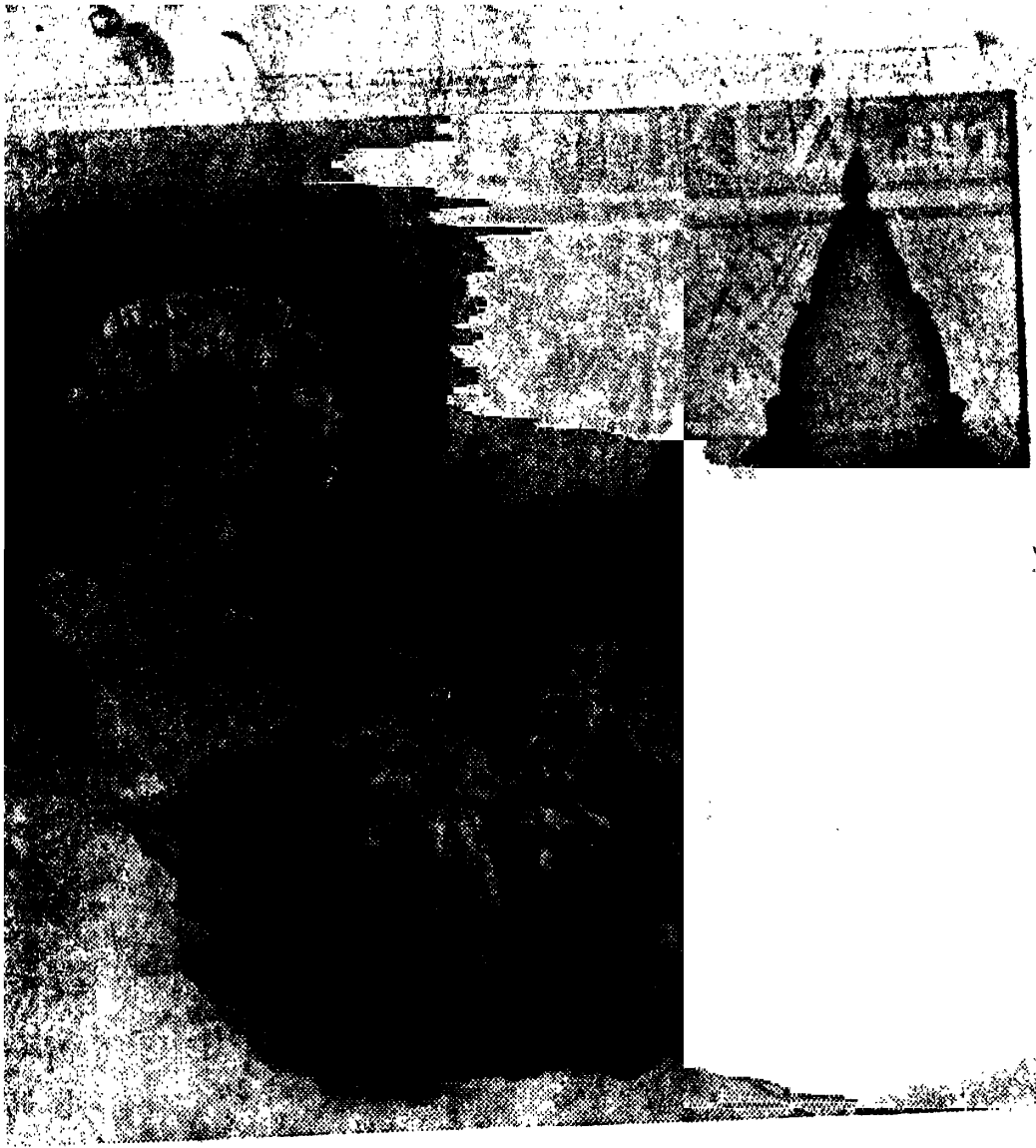
جینت دیسائی کے دھارمک فلم ” بھگت راج “ کا ایک سین

” رام راج “ میں

رجی لورمس دوز فلم ’نئی کہانی‘ میں

راج “ میں آپ نے خاص کام کیا ہے

ادیب

عبدالرحمٰن واحدی — فصیح الدین احمد ایم اے — (آنسہ) نجمہ تصدق ایم اے، بی، ٹی

سلسلہ ۶ — ۱۹۴۳ — ۶

فہرست مضامین

مضامین

افسانے

حصہ نظم

شعبۂ خواتین

بچوں کا صفحہ

متفرقات

[illegible] ایک [illegible] شاعر [illegible] ہے۔
تھے [illegible] ایک [illegible] حکیم [illegible] محبت کا [illegible]
[illegible] ان کی محبت
[illegible] میں شریک ہوتے۔
[illegible] کیا کرتے [illegible] اور
[illegible] چنانچہ اپنی ساری زندگی [illegible] وقف
کر رکھی تھی۔

مولانا حالی کی صحبت میں بیٹھنے سے اتنا اثر پڑتا تھا کہ بد باطن سے بد باطن انسان بھی نیکو سیرت بن جاتا تھا۔ مولانا حالی کی یہ لاجواب صفت تھی کہ انہوں نے اپنے دشمن تک کی کبھی برائی نہیں کی۔ حتیٰ کہ اودھ پنچ لکھنؤ جس نے صرف آپ کی شاعری پر ہی اعتراضات کئے بلکہ آپ کی ذات پر پھبتیوں اور گالیوں کی بوچھاڑ کر رکھی تھی، کے متعلق بھی ایک لفظ نہ نکالا۔ مولانا نے اسی کے بارے میں ایک دفعہ فرمایا تھا:

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

مولانا حالی کو اپنے عزیزوں سے بے حد محبت تھی۔ ان کے مکتوبات میں ایک خط خواجہ غلام السیدین صاحب کی والدہ کے نام ہے۔ جو مولانا حالی کی پوتی تھیں۔ اسکے چند فقرے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ اس میں کتنی بے اختیار شفقت ٹپکی پڑتی ہے۔

"تمہارا خط عین انتظار میں پہنچا۔ اسکو پڑھکر جی بے انتہا خوش ہوا۔ اور تمہاری پھپی کی آنکھوں سے خوشی اور محبت کے جوش میں بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ تم سے اتنی دور رہ کر تمہاری محبت سب کے دلوں میں بہت بڑھا دی ہے۔ تمہاری دادی ہر وقت تمہاری صحت اور سلامتی کی دعا کرتی رہتی ہیں .... کیا اچھی بات ہو کہ تم وہاں سے ایسی موٹی تازی ہو کر آؤ کہ یہاں تمہیں کوئی نہ پہچان سکے۔ اور تم قسمیں کھا کھا کر یقین دلاؤ کہ میں وہی .... ہوں"

مولانا کا کنبہ بہت بڑا تھا۔ اپنی اولاد۔ بھائی بہنوں کی اولاد [illegible] کی اولاد۔ خدا کے فضل سے سب ہی تھے۔ مولانا کے ملازمین سب کے سب [illegible] سے شفقت [illegible] کرتے۔ ان کے [illegible] میں شریک ہوتے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے۔ اپنی قلیل آمدنی سے ان کی امداد کرتے۔ جو لڑکے پڑھ لکھ جاتے اُن کی ملازمت کی فکر کرتے۔ جو ملازم ہوتے اُن کی ترقی کی کوشش کیا کرتے۔

مولانا حالی کے اپنے خاندان کے ساتھ اسی برتاؤ سے ہم ان کی سیرت کا ____ فلسفۂ اخلاق کے اس نظریہ کے مطابق "اگر کسی شخص کی صحیح فطرت معلوم کرنا ہو تو دیکھو اس کا برتاؤ اپنے عزیزوں کے ساتھ کیسا ہے[1]" صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ مذہب کے لحاظ سے مولانا حالی بے تعصب تھے۔ ان کے والدین شیعہ تھے۔ مگر مولانا کی تعلیم و تربیت سنیوں میں ہوئی۔ اس لئے آپ کا سنی مذہب تھا۔ لیکن آپ بلند خیال بے نفس اور محب اہل بیت سنی تھے۔ مذہبی اختلاف کو نہایت بری نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کی اولاد اور خاندان میں شیعہ سنی دونوں طرح کے لوگ تھے۔ مگر انہوں نے کبھی کسی سے یہ نہیں کہا کہ یہ مذہب اختیار کرو۔ اسے ترک کرو۔ ان کی پسری اولاد سنی ہے اور دختری اولاد شیعہ ہے۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو ناک ہند کا یہ نامور فرزند اٹھ گیا۔ ہندوستان میں عالمگیر ماتم کیا گیا۔ پانی پت کا تو ذکر ہی کیا۔ وہاں کا تو زمین و آسمان بھی رو رہا تھا۔

حالی کے ذاتی اوصاف اور باطنی کمالات کا اتنی تفصیل سے تذکرہ خارج از بحث نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کی مجتہدانہ شاعری کی قدر شناسی کے لئے ناگزیر ہے کہ ان نفسی خصوصیات اور محرکات عمل کو پہچانا جائے جنہوں نے حالی کو شاعری کا "مجتہد" بنایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدمت خلق کا شوق اور اخلاص کا جذبہ ان کی زندگی اور عمل کے ہر پہلو پر چھایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر لفظ بجلی بن کر دل پر گرتا ہے۔

سرسید مرحوم کے حلقۂ احباب اور معاصرین میں جو بڑے بڑے مشاہیر اور قابل احترام لوگوں پر مشتمل تھا۔ حالی کی سیرت سب سے برتر اور بلند تھی۔ جسٹس سید محمود کا وہ قول یاد رکھیے جو ان کے صاحبزادے سر سید راس مسعود مرحوم نے بیان کیا ہے: "اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے بندوں سے تو ملا ہے ان میں کون ایسا ہے جس کی پرستش کرنے کیلئے تیرا دل تیار ہو جائے تو میرے پاس جواب حاضر ہے کہ وہ شخص 'الطاف حسین حالی' ہے"

سید محمود جیسے زبردست دل و دماغ کے شخص تھے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔

[1] اخلاق جلالی فارسی

کیسے تھے مگر بعد میں ریاست دب گئی تھی۔ اور انہیں مجبورات کا آفت کی پھر حکومت کے وقت پر اعلیٰ عہدہ اور مسلمان کا دینی اور دنیاوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لئے ایک آئینہ خانہ بنایا گیا ہے۔ تاکہ وہ آسانی سے اپنے خدوخال کو دیکھ سکیں کہ ہم کیا سے کیا ہوگئے۔

مسدس کے محاسن

مسدس میں حالی کی شاعری کے دوسرے دور کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ بیان کی سادگی، اور صفائی۔ زبان کی سلاست اور پاکیزگی تو حالی کا خاص حصہ تھا۔ اس میں تخیل بھی ہر قدم پر مشاہدہ کا پابند ہے اور جہاں عقیدت اسلام کی گذشتہ عظمت اور شان و شوکت دکھانے میں تخیل کو اڑنے کا موقع ہے وہاں بھی دیانت اُسکی باگیں کھینچے ہوئے رہتی ہے۔

اچھی نظم و شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ لطف اور فائدہ اٹھا سکیں۔ مسدس اس معیار پر پورا اترا۔ کیا اس کی دلیل بھی بیان کرنے کی ضرورت ہے؟

نظم کی روانی دیکھئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا اُمڈا چلا آرہا ہے۔ تسلسل کا تار کہیں نہیں ٹوٹتا۔ اور پڑھنے والے کو ایک لمحہ کیلئے بھی کسی جگہ ٹھیرنے کی نوبت نہیں آتی۔ جوش کی وہ فراوانی ہے گویا ایک چشمہ اُبل رہا ہے۔ باوجود ان خوبیوں کے سادگی کا یہ عالم ہے کہ اس پر صد ہا صنائع اور بدائع قربان ہیں۔ اور ہزاروں خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد صداقت پر ہے۔ اور شعر کی انتہائی حُسن و خوبی کا معیار حقیقت یا صداقت ہے۔ ان ہی باتوں نے مسدس میں اعجاز کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

مسدس میں جاہلیت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ ایسا سچا ہے کہ جب سے قلم نے اس کو کھینچا اُس وقت سے آج تک کوئی شاعر اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا۔ اس میں نعت کے جو چند بند ہیں۔ وہ دوسرے کی نعتوں کے دفتر سے بھاری ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اوروں نے اپنی نعتوں میں شاعری کے جادو سے اثر پیدا کرنا چاہا ہے۔ اور حالی نے سچائی اور صداقت کے اعجاز سے بڑے تاریخی واقعات اور قابل فخر کارناموں کو جس طرح چند مصرعوں میں انہوں نے بیان کر دیا۔ وہ آج بھی اپنی نظیر آپ ہے۔

اُردو شاعری میں مسدس کا ٹھکانا کوئی آسان نہیں ہے۔ اس غزل میں اچھے اچھے مشاق شاعر بھی رہ جاتے ہیں۔ اور بھرتی کے مصرعوں سے جھول جتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر حالی کی مسدس میں مصرعے تو کیا ایک لفظ بھی بھرتی کا نظر نہ آئیگا۔ بلکہ ہر مصرعہ دوسرے سے ایسا گتھا ہوا دکھائی دیگا کہ چھیوں مصرعے ایک جان اور ایک ذات ہوکر رہ گئے ہیں۔

باطن کو دیکھئے تو ایسی عبرت انگیز سبق آموز اور ولولہ اور غیرت پیدا کرنے والی نظم ہماری کسی زبان میں موجود نہیں ہے۔ جہاں اس میں اخوت، ہمدردی، خودداری، حب وطن، جفاکشی، بے تعصبی وغیرہ کے سبق دئے ہیں۔ وہاں تیز نشتر بھی ہیں۔ مگر یہ نشتر غمگسار سرجن کے ہیں جو بیدد پیدا نہیں کرتے۔

آخر میں اتنا اور کہوں گا کہ شعر کے متعلق جو یہ کہا گیا ہے کہ اسے حقیقت یا زندگی اور واقعات زندگی سے وابستہ ہونا چاہیئے مسدس اس پر پوری اترتی ہے۔

مسدس کا دوسرا پہلو

مسدس کی وہ کمزوریاں نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں جہاں سر سید مرحوم کے وقتی خیالات کا گہرا اثر نمایاں ہے۔ اور جہاں حکومت وقت کی برکات کے بیان میں ذرا مبالغہ سے کام لیا ہے۔ حالی نے مدتوں کے فتنہ فساد کے بعد پہلے پہل امن و امان کی صورت دیکھی تھی، اس لئے اگر انہیں یہ دھوکا ہوا کہ حکومت برطانیہ سراپا برکت ہے تو کوئی تعجب کی چیز نہیں ہے۔

مسدس پر تفصیلی نظر

مسدس میں عرب کی حالت، رحمت عالم کی بعثت۔ اسلام کا شکوہ۔ فتوحات کی وسعت۔ علوم و فنون کی ترقی۔ علماء و حکماء کے کمالات۔ تعمیر بلاد۔ سیر و سیاحت اور بغداد و اندلس کے قابل فخر آثار، اس خوبی اور پاکیزگی سے بیان کئے گئے ہیں کہ مسلمانوں کے جھکے ہوئے سر غرور سے بلند ہوگئے۔ اور انہیں گذشتہ جاہ و جلال کی کہانی اس تنزل اور پستی کے وقت سرمایہ تسکین محسوس ہونے لگی۔

اس مسدس کے آئینہ میں بغداد کا حریم خلافت۔ اندلس کا بیت الحمراء۔ غرناطہ کی شان۔ بلنسیہ کی شوکت۔ اشبیلیہ کے محراب و در۔ قرطبہ کے کھنڈر، سنجار و کوفہ کے میدان۔ سمرقند۔ مراغہ اور قاسیون کے رصد خانے سبھی دکھائی دیں گے۔

فخر و عظمت کے سرمایہ کے ساتھ ساتھ انہیں مسلمانوں کے ہر طبقہ کے عیوب اور

کیا گیا ہے۔ ہر مصرع سے لفظوں میں احساس کے نشتر سے زخم کے فاسد مادہ کو خارج کر کے اس کی مرہم پٹی بھی کی گئی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ مسدس مسلمانوں کی تیرہ سو برس کی تاریخ کا مرقع ہے۔ جس میں ان کی پیدائش، نشوونما، جوانی، بڑھاپے، بیماری اور اسکے اسباب کا ایسا صحیح خاکہ کھینچا گیا ہے کہ انسانی قلم کے لئے غیر معمولی چیز ہے۔

اب میں اس مضمون کو مسدس سے چند اقتباسات نقل کرنے کے بعد ختم کرتا ہوں۔ ان پر نقد و تبصرہ کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش!

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا — مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا — کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا — جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانے سے پیوند جس کا جدا تھا — نہ کشور ستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایہ
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ — ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ — نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بیباک جیسے

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت — بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت — چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

نہ وہ دور دورہ تھا عبرانیوں کا — نہ وہ بخت و اقبال نصرانیوں کا
پراگندہ دفتر تھا یونانیوں کا — پریشاں تھا شیرازہ ساسانیوں کا
جہاز اہل روما کا تھا ڈگمگایا
چراغ اہل ایراں کا تھا ٹمٹمایا

لئے علم و فن اُن سے نصرانیوں نے — کیا کسب اخلاق روحانیوں نے
ادب اُن سے سیکھا صفاہانیوں نے — کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے
ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

جہاں کو ہے یاد ان کی رفتار اب تک — کہ نقش قدم ہیں نمودار اب تک
قرطبہ میں ہیں انکے آثار اب تک — انہیں رو رہا ہے طلیطلہ اب تک
ہمالہ کو ہیں واقعات اُن کے ازبر
نشاں اُن کے باقی ہیں جبرالٹر پر

کوئی قرطبے کے کھنڈر جا کے دیکھے — مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے — خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے
جلال اُن کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

وہ دین حجازی کا بے باک بیڑا — نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہنچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا — نہ عماں میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا
کئے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

زمانہ کا دن رات ہے یہ اشارا — کہ ہے آشتی میں مری یاں گزارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا — مجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارا

بہت اک چلموں کی سلگانے والے　　بہت گھاس کی گٹھریاں لانے والے
بہت در بدر مانگ کر کھانے والے　　بہت فاقے کر کر کے مر جانے والے
جو پوچھو کہ کس کان کے ہیں وہ جوہر
تو نکلیں گے نسل ملوک ان میں اکثر

کسی سے نفرت و تقریر کرنی　　مگر جس سے شق ہو وہ تحریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی　　مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

اگر مسخ ہو جائے صورت تمہاری　　بھا ئم میں مل جائے سیرت تمہاری
بدل جائے بالکل طبیعت تمہاری　　سراسر بگڑ جائے حالت تمہاری
تو سمجھو کہ ہے حق کی اک شان یہ بھی
ہے اک جلوۂ نور ایمان یہ بھی

طوائف کو ازبر ہیں دیوان ان کے　　گویوں پہ بے حد ہیں احسان ان کے
نکلتے ہیں تکیوں میں ارمان ان کے　　ثنا خواں ہیں ابلیس و شیطان ان کے
کہ عقلوں پہ پردے دیئے ڈال انہوں نے
ہمیں کر دیا فارغ البال انہوں نے

اگر کشش جہت میں کوئی دلربا ہے　　تو دل ان کا نادیدہ اس پر فدا ہے

اگر ماں ہے دکھیا تو ان کی بلا سے　　اپاہج ہے باوا تو ان کی بلا سے

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے　　پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے　　کوئی ان میں سوتا کوئی جاگتا ہے
جو سوتے ہیں وہ مست خواب گراں ہیں
جو بیدار ہیں ان پہ خندہ زناں ہیں
کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو　　کس امید پر تم کھڑے ہنس رہے ہو
برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو　　نہ چھوڑیگا سوتوں کو اور جاگتوں کو
بچو گے نہ تم اور ساتھی تمہارے

اگر نا ؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

بہت قافلے دیر سے جا رہے ہیں　　بہت بوجھ بار اپنے لدوا رہے ہیں
بہت چل چلاؤ میں گھبرا رہے ہیں　　بہت سے نہ چلنے سے پچھتا رہے ہیں
مگر اک تمہیں ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادا کہ غفلت میں کھوئی ہو منزل

امیروں کی تم سن چکے داستاں سب　　چلن ہو چکے عالموں کے بیاں سب
شریفوں کی حالت ہے تم پر عیاں سب　　بگڑنے کو بیٹھے ہیں تیاریاں سب
یہ بوسیدہ گھر اب گرا کہ گرا ہے
ستون مرکز ثقل سے ہٹ چکا ہے

رباعی

از حضرت مولانا ابو الکلام آزاد

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
مے خانے نے رنگ روپ بدلا ایسا
میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

بصیرت
نہاں دل میں ہیں امکانات کیا کیا
ہیں اس دنیا کے رجحانات کیا کیا
رہینِ عشوۂ ثبت ! ابتاؤں
خودی کے تجھ پہ احسانات کیا کیا
بلندی
مری دنیا سراسر جذب و مستی
فغانِ روز و آہِ شب کی بستی
چراغِ مصطفےٰ روشنگرِ دل
ہے رشکِ صد بلندی میری پستی
منتہائے خودی
خودی کی انتہا روحِ حجازی
بظاہر غزنوی باطن ایازی
بتانِ سومناتِ دل کی خاطر
ترا ہر سانس ہو شمشیرِ غازی
دو نظریں
نظر تیری مآلِ علم و دانش
نظر میری کمالِ اشک و سوزش
میں اس دنیا میں سرگرمِ سفر ہوں
جہاں پائے خرد کا نام جنبش
انجام
عروجِ عقل کا ہے یہ زمانہ
مری آہیں ملامت کا نشانہ
مگر جس دم گر گیا آسماں سے
تو اس طائر کا دل ہوگا ٹھکانہ
آہِ سحر
تصوف زندگی راہبانہ
کتابِ زہد اک رنگیں فسانہ
علی الرغم حریفِ نفس پرور
تری آہِ سحر ہو مخلصانہ
ہوس
پرستارِ ہوس ہے قلبِ ناپاک
یہاں بیکار ذکرِ چشمِ نمناک
تہی الفاظ ہیں سوزِ جگر سے
تخیل کو ہے کمالِ سیرِ افلاک

قاضی نذر الاسلام

بنگال کا آتش نوا شاعر

(از جلال الدین احمد صاحب)

شباب اور مفلسی کا اجتماع ایک نئے فلسفے کی تخلیق کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن نذر الاسلام کی زندگی کے ہر ہر لمحے اور اسکے تمام اشعار سے ایک اور ہی اصول کی تشریح ہوتی ہے۔ یعنی اس سے بھی زیادہ زبردست اجتماع شباب اور غلامی کا ہوتا ہے جس میں صرف ایک نئے فلسفے کی ہی تخلیق نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک نئی زندگی اور نئے آئین حیات کی داغ بیل ڈالتا ہے جس میں آزادی کی پرورش ہوتی ہے۔ جہاں ہاتھوں پر عزم و استقلال کے غیرفانی نقوش ہوتے ہیں جہاں نہ زندگی کی پرواہ ہوتی ہے نہ موت کا غم۔ جو خود اپنا انجام ہے — ایسا انجام جو دقیع بھی ہے اور قابل احترام بھی!!

نذر الاسلام ان شاعروں میں سے ہے جو زندگی کو "حال" کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اس نے زندگی کی کٹھنائیوں کو خود برتا ہے اور اسکے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بجائے اسکے ذاتی اور شخصی تصور کا عکس اپنی نظموں میں پیش کیا وہ ایک ایسے دور کی یادگار ہے جس میں ادبی اور سیاسی گھٹن سی تھی۔ ایک طرح کا جمود اور رکاوٹ۔ جیسے طوفان سے پہلے ایک طرح کی خاموشی چھا جاتی ہے۔ پھر طوفان پھوٹ نکلتا ہے۔ گرج۔ کڑک، تیز ہوائیں، بجلی، موسلا دھار بارش، یہ سب کی سب ایکدم سے آموجود ہوتی ہیں۔ نذر الاسلام کے کلام میں یہ سب کچھ ہے۔

وہ صرف اپنے وطن کی آزادی نہیں ساری دنیا کی آزادی کا علمبردار ہے اسکا مقصد ایک غیرفانی ادبی و شاعرانہ شاہکار پیش کرنا نہیں۔ دوسرے شعرا کی طرح وہ بقائے دوام کی خاطر ادب القدما (Classical Literature) کی طرف رجوع نہیں ہوتا۔ وہ خود اس کا اعتراف کرتا ہے:—

"میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں
کوئی کہتا ہے۔ اگلے زمانے میں مجھ کو کون یاد کریگا
لیکن! مجھے اسکی بالکل پرواہ نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کریگا یا نہیں
سنتا ہے کہ جو لوگ خلق خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں

"… سکے لئے میرے خون کا ہر قطرہ — پیام موت ثابت ہو!!"

نذر الاسلام کو اپنی زندگی کا بیشتر حصہ غربت اور گمنامی میں گذارنا پڑا۔ وہ کسان تھا۔ اسلئے کھرا، صاف گو اور حقیقت پسند بھی۔ دنیا اسکے لئے بالکل نئی تھی اسکے زندگی سے زیادہ موت کا تصور سہانا معلوم ہوتا تھا۔ اسی لئے جنگ عظیم چھڑی تو ۱۸، ۱۹ سال کا یہ لڑکا بھی فوج میں بھرتی ہو گیا اور عراق بھیج دیا گیا۔ یہ زمانہ وہ ہے جب وہ بچپن کے دور سے گذر کر اس اقلیم میں قدم رکھنے والا تھا جسکا وہ سرتاج مانا جاتا ہے۔ وہ کسان تھا — سپاہی ہو گیا — اور قدرتی طور پر اس میں صداقت اور جوش کے علاوہ عزم اور جنگجویانہ روح بھی بیدار ہو گئی۔

وہیں عراق کی خندقوں میں بندوق سنبھالے تیار بیٹھا، وہ دشمن کے انتظار میں کچھ دیہاتی گیت گنگناتا رہتا۔ ان گیتوں میں درد تھا۔ ٹھاس اور عجب طرح کا کیف بھی جیسے کہ ایسے گیت عام طور پر ہوتے ہیں۔ مگر نذر الاسلام کی تسلی ان سے نہ ہوتی۔ وہ تو سپاہی تھا — اسے دل بڑھانے والے گانوں سے الفت تھی۔ اور جب ایک تاریک رات میں دریائے "شط العرب" کے کنارے پہرہ دیتے ہوئے اس نے کچھ گانے کی کوشش کی تو اسے معلوم ہوا کہ وہ کوئی نیا گیت الاپ رہا ہے۔ اس میں بھسم کر دینے والے شعلوں کی لپک اور تیزی تھی۔ اس میں ایک سپاہی کی گرم سانسوں کی تپش تھی جسکو گنگناتے سے اسکے اپنے قدموں کی چاپ میں نئی زندگی دکھائی دی۔ یہ نذر الاسلام کی پہلی نظم تھی!

وہ اب بھی ایسی ہی نظمیں کہتا ہے۔ وہ نظمیں جو کتنے ہی نوجوان دلوں کو ہمیشہ حیاتِ نو کا پیغام دیتی رہیں گی!!

بنگال کے اس آتش نوا شاعر نے صرف بنگلہ ادب کی ہی کایا پلٹ نہ کی اسکا کلام ہندستان کی زبانوں کے ادبی سرمایہ کا ناقابل تقسیم ترکہ ہے۔ اس نے ٹیگور کو دیکھا، جسکے ترانے گنگا کی ہلکی ہلکی موجوں کی طرح دھیرے دھیرے ہمارے خیالات کی کشتی کو آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔ اس نے ہندستان کے دوسرے شعرا کو بھی دیکھا۔ جن میں سے اکثر و بیشتر رشیوں اور منیوں کی طرح زندگی ہی میں مر رہنے کی تلقین کچھ اس طرح کیا کرتے تھے:—

زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

یا

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ان لوگوں کے لئے دنیا پاپ تھی اور اسکی مخلوق قابل احتراز۔ وہ ڈھونڈتے

ہے فوادی اور چمکتے ہوئے نغمے کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر [illegible] کہ
یہ چیزیں زندگی کی مظہر ہیں۔ موت کی نہیں !

نذرالاسلام یہ سب دیکھتا تڑپتا رہا۔ جب اسے احساس ہوا کہ
دیہی بنگال کی بہا[illegible] کتابوں سے [illegible] آج خزاں کے نشانے پر جان
دھر رہے ہیں تو اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ۔ باغی، وہ اس وقت سوچ رہا تھا
جب انسان عموماً انقلاب پسند ہوتا ہے، طبیعت میں جوش اور تخریب کی خواہش
انگڑائیاں لے رہی ہوتی ہیں۔ اور جب یہ طبعی ابھار بیٹے یا احول سے مجبور ہو کر دشمن
کو انسان نہیں بلکہ صرف دشمن سمجھنے لگتا ہے تو زندگی کے کچھ سوتے ہوئے خواب
جاگ اٹھتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے عزم پھر سے جیتے ہیں۔ اس ردعمل کے دور میں
ان کی کاری ضرب کو ہمارے معاشرتی ادارے مشکل ہی سے انگیز کر سکتے ہیں۔

کچھ اسی قسم کے "تاثرات کی بنا پر" اگنی بینا" (آگ کی بانسری) کے
شاعر نے آزادی کی لگن اور ظلم سے نفرت کا عالمگیر پیغام اپنے دیس کو سنایا۔
بردوان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اب سے تقریباً ۴۷ سال پہلے پیدا
ہونے والا شاعر اب "باغی" "آمد" اور "پیام شباب" جیسی نظمیں کہنے لگا تھا۔
انگریزی ادب میں بھی اسکاٹ کی نظموں میں جگہ جگہ حب الوطنی انگڑائیاں لیتی نظر آتی
ہے۔ اسکے علاوہ وکٹر ہیوگو، ٹینی سن، بائرن اور سوفی بیرن کی وہ نظمیں ملتی ہیں
جن کے چمن میں آزادی اور فتحیابی کے کھلے ہوئے شگفتہ پھول اپنی بہاریں دکھا رہے
ہیں۔ پھر زندہ دل اور پائندہ قوموں کے قومی و ملی ترانے بھی ہر زمانے اور ہر دور میں
نوجوان دلوں سے خراج تحسین وصول کرتے رہتے ہیں۔ لیکن نذرالاسلام کی نظم "باغی"
ایک مشہور ناقد کی رائے میں ان سب سے بڑھ کر ہے۔ اس میں زور بھی ہے اور حسن
بھی۔ اس کا باغی ہیرو جہاں یہ کہتا ہے :-

" میں وحشیوں کا رقص ہوں۔ اپنی تال پر آپ ہی ناچنے لگتا ہوں
میں سپاہیوں کا گیت ہوں
چلتا ہوں اور ٹھٹکتا ہوں، سنبھلتا ہوں اور لڑکھڑاتا ہوں
میں وہ نوجوان ہوں جسکی رگوں میں تازہ خون بہتا ہے
میں وہ ہوں جو دنیا کا غرور توڑ دیتا ہے
میں اسی دن مطمئن ہونگا جب مظلوموں کی فریاد ......
فضائے عالم میں گونجے گی !"

اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے :-

"میں بہتے ہوئے پانی کی آواز ہوں، چنچل موجوں کی شیریں راگنی !!

[illegible]
[illegible] ہے۔ اور مستقبل (؟) کا گل "

نذرالاسلام کی نظموں میں جہاں جوش و خروش کے ساتھ ساتھ [illegible]
کا عکس بھی ملتا ہے۔ اس میں خالی تقدیری رفتار نہیں بلکہ موت کا تصور [illegible]
غم یا موت نے اسے تخلیق نہیں کیا ہے۔ بلکہ خود وہ موت کا خالق ہے۔ اس کی
ایک دوسری نظم ہے "طوفان آگیا" اس کے ہر ایک بند میں یہ نظریہ زیادہ
واضح ہو جاتا ہے :-

" یہاں طوفان آگیا۔ طوفان آگیا یا قیامت کا پیغام آگیا
آج زندگی کی بازی لگا کر وہ موت کے چنگل سے نکلنے کیلئے تیار ہو
جو طوفان کے ساتھ نہ چلے گا ——— وہ یقیناً آگ میں جل جائیگا
آگ جہاں یا دریا میں تیر ——— ان دونوں میں کوئی فرق نہیں
جب موت کے ہاتھوں سے چھٹکارا ممکن نہیں تو اس سے خوشی خوشی گلے کیوں نہ ملیں !
اس کا خیر مقدم کیوں نہ کریں
اس زندگی کو کبھی فنا نہیں ——— یہ تو بقائے دوام ہے
اگر زندہ دلوں کی طرح جینا ہو .... تو سر پر طوفان کا سایہ بنے رہے
اور قدموں کے نیچے ہر دم موت کو بہنے دے
جسم رحمت باری کی دین ہے ! ——— کیا تو اسکی تحقیر کر سکتا ہے ؟
او ناداں زندگی پھولوں کا ہار ہے ——— موت کے گلے میں ڈالنے کے لئے !"

اس آخری خیال کو آگے چلکر وہ یوں بیان کرتا ہے :-

" یہ جسم کتنا حسین اور خوبصورت ہے !!
اسے ہم کر یہ امراض کے سپرد کیوں کریں ؟
اپنے جسم کا پھول ہم ——— زندگی کی آرتی میں دیکر ....
موت کے دیوتا کی نظر کیوں نہ کریں
مہمان کو مرجھائے ہوئے پھول نہیں دئیے جاتے !
جا زندگی کے پودے سے شگفتہ پھول توڑ لا !"

کیا ان اشعار میں ایک تڑپتی ہوئی روح نظر نہیں آتی ؟ کیا اس میں آزادی
جوش مارتی ایک نئی دنیا کی آرزو نہیں ؟ کیا ہمارا شاعر یہاں سارے مصائب
کو ٹھکراتے ہوئے اپنی عزم اور مسکراتے ہوئے چہرہ کے ساتھ آگے نہیں بڑھ رہا ؟

نیتیجہ اس کے سامنے زندگی کے تلخ حقائق ہیں جنکا وہ بڑی بے جگری سے مقابلہ کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر سرکار اپنی کتاب Futurism of Asia میں لکھتے ہیں:۔

"جب میں نے نذر الاسلام کی نظم "باغی" پڑھی تو مجھے محسوس ہوا کہ گذشتہ دس سال سے ہم اپنے ادب میں جس انقلاب کے منتظر تھے آج اُسکا آغاز ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں زندگی اور جوش کا ایک دریا آ نکلا ہے۔ مسلمانوں نے اب تک اپنی ادبی زبان کی اتنی خدمت نہیں کی تھی جتنی ان پر واجب ہوتی ہے۔ لیکن اب ثابت ہو گیا کہ بنگال کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کرنے کا سہرا شاید انہیں کے سر بندھنے والا ہے۔"

سچ یہ ہے کہ نذر الاسلام قدامت پسندی کی تمام زنجیریں توڑ کر ایک نئی کائنات کی تخلیق کرنے کھڑا ہوا تھا۔ اسکے نزدیک زندگی جوانمردی اور جواں مرگی کا دوسرا نام ہے۔ وہ کاہلوں، عیش پسندوں اور گوشہ نشینوں کا دشمن ہے وہ چاہتا ہے کہ شباب و انقلاب کا میل کبھی نہ مٹ سکے۔ اسکی آواز ایک مجاہد کی صدا ہے۔ وہ جو بھی نغمہ چھیڑتا ہے۔ اسکے سرگم پر آزادی اور شباب کا ہی بر کھا برستی ہے۔ اسکی نظموں کے عنوانات مختلف ہیں مگر ان سب میں ایک ہی رُوح دوڑ رہی ہے۔ خواہ وہ صبح کے تارے کا ذکر کر رہا ہو۔ خواہ وطن کے اندھے دیوتا کا۔

"جس کی جبیں پر اک داغ ہے ـــــ صدیوں کی غلامی کا داغ
اور جو ہمیشہ پھانسی کے تختہ پر اپنے سپوتوں کے خون سے نہایا کرتا ہے"

خواہ وہ صور اسرافیل پر نظم لکھ رہا ہو:۔

"جس کی آواز سے ستارے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں
اور جس سے قیامت کا شہد لرزہ بر اندام ہو رہا ہے ـــــ!"

خواہ وہ دلہن کی ایک چھلکتی ہوئی شام کے خیال میں محو کہہ رہا ہو:۔

"اسیر مینا، جو تنکے کھا کر پنجرے میں بیٹھی، سسکتے ہوئے گیت گا رہی ہو
او آزاد پپیہے! انقلاب کے اسباق کو اپنے ظلم شکن نغموں سے تھرا دے!
تو سربلند کنول کا پھول ہے۔۔۔۔۔۔ جو ہمیشہ اپنی نگہت عنبریں سے، ہوا کو جانفزا کرتا رہے گا۔"

مگر ان تمام نظموں میں ایک ہی پیغام ہے ـــــ اٹھو! عمل کرو، لڑو، اپنے وطن کی ناموس کی خاطر، اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے ـــــ باہر نکلو ـــــ اور تڑپ کے وہ نوجوانوں سے کہتا ہے:۔

"جس دشت میں تو آبادیاں بسائے گا

اگر ایسے کانٹے تجھے چھیڑتے ہیں ـــــ تو ہراساں نہ ہو!
کہ ایک جنبش پا سے، تو انہیں روند سکتا ہے"

ڈاکٹر عبدالحق نے نذر الاسلام کے اس بے پناہ جذبے سے متاثر ہو کر ہی کہا تھا:۔

"ہندستان کی کسی زبان میں اس قیامت خیز قوت کا کوئی شاعر نہیں پایا جاتا۔ اسکے کلام میں ایک آگ بھری ہوئی ہے۔ جس کے سامنے عامیانہ خیالات اور ہماری شاعری کے مضامین بالکل گھاس پھوس معلوم ہوتے ہیں"

دراصل رونا دھونا اسکی کتاب زندگی کا کوئی عنوان ہی نہیں۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ وہ زندگی کے خیال میں محو ہو کر موت کو بھول گیا۔ یا دوسرے شعرا کی طرح پستی اور بے فکری کی آڑ میں اسے چھپانے کی کوشش کی۔ نہیں! اس جگہ یہاں بھی موت کی تلقین ہے۔ اسکی زبان قلم بھی موت کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی۔ اسکے نزدیک وہ بھی جنگ بس ایک خود نما۔ سرکش جبیں کا اظہار جرأت ہے۔ وہ بھی غم کے آنسوؤں اور ظلم کے خون میں نہلائے ہوئے جبیں دجری جوانوں کے ترانے گاتا ہے لیکن اسکے سامنے موت کا وہ نظریہ ہے جو ایک سنار کے سامنے ہوتا ہے۔ جو مٹی میں ملے ہوئے سونے کے ذرّوں کو پگھلا کر تپا کر اس کا کھوٹ اور میل دور کرتا ہے۔ پھر اسے انہیں شعلوں کی آنچ دکھا کر ٹھوکتا، پیٹتا، کاٹتا اور موڑتا ہے اور طرح طرح کے خوبصورت زیور بناتا ہے جو نازنینوں کے زینت دست و گلو ہوتے ہیں۔ اس سارے تخریبی عمل کا انجام ایک سودمند تخلیق پر مشتمل ہوتا ہے۔ یوں ہی موت دکھ، مفلسی اور ناکامیاں، سب انسانی فطرت کی خامیوں اور کمیوں کی درستی کیلئے ٹھوکوں کا کام دیتی ہیں۔ تا کہ وہ پختہ ہو۔ صحیح ہو۔ دلکش اور پائیدار ہو۔

دوسرے لفظوں میں وہ موت کا تخریبی نہیں بلکہ تخلیقی پس منظر اپنے سامنے رکھتا ہے۔ ستارۂ تخریب پر اُس نے جو نظم لکھی ہے وہ اس کی بے پناہ امید آفرینی کی سب سے زیادہ درخشاں مثال ہے۔ وہ کبھی ناامید نہیں ہوتا۔ منحوس ستارہ اپنی تعلّی میں یوں کہتا ہے:۔۔۔

"میں اہرمن کا قاصد اجل ہوں۔ میں "ستارۂ تخریب" ہوں!
میری جبین نقشہ ساز ہے ـــ صد ہا جہنموں کی آگ روشن ہے!
اور اس آگ کو ہمالیہ کے دیوتا کی آہ آتشیں ـــــ برابر ہوا دیتی رہتی ہے!
میں وہ آواز تو بہ ہوں جو زبان یزداں سے بلند ہوتی ہے!

اپنا مخلوق کی سیہ کاریوں کو دیکھکر

میرا معرکۂ شباب ... [illegible]

اس زمزمے سے متوالا ہوکر جب میں قہقہہ لگاتا ہوں تو ... [illegible]

اور آندھیاں کروٹ بدلنے لگتی ہیں!"

کیا ان الفاظ کی بلند آہنگی میں ایک دہکتے ہوئے حوصلے کی ایک رنگینی اور لپیٹ نہیں ؟ کیا اس تحریری نظم میں بھی نذر الاسلام کا پیغام عمل کہیں پر خوابیدہ ہو گیا ہے؟ —— نہیں ! وہ ہوشیار ہے ۔ کسی بھی رو میں بہے وہ حقیقت اور واقعیت سے دور نہیں ۔ یقیناً وہ اس نحوس اور دمدار ستارے کی دمک میں بھی اسی شعلے کو عریاں درخشاں دیکھ رہا ہے جس کا نقشہ اس نے اپنی لازوال نظم "پیام شباب" میں کھینچا ہے جہاں وہ کہتا ہے :-

" میں اس شباب کے گیت گاتا ہوں —— !

جو سمندر کی گہرائی میں آسمان کی وسعت میں زندگی کے ہیجان میں

فضا کی ہر سمت میں

موت سے نبرد آزما رہتا ہے

وہ جو تحت الثریٰ میں گو ہر شب چراغ کی تلاش میں جا پہنچتا ہے

وہ جس نے بادل کی بیٹیوں کو کنیز بنا رکھا ہے

وہ جو بجلی کو اپنی مٹھی میں پکڑے رکھتا ہے

وہ جس کی فرماں برداری طوفان کرتے ہیں !

پھانسی کی رسی .... جسکے گلو گیر ہوتی ہے

جس کے خون سے شفق سُرخی حاصل کرتا ہے !!

قید خانے میں جس کی خدمت کے لئے

آزادی کی دیوی خود آتی ہے

میں اُسی شباب کے گیت گاتا ہوں ! "

نذر الاسلام کی نظموں نے جوانی کو نئی زندگی بخشی ہے ۔ شباب پھر سے زندہ ہو گیا ہے ۔ نئے حوصلے بیدار ہو گئے ہیں ۔ مایوس اور ناامید چہروں پر بھی شباب رقص کر رہا ہے ۔ متحرک رہا ہے —— نامعلوم اور لازوال آنے والی خوشی کے خیال میں —— جو آکر رہے گی —— مگر جس کی راہ میں "حال" نے نکیلے کانٹے بچھا رکھے ہیں ۔

... [illegible]

... [illegible] ہو جاتے ؟

آزادی کے کانٹے ... [illegible] ہوں !

کہ ایک ... [illegible] —— وہ نہیں ہو سکتا ہے

وہ شاعر شباب ہے ۔ شاعر حریت و آزادی ہے اور سب سے بڑھکر —— وہ شاعر عمل و حقیقت ہے ۔ اس نے ... امید و یاس کی ایک غیر واضح اور مبہم فضا میں آنکھیں کھولیں ۔ لیکن اپنے دلکش ... نغموں سے ایک نیا محل تعمیر کیا ۔ جو ایک بار ٹوٹے گا تو سو بار بنے گا —— اور جسکی برجوں سے شبانہ روز ، دلوں کو گرما دینے والے نغمے سنائی دیتے ہیں !!

مری وفا کا ترا لطف بھی جواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں

یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں
سبھی ہے حسن مگر عشق کا جواب نہیں

مری نگاہ میں جلوے ہیں، جلوے ہی جلوے
یہاں حجاب نہیں ہی یہاں نقاب نہیں

جنوں بھی حد سے سوا، شوق بھی ہے حد سے سوا
یہ بات کیا ہے کہ میں موردِ عتاب نہیں

یہاں تو حُسن کا دِل بھی ہے غم سے صد پارہ
میں کامیاب نہیں، وہ بھی کامیاب نہیں

یہاں تو رات کی بیداریاں مُسلّم ہیں
مگر وہاں بھی حسیں انکھڑیوں میں خواب نہیں

نہ پوچھئے مری دنیا کو، میری دنیا میں
خود آفتاب بھی ذرّہ ہے آفتاب نہیں

یہ کیا کہ عشق کا نالہ بھی بے نیازِ اثر
یہ کیا کہ حُسن کا افسوں بھی کامیاب نہیں

سبھی ہیں میکدۂ دہر میں خرد والے
کوئی خراب نہیں ہے، کوئی خراب نہیں

مجاز کس کو میں سمجھاؤں کوئی کیا سمجھے
کہ کامیاب محبت بھی کامیاب نہیں

جگر مراد آبادی

(از جناب محمد ضیاء الاسلام صاحب بی۔ ایس سی، پی۔ سی۔ ایس)

شعر کی بلندی اور شعرا کی پرگوئی کے لحاظ سے نیز زندگی کے مختلف پہلوؤں نیز شاعری کے اعلا کرنے کے خیال سے ہمارا موجودہ دور پچھلے دوروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ غالب کے فلسفۂ حیات کے مطالعہ۔ داغ کی زبان کی سلاستگی اور ظفر کے نالوں اور حالی کی کاوشوں نے ایک عظیم الشان عمارت کی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ اقبال نے اس کو مکمل کیا۔ اب اس عمارت کی تزئین کی جا رہی ہے۔ اس میں حسرت۔ جگر۔ جوش۔ ساغر۔ حفیظ۔ سیماب۔ اختر شیرانی سب ہی اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ حسرت اپنی سادگی و پرکاری سے۔ جوش اپنے طنز کی تلوار سے۔ ساغر اپنی خوش بیانی و خوش نوائی سے، حفیظ اپنے دوستداروں کی دنیا میں پریت کے گیت سنا سنا کر سیماب ہر شعر کو پختہ مضبوط اور منضبط کر کے اور اختر کبھی سلماؤں کے گیت سنا کر اور کبھی بے پناہ رجز پڑھ کر ایک انوکھی اور دلخوش کن آرائش تکمیل مہیا کر رہے ہیں۔ جس میں نغمہ، محبت، سرمستی، بے خودی، جوش، سرور، آرزو، کاوش، تپش بےچینی و کرب سب ہی کچھ ہے۔ اردو شاعری کو یہ بلندی ابھی تک نصیب نہیں ہوئی تھی۔

یہ زمانہ کسی ایک مخصوص ہنر میں کمال حاصل کرنے کا ہے۔ ہر شخص ایک خاص راہ اختیار کرتا ہے اور اس میں اپنے آرٹ کو پایۂ تکمیل تک پہونچاتا ہے۔ اسی طرح اُردو شاعری کی دنیا میں جگر نے غزل کو اپنا لیا ہے اور غزل نے اُن کو۔ اُن کو یہ دعویٰ نہیں کہ جہان کے شعرا کا "نہ قصیدہ، نہ مخمس، نہ رباعی نہ غزل" اُن کے آگے سرنہ ہوگا۔ جگر رنگ و بو کی دنیا میں رہ پڑے۔ اُن کا دماغ اُن کی خوشبو سے معطر ہو گیا۔ انھوں نے اس رنگ و بو کی دنیا کو ہر طرح پر مسلط کرنا شروع کر دیا۔ ان کو ایک رنگین وادی میں جگہ مل گئی ہے۔ اگر آوازہ گیر و دار اُٹھے بھی تو وہ اُس کو اہمیت نہیں دیتے اور حُسن و عشق کے نغمے الاپے جاتے ہیں۔

سنا رہے تھے لب سے کسی نے جو نغمے ! لب جگر سے مکرر سنائے جاتے ہیں

[illegible] پہنچا کر [illegible] موجود [illegible] میں ہر لطف [illegible] شاعری کو منظر [illegible] جگر مصروف نظم پر قائل [illegible] خوش نہیں بلکہ جو چند نظمیں انھوں نے کہی بھی ہیں اُن میں بھی رنگ تغزل ابھرا نظر آتا ہے۔ جوش، حفیظ، ساغر، احسان سب ہی نے غزل سے اپنی شاعری شروع کی۔ لیکن زمانے کے تقاضے سے بعد میں نظم کہنے لگے۔ جگر نے غزل ہی کہنا شروع کی اور اب بھی غزل ہی کہتے ہیں۔ کچھ نقاد جگر کے محض غزل گو شاعر ہونے پر چیں بجبیں ہیں میرے نزدیک یہ کوئی کمی نہیں۔ شاعر بنایا نہیں جاتا پیدا ہوتا ہے۔ جگر فطرتی شاعر ہیں اُن کا رجحان طبع غزل ہی کی طرف ہے۔ اس لئے نظم نہ لکھنا اُن کے دامن پر کوئی داغ نہیں۔ اگر وہ نظم لکھیں گے تو اُن کا درجہ ایک نقال کا ہو کر رہ جائیگا۔

باوجود اس کے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ غزل کا میدان بہ نسبت نظم کے بہت تنگ ہے۔ اور ایسے غزل گو شعرا کی کمی نہیں جو ردیف و قافیہ کی قید میں فرسودہ مضامین کو اشعار کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ یہ وہ شاعر ہیں جو شاعری کو ایک دلچسپ مشغلہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان کی فطرت اور ذہن دونوں شعر و شاعری کی سرحد سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ لیکن جگر کی شاعری اس قسم کی شاعری نہیں۔ ان کی شاعری بہت بلند ہے۔ وہ ایسے مقام پر ہیں جہاں خود بخود شعر اُن پر نازل ہوتا ہے۔ اپنے نازک ترین احساسات کو وہ شعر کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ درحقیقت اُن کی غزلیں ایسی ہی متاثر ہیں جیسی حافظ کی۔ اُن میں وہی جادو وہی شیرینی وہی ہلکا ہلکا درد، وہی جاذبیت ہے جو حافظ کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں وہ چیز ہے جس کو Positive Theory [illegible] کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس حالت میں اُن کو ہر طرف حُسن نظر آتا ہے اور وہ بے خود ہو کر کہنے لگتے ہیں۔

پیے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب کوئی پلا رہا ہے پیے جا رہا ہوں میں

جگر وہی کہتے ہیں جو اُن کے دل پر گذرتی ہے۔ وہ نہیں کہتے جو دوسرے لوگ محسوس کرتے ہیں۔ جگر کے یہاں شاعر دیدہ بنائے قوم کا درجہ نہیں رکھتا۔ وہ دیدہ بنائے قوم ہونے کو معیوب خیال کرتے ہیں۔ اُن کا اور اُن کے تعارف کرانے والوں کا خیال ہے (ہر چند کہ اُن کو تعارف کی ضرورت نہیں) کہ ایسے شاعر پیشہ ور خطیب اور واعظ ہیں۔ اگر آپ اپنی زندگی اور احساس کے تاثرات پیش کرتے ہیں تو آپ شاعر اور اگر آپ دوسروں کی زندگی پیش کرتے ہیں تو آپ نقال۔ پھر ہے یا آج کل کے الفاظ میں اکثر [illegible] ہے۔۔۔

ملہ یہ مضمون ہمعصر شعرا کے خاص سلسلہ میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا یہاں ڈاکٹر صاحب لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کی اجازت سے شائع کیا جاتا ہے)

نظم اور نثر کی وہ شمعیں کہ جو مقبول عقل پر کر شکار ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کے حقائق سے چشم پوشی کرکے ایک فراری ادب میں خود کو گم کر لیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں بنیادی طور پر نہ کوئی خیال نیا ہے نہ کوئی جذبہ۔ لیکن زندگی نئی شاہراہوں سے گزر رہی ہے۔ اس لئے ہمارے شعر و ادب کو خیالات کی نئی دنیا پیش کرنی چاہئے۔ زندگی کے حقائق سے روگردانی کرنے سے فراری ادب پیدا ہوتا ہے۔ اور فراری ادب والوں پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

غزل گو شعرا کی دنیا حسن و عشق کی دنیا ہے۔ اور زندگی صرف حسن و جمال، عشق و محبت تک ہی محدود نہیں۔ زندگی اُس کے علاوہ اور بھی کچھ ہے پھر بھی حسن و عشق کی دنیا کی رنگینی اور دلکشی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اس دنیا میں جگر جہاں ہیں وہاں اُن کے قریب بھی کوئی نہیں۔

شاعر لطیف ترین احساسات کا مجسمہ ہے۔ اُس کے دل پر جو کیفیتیں گزرتی ہیں وہ اُس کے اشعار میں حل ہو جاتی ہیں۔

اللہ اللہ رے ہستی شاعر
قلبِ غنچہ کا آنکھ شبنم کی

جگر کے اشعار پُرکیف و سرور آور۔ اُن کے محسوسات لطیفہ و شان کی غزلیں حسن و محبت کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔

جگر کے یہاں شاعر کا مذہب محبت ہے۔ وہ ہر اُس چیز کو عزیز سمجھتا ہے جس کو اُس کا محبوب عزیز سمجھے۔

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی مجھے پھر بھی غیر عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

پھول وہی چمن وہی فرق نظر نظر کا ہے
عہدِ بہار میں تھا کیا فصلِ خزاں میں کیا نہیں

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

اُن کی محبت کی دنیا نہایت لطیف و حسین دنیا ہے۔ وہ بہت ذوق و شوق سے کہتے ہیں کہ محبت کی دنیا میں بہار جاودانی، حسن و نغمہ اور جوانی ہے اور کسی شے کو اُس میں دخل نہیں۔

محبت میں یہ کیا مقدور ہم سے بہار جاودانی ہے
ہجومِ رنگ و بو ہے حسن و نغمہ ہے جوانی ہے

وہ محبوب کو قاتل کی صورت میں پیش نہیں کرتے۔ کہتے ہیں۔

ان شاعروں پہ رحم ہو عشق ہی کی مار
اک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا

محبت کے آنسو جس طرح جگر کی غزلوں میں ملتے ہیں ایسے کہیں اور مشکل سے ملیں گے۔ کہتے ہیں۔

انہیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا غافل
پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

اور جو بیتی شام پہ چراغِ محبت
وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے

مختلف قسم کے آنسو اُن کے کلام میں جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں۔ خون کے آنسو۔ محبت کے آنسو۔ خوشی کے آنسو اور پھر سب سے بے نظیر خشک آنسو۔ کہتے ہیں۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

اور محبوب کے آنسوؤں کی تصویر وہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چاپ سے وہ بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

اُن کی محبت میں خودداری، خود نمائی، خود اعتمادی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ یہ ہی نہیں کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں۔ کہتے ہیں۔

محبت سے انکار کب تک کہاں تک
مرا نام بھی سُن کے شرمانے والے

*

یہ تو نہیں کہ عرضِ غم و مختصر را نہیں
عالمِ حسن کو مگر فرصتِ ماسوا نہیں

*

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا تھا گوشۂ نقاب اُن کا

*

ممکن نہیں کہ جذبۂ دل کارگر نہ ہو
یہ اور بات ہے تمہیں اب تک خبر نہ ہو

*

اور تو کچھ کمی نہیں آپ کے اقتدار میں
آپ مجھے بھلا سکیں یہ نہیں اختیار میں

لیکن محبت کرنا اور عاشق کا لقب پانا ہر شخص کا کام نہیں۔ عاشق کو سخت سخت منزلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں

عشق فنا کا نام ہے عشق میں زندگی نہ دیکھ
جلوۂ آفتاب بن ذرہ میں روشنی نہ دیکھ

*

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا ہی سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اس منزل کے بہت سے راہرو پہلی دوسری منزل میں رہ جاتے ہیں اُن سے آگے نہیں بڑھا جاتا۔ نہ استقلال نہ روشنی سرِ منزل امداد کرتی ہے۔ لیکن ان منزلوں سے گزرنے کے بعد جب عشق کامل ہو جاتا ہے تو عاشق کو ہر وقت اپنے محبوب کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

[illegible] کی زبان کی [illegible] ... [illegible] مذاق سے کتنی کی ہے وہ دل اپنی
[illegible] نے خانۂ ہستی اپنی ... پھر حاصل ہی تھا لیکن بات بگڑی بگڑی اپنی

جگر کی زبان نہایت صاف و شستہ اور بامحاورہ ہے۔ وہ زیادہ تر عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اپنی جگہ پر نہایت برمحل ہوتے ہیں۔ الفاظ پر اون کو مکمل قدرت حاصل ہے۔ سادگی اُن کے کلام کا اصلی جوہر ہے۔ داغ کے رنگ میں کہتے ہیں۔

مانا کہ ہم پہ جور و جفا کیجئے گا آپ ... لیکن ہمیں نہ ہونگے تو کیا کیجئے گا آپ

اور

✱

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف ... میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال ... در پردہ چشم یار کی شہ پا کے پی گیا

لیکن درحقیقت جگر کو اپنی شاعری کے لئے محبت کی ضرورت ہے۔ شراب کی نہیں۔ کہتے ہیں۔

جبتک شباب عشق مکمل شباب ہے ... پانی ہی ہے شراب ہوا بھی شراب ہے

جگر کی شاعری مبتذل مضامین سے پاک نہیں۔ لیکن پھر بھی ادب کثیف کا عنصر اُن کی شاعری میں جہاں بھی ملتا ہے ایسا نہیں جو ذوقِ سلیم پہ بار گذرے

مثلاً ... آستینوں کا وہ چڑھا لینا ... گوری گوری کلائیاں توبہ

اس میں کچھ تو داغ کا سا اثر ہے اور کچھ "شبِ دہن کے پاؤں" کا ورثہ۔

جگر حسن کے پجاری ہیں۔ لیکن اُن کا عشق زندہ۔ سرکش و چالاک ہے۔ کہتے ہیں۔

محبت میں ہم تو جئے ہیں جئیں گے ... وہ ہوں گے کوئی اور مر جانے والے

جگر کو کامل اعتقاد ہے کہ عشق حسن کو ضرور اپنی طرف مائل کرسکتا ہے۔

ہو کے رہیگا ہمنوا وہ بھی ترے ہی ساتھ ساتھ ... نغمۂ شوق گائے جا حُسن کی برہمی نہ دیکھ

عشق و حسن کے رابطہ کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

میں اُنکا ہو گیا ہو گیا اُنھیں مسرور کردیا ... وہ میرے ہو گئے مجھے مغرور کر دیا

محاکات کے تو وہ بادشاہ ہیں۔ جو مرقعے اُنھوں نے پیش کئے ہیں وہ آپ اپنا جواب ہیں۔

اک جام آخری تو پینا ہے اور ساقی ... اب دستِ شوق کانپے یا پاؤں لڑکھڑائیں

✱

اُف وہ پروانے کہ کٹے ہی چلے آتے ہیں ... ہائے وہ شمع کہ خاموش ہوئی جاتی ہے

اور

غریب بلبل پھپک رہی ہے قریب عارض چھپک رہی ہے
گلوں کی چھاتی دھڑک رہی ہے وہ دستِ رنگیں بڑھا رہے ہیں

اُن کے کلام میں لطافت، حسن، محبت کے رنگا رنگ پھول ہیں جو گلشن عالم میں ابتک نہ کھلے تھے۔ اُن کی شاعری حسن و شباب کیف و نغمہ کی شاعری ہے وہ روح پر سرور اور دل میں مستی بھر دیتے ہیں۔ ایسی لے سے اپنا نغمہ چھیڑ دیتے ہیں کہ انسان محو ہو جاتا ہے۔ اور اُس کا دل سنتے سنتے سیراب نہیں ہوتا۔

اُن کا ہر نغمہ ہے نغمہ آفریں ... اُن کا ہر سازِ جنوں سازِ رباب

انھوں نے غزل کو ساز و نغمہ۔ کیف و مستی سے سیراب کر دیا ہے۔ غزل کو لطافت اور رنگینی کا پیکر تمام بنا دیا ہے۔ اُن کی شاعری کی پوزیشن اردو کی دنیا میں وہی ہے جو فارسی ادب میں حافظ کی مخمور غزلوں کی۔

غزل

(از جناب نیساں اکبرآبادی)

یہ اپنی محبت کا اثر دیکھ رہا ہوں
مائل بہ کرم اُن کی نظر دیکھ رہا ہوں
ہیں چہرۂ پُرنور پہ بکھری ہوئی زلفیں
یا شام کے پہلو میں سحر دیکھ رہا ہوں
زورِ کشش حُسن ہے یا جذبِ محبت
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
اللہ رے تصور کی یہ اعجاز نمائی
جیسے میں انھیں پیش نظر دیکھ رہا ہوں
میرا دلِ بیتاب ابھی تک نہیں ٹھہرا
یہ اُن کی نگاہوں کا اثر دیکھ رہا ہوں
خود حُسن منانے کے لئے عشق کو آیا
میں اُن کو بہ اندازِ دگر دیکھ رہا ہوں
نیساں میں انھیں دیکھنے جاتا ہوں مگر آج
کھوئی ہوئی خود اپنی نظر دیکھ رہا ہوں

غالب - بھائی یہ ہندی نژاد فرہنگ نگار کیا خاک فارسی جانیں یہ لفظ اضداد میں نہیں۔ محاورہ اہلِ ایران میں فراز کردن کے معنی بند کرنے کے ہیں۔

بیخبر - مگر اس پر تمام فرہنگ نگاروں کا اجماع ہے۔

غالب - (بگڑ کر) اس کو امر اجماعی قرار دینا ویسا ہی اجماع ہے جیسا اہلِ شام نے خلافت یزید پر اجماع کیا تھا۔ جب یہ شخص الفاظ کی حقیقت سے ناواقف تھا تو فرہنگ نگاری کی کیا ضرورت تھی؟ بھاڑ جھونکتا، رسی بٹنا، لکڑی بیچتا۔ دنیا میں کاموں کی کیا کمی ہے۔ کوئی اور کام کر لیتا۔ (کچھ رک کر) ہاں مولانا بیخبر صاحب، اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں۔

بیخبر - ہاں ہاں ضرور ضرور ارشاد فرمایئے۔

غالب - سنا ہے کہ آپ قاطع برہان کا جواب لکھ رہے ہیں؟

بیخبر - (گھبرا کر) یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ میں اور آپ کی تحریر کا جواب! استغفر اللہ آپ سے یہ کس کمبخت نے کہہ دیا؟ لعنۃ اللہ علی الکاذبین!

غالب - (ہنستے ہوئے) پیر و مرشد خفا نہیں ہوا کرتے۔ یوں ہی سنا تھا، بات ذہن میں تھی اور ابھی آپ نے فراز کردن پر صاحب برہان کی تائید میں جو تقریر کی اس سے یہ خدشہ بڑھ گیا۔ مگر جب آپ انکاری ہیں تو سارا جھگڑا ختم سمجھئے!!

(مسلسل اور پیہم قہقہوں کی صدا)

ویرانہ

از جناب جاں نثار اختر

دِل کے ویرانہ پہ اے دوست نظر کرتا جا

جگمگاتے تھے اُمیدوں کے فلک سیر محل
عظمتِ شوق کے مینار فروزاں تھے کبھی
کتنے گونجے ہوئے جذبات کے کاشانے تھے

کتنے جاگے ہوئے رنگین شبستاں تھے کبھی
کہکشاں تھی یہی تو پامال روِشیں تھی اس کی
چاند تاروں سے حسیں اسکے گلستاں تھے کبھی

کتنے نوعمر حسیں کتنے جواں سال حسیں
زُلف کھولے ہوئے ہر سمت خراماں تھے کبھی

دِل کے ویرانہ پہ اے دوست نظر کرتا جا

صُبح ہنستی ہوئی رکھتی تھی گلستاں میں قدم
رات اوڑھے ہوئے تاروں کی ردا آتی تھی
آرزوں کے گل آویز دریچوں میں سدا
گنگناتی ہوئی جنت کی ہوا آتی تھی

جیسے مستی میں کسی زلف کی کھل جائے گرہ
اس طرح جھوم کے گھنگھور گھٹا آتی تھی
دِل کے سوتوں میں کوئی ساز بجا کرتا تھا
دھیمی دھیمی کسی چھاگل کی صدا آتی تھی

دل کے ویرانہ پہ اے دوست نظر کرتا جا

چاندنی راتوں میں اُجڑی ہوئی اس منزل پر
اِک حسیں درد کا پَر تو سا نظر آتا ہے
ڈوبتے تاروں سے شبنم کے تنک اشکوں میں
تھرتھراتا ہوا اک عکس اُتر آتا ہے

ڈوب جاتی ہے نظر درد کے طوفانوں میں
پھر سے ماضی کا ہر اک نقش اُبھر آتا ہے"
آج مدت سے ہے خاموش یہ نغموں کا دیار
گنگناتا ہوا اب کون اِدھر آتا ہے

دِل کے ویرانہ پہ اے دوست نظر کرتا جا

گولڈن ٹمپل امرتسر

از فصیح الدین احمد

گولڈن ٹمپل امرتسر میں واقع ہے۔ امرتسر لاہور کے بعد پنجاب کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی تقریباً دو لاکھ ہے۔ یہ شہر سوا سو سال پہلے سکھوں کا مذہبی دارالخلافہ تھا۔ جسے ۱۵۷۷ء میں سکھوں کے چوتھے گرو رام داس جی نے اکبر کی عطا کی ہوئی زمین پر ایک تالاب کے کنارے بسایا۔ اور اس تالاب کا نام امرتسر رکھا۔ سنسکرت میں "امرت" کے معنی آب حیات اور "سر" کے معنی تالاب کے ہیں۔ اسی وجہ سے شہر کا نام بھی امرتسر پڑ گیا۔ اس تالاب کے وسط میں ایک مندر بنوایا جس کا نام ہرمندر یا ہری کا مندر رکھا۔ امرتسر بار بار شمال مغربی راستے سے آنے والے حملہ آوروں کا جولانگاہ رہنے کی وجہ سے کئی بار تاخت و تاراج ہوا۔ ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ ابدالی نے جسے اکثر انگریز مورخین نے غلطی سے درانی لکھا ہے، اسے برباد کیا۔ کہتے ہیں کہ مندر اور شیوالے بھی ڈھوا دیئے گئے۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ آخری تباہی تھی۔

اب سکھ مذہب کے آغاز کا حال سنئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سکھ مذہب کوئی نئی چیز نہیں بلکہ ہندو مذہب اور اسلام کے چیدہ چیدہ اصولوں کو منتخب کر کے اس مذہب کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس مذہب نے پنجاب کے ایک خاص فرقہ میں نئی روح پھونک دی۔ پنجاب ہمیشہ سے شجاعت اور بہادری کا مرکز رہا ہے۔ چنانچہ اس فرقہ میں مذہبی عقائد کی وجہ سے یک جہتی۔ استقلال اور قومیت کے جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اور انہی خصوصیات کی بنا پر سکھوں نے قومی حیثیت سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر میں بہت کافی اقتدار حاصل کر لیا۔

سکھ مذہب کے موجد بابا نانک دیو جی تھے۔ جو ۱۴۶۹ء میں ضلع لاہور میں سلطان بہلول لودھی کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۵۴۰ء میں ۷۱ سال کی عمر میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش کے وقت اکثر عجیب چیزیں ظہور میں آئیں۔ کسی شخص نے پیشین گوئی بھی کی تھی کہ بڑے ہو کر [illegible]

تھی۔ چنانچہ ان کا [illegible] میں صرف ہوا [illegible] ان میں ان کی ملاقات اکثر [illegible] لوگوں سے ہوئی۔ ان کے والد [illegible] تھے۔ جب وہ دس سال کے ہوئے [illegible] جنیو ڈالا جانے لگا تو انہوں نے سخت احتجاج بلند کیا اور کہا "رحمدلی کی روئی، قناعت کے تاگے، استقلال کی گرہ سے بٹ کر جو جنیو بنایا جائے وہ روح کے واسطے اصلی جنیو ہوگا۔ اور اگر ایسا جنیو دستیاب ہو سکے تو میں پہننے کو تیار ہوں۔ یہ ایسا جنیو ہوگا جو نہ تو ٹوٹ سکے گا۔ نہ میل مٹی سے خراب ہوگا۔ نہ آگ اسے جلا سکے گی۔ نہ [illegible] چرا سکے گا۔ وہ آدمی کس قدر خوش قسمت ہوگا۔ جو اس جنیو کو پہن کر [illegible] میں زندگی کے دن بسر کر سکے۔" اس واقعہ کے بعد سے انہوں نے برہمنی مذہب کو بری نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔ اور آگے چل کر آزادی حاصل کرنے کی تدبیریں سوچتے رہے۔ کہتے ہیں کہ یہ فارسی کے بہت اچھے عالم تھے۔ اور اکثر فارسی کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ جس کا غالباً ان کی زندگی پر کافی اثر پڑا۔ [illegible] فرماتے ہیں کہ دہریت اور مادیت کو چھوڑو اور شریعت کے مطابق عمل کرو۔ [illegible] کی ان تمام کوششوں کے باوجود گرو نانک جی نے کوئی پیشہ اختیار نہیں کیا۔ آخر کار انہوں نے ایک مسلمان گورنر کی نوکری کر لی جس کے متعلق مشہور ہے کہ آپ نے اپنا ہم خیال بنا کر اپنا پیرو بھی بنا لیا۔ پھر شہر سے نکل کر جنگل اور بیابان کی راہ لی جہاں کل جگ یعنی شیطان نے ان کے دل میں ہزاروں وسوسے پیدا کئے لیکن بالآخر ان سب دشواریوں پر فتح پائی۔ اور کہتے ہیں کہ عرفانیت کے مدارج کو طے کر کے بالواسطہ خدا سے بھی ہم کلامی حاصل کی۔ اسی زمانہ میں انہوں نے "جپ جی" یعنی بھجن بنائے۔ جو سکھوں کے اصول مذہبی تصور ہوتے ہیں۔ پھر مذہبی لباس اختیار کیا اور دنیا کو نیا سبق سکھانے کے لئے نکل پڑے۔ ان کے ہم رکاب ایک گویا مردانہ نامی بھی تھا جو ان کے بھجنوں کے ساتھ ساتھ رباب بجاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے تمام ہندوستان میں دورہ کیا۔ بلکہ شمال میں ہمالیہ اور جنوب میں سیلون تک بھی جا پہنچے۔ ان کا مذہبی لباس ہندو مسلم لباس کا مجموعہ تھا۔ جس کا مقصد غالباً یہ ہوگا کہ چونکہ مذہب کی غایت حقیقت کی تحقیق ہے اس لئے مختلف مذاہب میں تفرقہ پردازی مناسب نہیں۔ ان کے نزدیک ہر مذہب و ملت کے لوگ ایک ہی ہستی کی پرستش کرتے ہیں۔ جیسے کوئی ہری کا، کوئی رام، کوئی اللہ اور کوئی خدا کے نام سے یاد کرتا ہے۔

دوسرے گرو انگت دیو تھے جو ۱۵۰۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۵۲ء میں شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے بھی [illegible] سنسکرت

ے پنجابی زبان کو گورمکھی کے استعمال کیا۔ سنسکرت کے حروف
رتے ہیں۔ مگر اس زبان کے حروف صرف ۳۵ تھے۔ یہ چودہ سال گرو

ان کے بعد تیسرے گرو امرداس جی ہوئے۔ انہوں نے اپنا صدر مقام
ل کو دیا نے بیاس کے کنارے قرار دیا۔ انہوں نے اپنی وفات کے وقت
رجیں اپنے داماد رام داس جی کو چوتھا گرو مقرر کیا۔ جنہوں نے سکھوں
کی تبلیغ کے لئے ایک جماعت قائم کی۔ جو لوگوں سے روپیہ لیکر جمع کرتے
لیکن چونکہ ان لوگوں نے دیانت داری سے کام نہیں لیا۔ اس لئے دسویں
بند سنگھ نے اس رواج کو منسوخ کر دیا۔ گرو رام داس نے امرتسر نامی تالاب
ائی جاری رکھی۔ اور اس کام کو گرو ارجن دیو پانچویں گرو نے تکمیل کو
۔ اب تک سکھ گروؤں کا تقرر وراثتاً نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس زمانہ
وروثی ہوگیا۔

گرو ارجن دیو ۱۵۸۱ء میں گرو بنے۔ انکے زمانہ میں سکھوں کی حالت میں
تغیر واقع ہوا۔ یہ بہت حسین آدمی تھے اور شاعری کا بھی خداداد ملکہ رکھتے تھے۔
کی تکمیل کے بعد انہوں نے ہر مندر کو تعمیر کیا۔ اور نئے بھجن بنائے۔ علاوہ ازیں
لہ گروؤں کے بھجن کو ایک کتابی شکل میں جمع کیا۔ جو بعد کو گرنتھ صاحب کے
مشہور ہوئی۔ انکے زمانہ میں سکھوں نے قومی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اور مذہب
کے ساتھ ساتھ مذہبی دار الخلافہ بھی بنا لیا تھا۔ اس لئے چند شر انگیز اور فتنہ
لوگوں نے شہنشاہ اکبر کو سکھوں کے خلاف بھڑکانا چاہا۔ لیکن اکبر نے گرنتھ
کا مطالعہ کرنے کے بعد مذہبی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اکبر کی وفات پر جہانگیر
بیٹھا۔ چندو لال شاہ جو لاہور کا گورنر تھا، اپنی لڑکی کی شادی گرو ارجن
لڑکے سے کرنا چاہتا تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر گرو ارجن دیو کو یہ شادی
ہوئی جسکی بنا پر چندو لال نے جہانگیر کو سکھوں کے خلاف یہ کہکر بھڑکایا کہ
خسرو ارجن دیو کے ساتھ ملکر زبردست سیاسی سازش کر رہا ہے۔ اس بنا پر
نے گرو ارجن دیو کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ جہاں ۱۶۱۶ء میں انکا انتقال ہوا۔
وفات کے بعد سکھوں میں کافی جوش پیدا ہوگیا۔ اور انکی طاقت روز بروز بڑھتی گئی
کا سیاسی اقتدار اسی زمانہ سے شروع ہوا اور مستحکم ہوتا چلا گیا۔ لیکن اس
سے قطع نظر سکھ قوم اور انکے گرو ہرگوبند جی برابر مغل فوجوں میں شامل ہوکر
اور شاہجہاں کے زمانہ میں اکثر جنگی معرکوں میں شریک ہوئے اور اس
میں اگرچہ جاگیروں وغیرہ کے سلسلہ میں مغل گورنروں سے تنازعات ہوتے
اور سکھ قوم نے عام طور پر مسلمان حکمرانوں کے ساتھ پوری وفاداری

کا ثبوت دیا۔ گرو ہرگوبند جی اور دارا شکوہ میں بڑی دوستی تھی۔ اور گرو گوبند کا
بیشتر حصہ لاہور میں ہی صرف ہوتا تھا۔ لیکن چند دیگر واقعات کی بنا پر کشیدگی
پھر زیادہ ہوتی گئی۔ انہوں نے ۱۶۴۵ء میں انتقال کیا۔ انکے بعد ساتویں گرو
ہر رائے مذہبی گدی پر بیٹھے جن کا انتقال ۱۶۶۱ء میں ہوا۔ آٹھویں گرو
ہرکشن تھے۔ گرو ہر رائے کے انتقال پر ہرکشن لال اور رام رائے ان کے
دونوں بیٹوں میں مذہبی گدی حاصل کرنے کے لئے سخت کشمکش رہی۔ آخر کار
فیصلہ اورنگ زیب پر چھوڑ دیا گیا۔ جس نے ہرکشن کو جنکی عمر بہت چھوٹی تھی دربار
میں طلب کیا۔ اور ان کی فہم و فراست کو جانچنے کے لئے حکم دیا کہ چند ممتاز خواتین
حرم میں سے ملکۂ ہندوستان کو پہچان کر بتائیں۔ ہرکشن جی نے فوراً انگلی سے
ملکہ کی طرف اشارہ کیا۔ اورنگ زیب خردسال بچہ کی عقلمندی سے بہت
خوش ہوا۔ اور اُن کو گرو مقرر کر دیا۔ لیکن ۱۶۶۴ء میں چیچک میں مبتلا ہوکر
ان کا انتقال ہوا۔ نویں گرو کے انتخاب میں پھر مشکلات پیش آئیں اور آخر کار
تیغ بہادر منتخب کئے گئے۔ ان کے زمانہ میں سکھوں میں کافی خانہ جنگی رہی۔
اور رام رائے ان کا بھائی برابر آپ کے درپئے آزار رہا۔

۱۶۷۵ء میں ان کے قتل کے بعد ان کے بیٹے گوبند سنگھ
پندرہ سال کی عمر میں دسویں گرو بنے۔ پینتیس سال کی عمر میں انہوں نے
ہندوؤں میں سے ذات پات کے تنازعات کو اُڑانے کی کوشش کی۔ اور
ہر مذہب و ملت کے پیروؤں کو سکھ مذہب میں داخل ہونیکی دعوت عام
دی۔ ان کے زمانہ میں سنگھ قوم نے پہلی مرتبہ سیاسی وجوہات کی بنا پر
فوجی بھرتی کی بنیاد ڈالی۔ اور انہوں نے بپتسمے کی رسم جو گذشتہ چند گروؤں
کے عہد میں مفقود ہو چکی تھی۔ دوبارہ جاری کی۔ اس رسم کو پہال کہتے ہیں۔
اس رسم کی تکمیل کے بعد ان لوگوں کا نام خالصہ یعنی چیلہ مقرر ہوتا تھا۔ اور انہی
کے زمانہ میں مندرجہ ذیل اشیاء یعنی کنگھی۔ کچھ۔ کارد (چھری) کیس اور
کرپان سکھوں کی نشانی تصور ہونے لگے سکھ مذہب کا آغاز گرو نانک جی
اور اس کی تکمیل گرو گوبند سنگھ کے ہاتھوں ہوئی۔

(منشور از نشرگاہ دہلی)

بھکارن کی دُنیا

از جناب نہال احمد صاحب سیوہاروی

دُور اہلِ زر کے ہر کاشانۂ عشرت سے دور
اک بھکارن راہ میں بیٹھی تھی بارِ غم سے چور

جسکے غم آلود چہرے سے عیاں تھی مفلسی
کچھ نہ کہنے پر بھی گویا داستاں تھی مفلسی

مفلسی وہ جسکو کہئے دشمنِ عز و وقار
جسکے سایہ سے لرزتا ہے شکوہِ تاجدار

مفلسی وہ جو مکمل نقش ہے ادبار کا
ظلمتیں جسکی مٹا دیں طنطنہ انوار کا

مفلسی وہ جو بھلا دیتی ہے حق ناموس کا
جسکے ہاتھوں چاک ہوتا ہے ورق ناموس کا

مفلسی وہ جو غمِ بیچارگی کا روگ ہے
فقر کا دوزخ فلاکت کی دہکتی آگ ہے

مفلسی وہ جو مٹا دیتی ہے شانِ زندگی
آدمیت کو ترستا ہے جہانِ زندگی

وہ بھکارن ورطۂ افلاس کی ماری ہوئی
رنج میں ڈوبی ہجومِ یاس کی ماری ہوئی

گود میں اپنی لئے بیٹھی تھی اک ننھا سا لال
مفلسی کا اور اس ننھی سی ہستی پر وبال

دوپہر وہ موسمِ گرما کی آتش ریز دھوپ
ہر طرف لو کے تھپیڑے ہر طرف تھی تیز دھوپ

[illegible] شعلہ ساماں ہر طرف جلتی ہوئی
گرم سورج کی شعاعوں سے بھڑک جلتی ہوئی

خاک کے تپتے ہوئے ذروں پہ ہوتا تھا گماں
خاک کے دامن میں تھا اک آگ کا دریا رواں

جوشِ آزادی سے وہ بڑھتے ہوئے گرد و غبار
سوئے گردوں صبح دم چڑھتے ہوئے گرد و غبار

جسکے تیور دیکھ کر آئے ہوئے اوسان جائیں
گرم رو آندھی کی وہ لحظہ بہ لحظہ سائیں سائیں

الغرض قہرِ مجسم تھا وہ گرما کا شباب
التہابِ محض کیا بلکہ جہانِ التہاب

چھتریوں کے سائے میں کچھ آ رہے تھے راہرو
چھتریوں کے سائے میں کچھ جا رہے تھے راہرو

اور وہ بیکس زمانے کے مصائب کی شکار
اک ردا کہنہ تھی سر پر جا بجا سے تار تار

بختِ برگشتہ سے راحت آفریں سایہ نہ تھا
آرزو سایہ کی تھی لیکن کہیں سایہ نہ تھا

وہ بھکارن کہہ رہی تھی اے الٰہ العالمیں
ایک تیرے قبضۂ قدرت میں [illegible]

ہے جہاں تیرا جہنم ہم غریبوں کے لئے
کوئی راحت ہی نہیں ہے بدنصیبوں کیلئے

دھوپ سے اس ننھی منی جان کو کیونکر بچاؤں؟
جاؤں تو دنیا کے مالک [illegible]

اس تپش سے امن پائیگا مرا دلبند کیا
تیری اک چشمِ کرم دیکھیں گے دولتمند کیا؟

انکو میری خستہ حالی پر ترس آئیگا کیا؟
کوئی ان میں اہلِ دل ہے رحم فرمائیگا کیا؟

میرے بیکس لال پر ہوگی عنایت کی نظر؟
کیا اسے انساں سمجھیں گے خداوندانِ زر؟

مفلسوں پر یہ خداوندان زر ترسیں گے کیا؟
عیش کوشانِ ارم درد آشنا ہوتے ہیں کیا؟

اور اگر ایسا نہیں تو پھر اے بارِ الٰہ
کیا غریبوں کیلئے یہ زندگانی ہے گناہ؟

کیا امیروں پر ہی تیرے لطف کے انبار ہیں
کیا یہی خمخانۂ وحدت کے حقدار ہیں؟

کیا امیروں کیلئے ہی جگمگاتے قصر ہیں
اہلِ زر ہی کیا فقط راحت کے [illegible] ہیں

عیش کے شایاں امیروں ہی کے ہیں نورِ نظر
اور طوفانِ فلاکت کو مرا لختِ جگر

ختم کر یارب یہ اندازِ زمانہ ختم کر
دہر سے سرمایہ داری کا فسانہ ختم کر

تاکجا عہدِ فلاکت بدنصیبوں کے لئے
یہ جہاں جنت بنا دے ہم غریبوں کے لئے

از جناب مشتاق جلیلی حیدر آبادی

——— ایک لاکھ! سو ہزار کا مالک ———

رضوی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ مفلسی کے تنگ و تاریک پردے اسکی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ پھر مسرت کی ایک سچی دُنیا نظروں کے سامنے آباد ہو گئی۔ جس میں زندگی مچل مچل کر لوٹنے لگی ——— اور وہ اپنی خوش نصیبی پر مسکرانے لگا کہ اتنے لوگوں میں لاٹری صرف اسکے نام نکل آئی۔ اور وہ آن کی آن میں ایک لاکھ روپوں کا سچا حقدار بن گیا۔ یہ خوبی تقدیر نہیں تو اور کیا ہے؟ ——— وہ سوچ اٹھا اب وہ ایک موٹر لے گا۔ ایک محل بنائیگا۔ رنگا رنگ کی دبیز دبیز قالینیں جسکی زینت بنی ہونگی۔ جسکے دروازوں پر مخملی پردے ہولے ہولے سمٹے جا رہے ہونگے۔ نہیں نہیں۔ وہ ایک ہوائی جہاز خریدیگا۔ پھر وہ چاند تاروں کی سیر کریگا ——— وہ آسمان سے بلند اُڑنا چاہے گا۔ کیوں نہیں۔ وہ برابر اُڑ سکے گا۔ پھر تو وہ ہنسا اور ہنستا چلا گیا۔ قہقہوں کی موجیں شکن آلود دیواروں میں جذب ہوتی گئیں۔ وہ ہنستا گیا۔ اُسکی پیشانی پسینوں کے قطروں سے جھلا گئی۔ مگر اسکی ہنسی کم نہ ہوئی بڑھتی ہی گئی ——— پھر اسکے کانوں میں پازیب اور نغمہ کی ملی جلی صدائیں آنے لگیں۔ اور وہ شبک شبک سے سُروں میں بہتا گیا۔ پھر اسکی نظر ایک چھوٹے سے جام پر پڑی جسکی محدود حدوں میں شراب کی ہلکی ہلکی موجیں تڑپ اُٹھیں۔ اور کسی کی بکھری ہوئی زلفوں کی پرچھائیں رنگین کناروں کے آغوش میں لپس لپس گئیں۔ اور وہ بہاروں کی لطیف لطیف ذروں میں سمٹ سمٹ گیا۔ اور اسکی سانسوں کی جنبش آب حیات کی لہریں بن گئیں۔ اسکی ہونٹوں کی حرکتیں جاں نواز ہوتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اسکی آنکھوں کی گہرائی گہوارۂ زندگی بن کر رہ گئی۔ اور پھر اسے خود اپنا وجود ایک ابدی عشرت محسوس ہوا۔ اور وہ ایک طلسم ہوشربا کی طرح آپ سے بے خبر ہو گیا۔

رات گئے تک ثریا بے چین رہی۔ وہ کبھی کمرے میں کبھی باہر کے سائبان میں ٹہلتی رہی۔ اور اسکی نظریں سڑک کے اس کونے سے لیکر اُس کونے تک گھتی ہی بار تیزی سے اُٹھ اُٹھ گئیں۔ مگر اس تاریک اور خاموش فضا میں رضوی کا کہیں پتہ نہ تھا ——— وہ حیران تھی کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ اتنی رات تک گھر سے باہر رہیں۔ پھر یہ آج کیوں؟ یونہی سینما چلے گئے ہونگے۔ مگر یہ تو ممکن ہی نہیں۔ انہیں تو سنیما سے دلی نفرت ہے۔ پھر وہ سنیما کیسے جا سکتے ہیں۔ ہاں دوستوں سے گپ لڑ رہی ہوگی۔ باتونی تو غضب کے ہیں۔ کسی بحث میں اُلجھ پڑے ہونگے۔ اپنی بات منوانے کیلئے وہ کئی راتیں گذار سکیں۔ تو بھی ان کے نزدیک کچھ نہیں۔ مگر اب تک تو ایسا نہیں ہوا۔ زیادہ سے زیادہ دس اور اس سے آگے تو گیارہ۔ وہ اتنی دیر میں تو گھر یقیناً لوٹ آتے ——— پھر یہ آج ایسا کیوں؟ ——— پھر دفعتہً کسی کے قدموں کی بھاری بھاری آواز نے اسے چونکا دیا۔ اور اُس کے سارے خیالات ذہن کی وادی میں منتشر ہو کر رہ گئے ——— رضوی نے کوٹ اُتارا اور کھونٹی کی سمت اُچھال دیا۔ کوٹ نیچے گر پڑا۔ پیر کی خفیف خفیف لغزشیں اور آنکھوں میں سُرخ سُرخ ڈوروں نے ثریا کو نہ جانے کہاں پہنچا دیا۔ پہلے تو اُسے چکر آنے لگا۔ پھر وہ اپنے آپ کو سنبھالنے میں کامیاب ہوئی۔ لیکن اُس کا سانس دھیرے دھیرے چلنے لگا۔ وہ کوٹ کو کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے بولی۔

"کیوں یہ آج چہرے پر ہوائیاں کیسی ہیں؟ آنکھوں میں اتنی سُرخی کہاں سے آ گئی؟"

"آنکھوں میں سُرخی ———" وہ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم سمجھتی ہو میں نے شراب پی ہے؟ چھی چھی۔ میں نے شراب وراب نہیں پی۔ آؤ ادھر آ جاؤ۔ آ جاؤ بھی ادھر ———" پھر وہ آگے بڑھا اور اُس نے ثریا کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ وہ شراب کی تند تند مہک میں نہا گئی۔ اسکی مضبوط گرفت میں آج اس کا سانس رک رک گیا۔ اسکی آنکھوں تلے ایک کثیف سا اندھیرا بل کھانے لگا۔ اور وہ اس گرفت سے دُور ہو جانے کی کوشش دیر تک کرتی رہی۔ پھر اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ وہ ایک عورت ہے اور عورت کا دوسرا نام دُنیا میں بے بسی ہے۔

پندرہ دن کی غیر حاضری جو ہوئی تو اسے دفتر سے برطرف کر دیا گیا۔ اور اُس نے اس خبر کا خیر مقدم ایک بلند قہقہہ سے کیا۔ اور اُسے ایسا کرنا بھی چاہیئے تھا۔ بھلا ملازمت کی اسے کیا پرواہ تھی۔ وہ بھی ۵۰ روپیہ کی۔ ایسی کتنی ملازمتیں تو اسکی جیب میں پڑی ہوئی تھیں۔ دوستوں کی ایک وقت کی خاطر داری تو اسکے تیس دن کی کمائی کے برابر تھی۔ پھر وہ دفتر سے علیحدہ ہو جانے پر ہنستا نہیں تو اور کیا روتا ——— اس نے ٹیبل سے

بوتل اُنڈیلی۔ اور ایک ہی گھونٹ سے جام کو لبریز کر لیا لبوں سے جا لگا پھر لمحے بھر لئے مَس ہوا اور خالی ہو گیا۔ پھر جام میں شراب نظر آئی۔ پھر نظر آئی سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے اُس نے پھر ہاتھ بڑھایا اور پھر اُنگلیوں کی زد میں بوتل بل کھانے لگی ——— پہلا ہوٹل میں پیاس کا پانچواں گھنٹہ گزر رہا تھا۔ وہ اُمس فضا سے گھبرا کر اُٹھا۔ پہلے تو قدم کچھ لڑکھڑائے۔ پھر سنبھل گئے۔ وہ دانتوں میں پائپ دبائے ہوئے زینہ سے نیچے اترا۔ اور پائپ کا دھواں شام کے دھندلکے میں گھل مل گیا۔ اور سڑک کے دائیں جانب میل کا ایک بڑا درخت تاریک دھبے کی طرح نظر آنے لگا۔ اور وہیں پر بجلی کے جلتے ہوئے تاروں کی ایک مسلسل لڑی بن گئے ——— وہ سڑک سے ہٹ کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ وہ یونہی دیر تک چلتا رہا۔ پھر وہ بائیں سمت مڑا۔ اسکے قدم تیز ہو گئے اور اُس نے اسی طرح کئی گلیاں اور طے کیں پھر وہ ایک پُر رونق شاہراہ پر پہنچ گیا۔ اسکی نظریں مکانوں کے بالائی حصوں پر پڑنے لگیں اور اس کے لب کسی جذبے کے تحت بھینچ گئے۔ وہ نرم نرم نغموں کے انوکھے پیچ و خم اور نقرئی" پُرسرے سُرکا ہوا پھر لال لال آدھی آدھی شلواریں اسکی آنکھوں میں گھوم گئیں۔ وہ کتنی رنگین دُنیا میں سانس لینے لگا۔ وہ لمحہ بھر کیلئے چلتے چلتے رُکا۔ پھر اُس کے قدم ایک مکان کی سیڑھیوں کی طرف اُٹھ گئے ——— نغمہ ریز آوازوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ پھر اسکی رُوح پازیب کی جھنکاروں میں ڈوبتی گئی اور وہ رقاصہ کے جسم کی لطیف جنبشوں میں حل ہو گیا۔ پھر نازک نازک اُنگلیوں کی زد میں بھیگے ہوئے جام بڑھے اور اُس کے لبوں کو چوم گئے۔ اسکے قدم ڈگمگائے مگر حسین حسین ہاتھوں نے تھام تھام لیا۔ اور پھر گداز گداز باہوں کی ہلکی ہلکی گرفت وہ فردوسی منظروں میں بہتا اُٹھا۔ اور خواب جیسی کیفیتوں نے اُسے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔

ثریا نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا۔ ہوا پتّوں کی راہوں سے سرسراتی ہوئی گزری۔ پھر دور افق پر تارے اُبھرتے گئے اور تاریکی کے بڑے بڑے دائروں نے ان کے گرد ہالے کی شکل اختیار کر لی۔ پھر بادلوں کے طوفان میں تاروں کی تابانی روند گئی ——— ہوا کے ہلکے جھونکوں نے اُس کے رُخساروں میں بہتے ہوئے آنسوؤں کو جذب کر دیا۔ پھر وہ سوچ اُٹھی۔ اسکے زندگی کے دن اس قدر بھیانک کیوں بن گئے اور اسے یہ کس غلطی کی عوض سزا ملی؟ ابھی اسکی شادی ہوئے دن ہی کتنے گذرے تھے؟ مگر اسے اتنی جلد کتنی تلخیوں سے دوچار ہونا پڑا! اور اس کی نوجوانی کی بہاریں کس طرح ایک محدود سی جگہ میں پس کر رہ گئیں۔ یہ قدر انقلاب! گویا اب اسے جینے کا حق ہی نہیں رہا ——— پھر اسے اپنی آنے والی گھڑیاں تاریک نظر آئیں۔ مگر پھر اسکی آنکھیں ایک خاص چمک سے معمور ہو گئیں۔ اور سرخ سرخ رخسار بے اختیار

تمتما اُٹھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ [illegible] مہینے ——— [illegible] گود بھر جائیگی۔ پھر اسکی آغوش ایک ننھی اور معصوم جان سے آراستہ ہو جائیگی۔ پھر اسے رضوی کی پرواہ نہ ہو گی رضوی کی کیا اُسے دنیا کی پرواہ نہ رہے گی۔ پھر کائنات کے الٹے سیدھے مشغلوں سے سمجھنے کا اسے موقع کہاں ملے گا۔ وہ اپنی ننھی سی زندگی [illegible] خود کو بھلا دیگی۔ پھر دنیا کے غم کا کیا سوال؟ ——— [illegible] آپ مُسکرا اُٹھے۔ لیکن یہ ہنسی اسکے لبوں پر زیادہ دیر تک [illegible] آیا کہ اس دن رضوی نے اسے کیسی کیسی باتیں کہہ [illegible] غلطی صرف اسی قدر ہوئی تھی کہ وہ پوچھ بیٹھی کہ اس نے رات کہاں گزاری بس اتنا سُننا تھا کہ اسکی آنکھوں کی سُرخی اور بڑھ گئی۔ وہ جھنجھلا گیا۔ پھر تو اس نے اسے بتایا کہ اسکے حُسن میں اب کوئی جاذبیت نہیں رہی۔ گالوں کی رنگت بالکل کھلتے ہوئے گلاب کی طرح مدھم پڑ گئی۔ اور جسکی جوانی کی بہاریں ماند پڑ چکی ہوں وہ اسکی شریک حیات بننے کا کوئی حق نہیں ——— ثریا کا سارا بدن بے پناہ آگ میں جھُلس اُٹھا۔ اور انتہائی غم و غصہ کی حالت میں اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اس کے لب کانپے اور وہ بول اُٹھی "بس بس اب زیادہ پھول نہ برساؤ" پھر اس گستاخی کی اسے کیا سزا ملی؟ رضوی کا ہاتھ اُٹھا اور تیزی کے ساتھ اس کے گالوں سے ٹکرا گیا۔ اور وہ ایک بے بسی اور بے چارگی سی محسوس کرتی ہوئی چارپائی پر گر پڑی۔ پھر آنسوؤں نے رات بھر اس کا ساتھ نہ چھوڑا ——— وہ سوچنے لگی کہ وہ بُرا نہ مانے گی وہ نشے میں ایسا کر گئے۔ مگر اسکا دل سینے میں بری طرح دھڑکنے لگا۔ اور اسکی نظر دھندلی ہو گئی پھر اسکے رخساروں پر آنسوؤں کی ایک سیدھی سی لکیر بن گئی۔ اور ہچکیوں کی آواز دیر تک ہوا کی موجوں میں لرزتی رہی ——— پھر کھڑکی کے باہر تاریک سایوں کا ہجوم لمحہ بہ لمحہ بڑھتا گیا۔ وہ کھڑکی سے ہٹی اور آرام کرسی پر لیٹ گئی۔ وہ لیٹی رہی۔ اتنے میں گھڑی نے تین بجائے۔ تو وہ چونک پڑی۔ پھر اسے کچھ قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ ابھی گھبرا کر اُٹھی ہی تھی کہ رضوی لڑکھڑاتا ہوا سامنے آ گیا۔ اور ایک کرسی کا سہارا لیتے ہوئے گر پڑا۔ لیکن ثریا نے دوڑ کر اسے اُٹھا لیا۔ اور وہ "مجھے چھونے کی ضرورت نہیں" کہتا ہوا اُٹھا اور ایک کمرے کی سمت چلا گیا۔ پھر بکس میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکال نکال کر اُس نے پتلون اور کوٹ کی جیبوں میں بھر لیا۔ اور کمرے سے نکل آیا۔ ثریا نے اس کے بازو تھام لئے اور کہنے لگی۔ خدا کے لئے اب کہیں نہ جاؤ۔ دیکھو تو ایک ہفتہ کے بعد تمہاری صورت دکھائی دی ہے۔

"تو میں کیا کروں" اُس نے ہونٹوں کو دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔

پھر جب بھی چھوڑ دو ــــــــــ

وہ دروازے کے بیچ میں کھڑی ہو کر بولی " میں تو نہ جانے دونگی۔ چاہے جو ہو جائے"

"نہ جانے دوگی" وہ کچھ قدم آگے بڑھکر بولا " میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ اختری میرا انتظار کر رہی ہوگی" پھر اُس نے کچھ غصہ سے کہا "ہٹ جاؤ سامنے سے" مگر وہ ویسے ہی کھڑی رہی۔

"نہیں ہٹونگی!" وہ انتہائی غیظ و غضب میں بول اٹھا۔ وہ ویسے کی ویسا ہی کھڑی رہی ــــــــ پھر رضوی کی آنکھوں کی رنگت بھیانک ہوگئی اور اسکے جسم کا رواں رواں کھڑا ہوگیا۔ رگوں میں خون کی رفتار بجلی بن گئی۔ وہ آگے بڑھا، اس کے ہاتھوں نے ثریا کے شانوں کو مضبوطی سے تھام لیا اور اُسے ایک سمت دھکیل دیا ــــــــ وہ زینے سے بل کھاتی ہوئی نیچے گری۔ اور ایک دردناک چیخ سارے مکان میں، کانپ گئی۔ وہ سیڑھیوں سے اُترا اور اُسکی نظر خون کے چھینٹوں پر پڑی۔ اس کا نشہ لمحہ بھر میں دور ہوگیا۔ اور آن کی آن میں کھوئے ہوئے حواس واپس آگئے۔ پھر وہ سہما ہوا ثریا کے چہرہ کو گھورنے لگا۔

ــــــــ انجکشن کی بڑی بڑی سوئی کتنی ہی بار اُس کے بازوؤں میں چبھوئی گئی۔ اور کتنے ہی آلات اُس کے جسم میں تیزی سے چلتے رہے۔ مگر زہریلے اثرات خون میں پھیلتے ہی گئے۔ اور پھر اسکی بے ہوشی دیکھتے ہی دیکھتے موت کی خاموشی میں بدل گئی ــــــــ پھر رضوی کی نظر کھڑکی میں سے ہوتی ہوئی آسمان سے ٹکراگئی۔ دفعتہً ایک تارا ٹوٹا اور ایک سنہری لکیر بناتے ہوئے تاریکی کے سیلاب میں ڈوب گیا۔ اور اسکی جگہ کئی ستارے اور جگمگا اُٹھے ــــــــ پھر اس نے سامنے رکھی ہوئی بوتل اُٹھائی اور منہ سے لگالی۔

دوستوں کے مشورے اور اختری جان کی فرمائشوں نے اسکی جیبوں کے بوجھ کو ہلکا کر دیا۔ ایک تو اُس نے لاٹری کے ٹکٹ ایک دم دس ہزار کے خرید لئے مگر وہ سارے کے سارے ڈوب گئے۔ اسے ان روپوں کے ضائع ہونے کا شدید احساس ہوا۔ اب کے ریس میں بازی لگانے کی ٹھانی۔ ایک ہزار۔ دو ہزار۔ چار ہزار ایک وقت ایسا آئیگا کہ وہ لاکھوں روپوں کا مالک ہو جائے گا۔ پھر نہ جانے وہ کیا سے کیا ہو جائے ــــــــ اور ابھی وہ زندگی کا پروگرام اچھی طرح بنا ہی رہا تھا کہ اختری آگئی اور کہنے لگی " جانوں تو میرے سرتاج کو کس سوچ نے گھیر رکھا ہے " پھر اُس نے مُسکراتی ہوئی نظریں اسکی آنکھوں میں ڈال دیں جسکے جواب میں اُس نے ساغروں کو لبریز کر دیا۔ پھر اُس نے ایک ایک کرکے سارے ساغر ختم کر دیئے۔ پھر گھنگرو کی جھنکاریں فضاؤں میں پھیلیں اور اس میں نغموں کی تانوں نے مل کر ایک سحر خیز منظر پیش کر دیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ زندگی پلکوں پر ناچ رہی ہے۔

پھر وہ ریس سے جھنجھلا کر اُٹھا اور اپنی کار کی طرف بڑھا۔ گو اسکی پیشانی پر ہزار ہا شکنیں پڑ گئی تھیں۔ مگر چہرے پر وہی مغرورکن مسکراہٹ برابر لوٹ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ آج بیس ہزار ہار گیا۔ کتنی بڑی رقم اسکے ہاتھ سے جاتی رہی۔ وہ کیا سمجھکر کھیلا اور کیا ہوگیا۔ اُسے ہرگز ایسی اُمید نہ تھی۔ اور ہوتی کیسے۔ وہ کتنے اچھے اصول پر کھیل رہا تھا۔ اب اسے کوئی کیا کرے کہ وہ ہار گیا۔ اور وہ بھی اتنی بڑی رقم۔ اگر دو نمبر بھی وہ جیت جاتا تو پھر اسے کوئی غم نہ ہوتا۔ لیکن وہ تو ایک نمبر بھی نہ جیت سکا۔ آج یقیناً اس کا ستارہ گردش میں تھا۔ ورنہ ہارے چلے جانے کی کوئی وجہ نہیں۔ خیر دیکھا جائیگا ــــــــ دفعتہً اُسے خیال ہوا اب اسکے پاس صرف دو ہزار روپیہ اور رہ گئے۔ پھر اسکے بعد ــــــــ اس کا دم گھٹتا ہوا سا معلوم ہوا اور اُس نے موٹر کی رفتار تیز کر دی۔ پھر وہ ایک بڑی دکان کے سامنے رک گئی۔ وہ جلدی سے اُتر پڑا اور تیزی کے ساتھ ایک ہزار کی بوتلیں خرید ڈالیں۔ پھر کار ہلکی سی شورش کے ساتھ سڑک پر چل پڑی۔

چلتے چلتے اس نے سوچا کہ اسکی محبت اختری کے دل و دماغ میں روح تک کیسے سما گئی اور وہ خود بھی تو اسکا ہو کر رہ گیا ہے ــــــــ زینے پر قدم رکھتے ہوئے اسے ایکدم یاد آیا "اختری کی فرمائش" پھر اُس نے سوچا اب اسکے پاس کچھ بھی تو نہیں رہا۔ اور اُسے کوئی قارون کا خزانہ تو ہاتھ آیا نہ تھا۔ اب تو اسکے پہلو میں محبت سے مچلتے ہوئے دل کے سوا کچھ بھی تو نہیں ــــــــ وہ تیزی سے بڑھتا گیا۔ اور ریشمی پردوں میں سے ہوتا ہوا گذرا۔ اُس کی نظریں اختری کی نظروں سے مل گئیں۔ اور وہ اس کے قریب ہو گیا۔

"میرا نیکلس"! وہ مسکرا کر بولی۔

"اب نیکلس کہاں۔ اختری اب تو صرف میں ہی ہوں" وہ منہ بناتی ہوئی ایک سمت چلدی ــــــــ پھر کچھ قریب ہی سے پازیب کی صدائیں آنے لگیں۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھا اور بڑھتا گیا۔ پھر اسکی نگاہیں اختری پر پڑیں۔ اور اسکے نیم عریاں لباس میں ہوئی دو نئی صورتوں پر جم گئیں۔ اب اُس کے رگ رگ میں آگ سی لگ گئی۔ اور وہ چلا اُٹھا۔ "اختری! اختری!!" وہ ناچتے ناچتے رک کر بولی "نکل جاؤ تمہاری حسین گلی ہے۔ یہاں سے نکل جاؤ" اسکے یہ الفاظ اسکے دل میں تیر و نشتر بنکر پیوست ہوگئے۔ اور اسکی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ پھر وہ انتہائی طیش میں اسکی طرف لپکا ــــــــ دو قوی بازوؤں نے اسکے شانے مضبوطی سے تھام لئے اور وہ دیر تک کسمساتا رہا۔ پھر اُسے دھکیل دیا گیا۔ اور وہ زینے پر لوٹتا ہوا نیچے گر پڑا۔ اسکی پیشانی پتھر سے ٹکرا گئی اور خون میں نہا گئی۔ اور ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں کی گہرائیوں میں زمانہ کروٹیں لیتا ہوا معلوم ہوا۔ اسکے چہرے کو سرخ سرخ دھاریوں نے کتنا بھیانک کر دیا تھا۔ اور اب اسکے لب بے اختیار پکار اُٹھے "ثریا! ثریا!"

مری نظروں میں ہے وہ حسنِ برہم — پریشاں بال وہ غصے کا عالم
وہ آنکھوں میں شفق کی سرخیاں سی — وہ آتش ریز نظریں بجلیاں سی
وہ اک طوفان چشم فتنہ گر میں — وہ اک رومان بپھری سی نظر میں
وہ بل کھایا ہوا اک ایک فقرہ — ہزاروں ناگنوں کا زہر توبہ!
وہ خم کھائے ہوئے ہونٹوں کی گرمی — تڑپ کر رہ گیا جس نے نظر کی
نگہ کے ہاتھ میں وہ تازیانہ — وہ تھرایا ہوا سارا زمانہ
جبینِ غیظ پر شکنیں ہی شکنیں — وہ اک چڑھتے ہوئے دریا کی موجیں
نفس کچھ تیز تر بھی گرم تر بھی — اک آندھی جس میں شعلہ بھی شرر بھی
لپک شعلوں کی رخساروں کے اندر — اک آتش اور بہشت روح پرور

شرابِ تند رگ رگ میں بھری تھی
جوانی آگ ہوکر رہ گئی تھی!!

یکایک کانپ اٹھنا بانکپن سے — صبا کی چھیڑ شمع انجمن سے
عرق آلود پیشانی کا منظر — وہ کچھ شبنم کے قطرے برگ گل پر
وہ بھرائی ہوئی آواز نازک — شکستہ ہو چلا تھا سازِ نازک
لبوں پر کپکپی سی آچلی تھی — گھٹا خاموشیوں کی چھا چلی تھی
دلِ نازک کے طوفانوں کو لے کر — غضب آلود افسانوں کو لے کر

اِک آنسو رفتہ رفتہ آرہا تھا
سمندر تھا کہ سمٹا جا رہا تھا

"کرنل واس کے متعلق تم نے سنا؟" ارشد نے سگار کی راکھ سنہری طشتری میں جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

عجیب طرح کا انسان تھا ارشد ——— اگرچہ اس کا نام ارشد ہی تھا۔ کیونکہ مجھے تو اس کے نام کے متعلق بھی شک تھا ——— "جہاں گشت" تو اسے کہا ہی نہیں جا سکتا ——— مجھے تو اسے آوارہ گرد بھی کہتے میں تامل ہے۔ شاید آپ میرا مطلب نہ سمجھے ہوں ——— اگر وہ آپ کو آج دہلی میں ملا ہے تو کل اس سے ملاقات احمد آباد میں ہوگی۔ آپ کو کبھی گمان نہیں ہو سکتا کہ دوسری مرتبہ کب اور کہاں ملاقات ہوگی۔ اکثر مہینے اور سال گذر جاتے اور وہ کہیں نظر نہ آتا۔ پھر یکایک کسی رنگین خیال شاعر کے نوزائیدہ شعر کی طرح آموجود ہوتا۔ سنجیدگی اور متانت تو اسکی شوخ اور چلبلی طبیعت سے ایسی بھاگتی تھیں جیسے بخیل محبوب سے تنہائی عاشق ——— وہ کسی قانون کا پابند نہ تھا بلکہ ——— میرے خیال میں ——— قانون کو اپنا پابند سمجھتا تھا۔ کچھ روائتیں بھی اس کے ذرائع آمدنی کے متعلق مشہور تھیں۔ مگر اس کے محبوب اور مخصوص احباب ان افواہوں پر غور کرنے کیلئے تیار نہ تھے ——— اس میں شک نہیں کہ وہ چاہے دنیا والوں کیلئے کچھ ہو لیکن اپنے حلقۂ احباب میں بہت محبوب تھا۔ ہر شخص کو یہ یقین تھا کہ ارشد دوسروں کی نسبت اس سے بہت زیادہ قریب ہے۔

بہرحال کچھ بھی ہو جب وہ گفتگو کرتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے شیریں بیان نغمات کے دھارے الفاظ کے سنگریزوں سے کھیلتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں اور وقت غیر محسوس طریقہ پر گذر جاتا۔

میں نے جلدی سے سر ہلا کر کہا "کرنل واس! ہاں ہاں کہو۔ تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"میری مراد" اس نے سگار پر چٹکی مارتے ہوئے کہا "اس تصویر اور پژمردہ گلاب کے پھول سے ہے جو کرنل کے انتقال کے بعد اُن کے ڈبہ میں ملا۔"

"ہاں ہاں تم کہے جاؤ" میں نے پھر کہا "میں ذاتی طور پر تو کرنل کو نہیں جانتا مگر افواہیں ضرور سُنی ہیں۔"

ارشد ایک لمحہ کیلئے کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا "کرنل کے انتقال کے بعد جب اور چیزوں کے ساتھ ان کا آبنوسی ڈبہ جس پر مشرقی وضع کا باریک کام بنا ہوا تھا کھولا گیا تو اس میں ایک تصویر ——— حسین دوشیزہ کی اور ایک پژمردہ گلاب کا پھول آسمانی رنگ کے فیتہ سے بندھا ہوا ملا۔ مسز واس نے بتایا کہ مرحوم اس آبنوسی ڈبہ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ لیکن تصویر کو وہ بھی نہ پہچان سکیں۔ اس کے علاوہ کرنل کے مخصوص احباب بھی کچھ نہ بتا سکے۔ ہاں صرف میں اس معمّہ کی عقدہ کشائی کر سکتا تھا۔"

"صرف تم!" میں نے اپنا سنہری سگار کیس اسکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں صرف میں" ارشد نے سگار سلگاتے ہوئے جواب دیا۔ "اس دوشیزہ کا نام اُرملا تھا۔ آج سے بیس برس پیشتر کرنل اس سے مغربی وضع کے ایک بال روم میں ملا تھا۔ پہلی ملاقات میں کرنل کا دل اُرملا کی "جعد شکیں" میں ایسا پھنسا کہ پھر نہ واپس آسکا۔ مگر میں کرنل کو الزام نہیں دے سکتا۔ وہ اس معاملہ میں بے اختیار تھا ——— تم نے شاید وہ تصویر نہیں دیکھی۔ وہ مشرقی شاعروں کی تخئیلی مجسمۂ بجلی دلربا بلکہ ہوشربا تھی۔ کرنل ایسا ازخود رفتہ ہوا کہ اس دن چند لمحوں کیلئے بھی اس سے الگ نہ ہو سکا۔ اُرملا کرنل کی اس بے خودی سے بہت زیادہ متعجب ہوئی ——— کیونکہ اسکے لئے یہ پہلا اتفاق تھا ——— کرنل کی "دوستی" کی بنیاد پر دولت کا ایک نظر فریب اور دلکش محل قائم کیا جا سکتا تھا۔ کرنل متمول آدمی تھا۔"

ارشد نے سگار کی راکھ طشتری میں جھاڑی اور اپنی سنہری انگشتری کو گھماتے ہوئے کہنے لگا۔ "اس رات اُرملا کرنل کی خوبصورت کار میں گھر گئی۔ کرنل نے اس سے دوسرے روز پھر ملنے کی التجا کی۔ اُرملا نے شام کو بیکر باغ میں ملنے کا وعدہ کر لیا۔ اس شام، کرنل راجہ آر۔ جی سنگھ کے ہاں عصرانہ پر مدعو تھا ——— کسی طرح وہ اُرملا کو بھی وہاں مدعو کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک نوخیز دوشیزہ کیلئے یہ واقعی ایک اعزاز تھا ——— لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کرنل کے ساتھ آزادانہ منظر عام پر آئی ——— عصرانہ کے بعد بال روم میں ان دونوں نے مشترکہ رقص کیا ——— کرنل واقعی خوش قسمت تھا کہ وہ اُرملا کے ساتھ بغلگیر ہوا ——— لیکن اُرملا اس قسم کی لڑکی نہ تھی۔"

"تین چار دن کے بعد ایک سنہری اور حسین شام کو کرنل نے اُرملا کو نذرِ محبت پیش کی ——— خوبصورت بیش قیمت جواہرات کا ایک ہار ——— یہ جواہرات کرنل واس کے خاندانی تھے۔ اور ان کو الگ کرنے پر اسکو مسز واس سے ناخوشگوار طرزِ عمل بھی روا رکھنا پڑا۔ لیکن اُرملا کی مدھ بھری آنکھوں نے

ایسا ہوتا ہے [illegible] دل کے تار چھو جاتا ہے

پھر تم کو عجب تیر ہے کس ان زدۂ

اسکی قدر قیمت پیش کرنے کے پیچھے کی خفگی اور ناخوشگواری بھی شامل تھی۔ جواہرات الگ کر دینے سے اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی عزیز شے گم ہو گئی ہو۔ کیونکہ عزیز ترین شے کے پالینے کی امید میں اسے عزیز تو کیا عزیز تر شے کی بھی علیحدگی شامل تھی۔"

"ایک رات کرنل نے اپنی دلی خواہش آرملا سے کہہ ڈالی۔ آرملا پہلے تو سہم گئی —— اس کے لئے یہ پہلا اتفاق تھا —— لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ وہ اس قسم کی لڑکی نہ تھی۔ اس نے کرنل کو صاف الفاظ میں جواب دے دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اسکے جواہرات کا ہار بھی واپس کر دیا۔ ہاں اس نے "الوداعی بوسہ" کی اجازت دے دی اور پھر فوراً کرنل کے پاس سے چلی گئی —— بیچارہ کرنل مستقبل کے سنہری ایام کا انتظار کرتا رہا کہ شاید یہ پتھر کی دیوی پسیج جائے لیکن وہ ایام پھر کبھی واپس نہ آئے۔"

"مرحوم کرنل نے اس سے ملنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس ملکۂ ناز کی بارگاہ حسن میں کبھی شرف باریابی حاصل نہ ہو سکا۔ اس رات کے بعد آرملا پھر کہیں نظر ہی نہ آئی۔ کرنل نے بہت تلاش کیا۔ شہر شہر ڈھونڈا۔ ملک ملک پھرا ——"

"اب اس کے پاس جو کچھ رہ گیا تھا۔ وہ گلاب کا پھول آسمانی رنگ کے ربن سے بندھا ہوا، جسے آرملا بال روم میں لگائے ہوئے تھی اور اسکی ایک تصویر تھی جسے مرحوم کرنل نے بصد منت حاصل کیا تھا۔"

"یہ دنیائے رنگ و بو بھی کس قدر عجیب ہے —— بیس سال تک وہ ایک خیال موہوم میں رہا —— ایک پھول اور ایک تصویر کی پرستش کرتا رہا۔ لیکن یہ راز کسی کو بھی نہ معلوم ہو سکا۔ یہاں تک کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے کرنل واٹسن کو اسکی محبوب ترین چیزوں سے علیحدہ کر دیا۔ اور آہنی ڈبہ میں سے پژمردہ گلاب کا پھول اور تصویر نکلنے پر لوگوں کو یہ راز معلوم ہوا۔ لیکن اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ آج تک کوئی کرنل واٹسن کے خاندانی جواہرات کے ہار کی حقیقت نہ معلوم کر سکا۔ اور خود مرحوم کرنل کو بھی پتہ نہ چلا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ —— ؟" میں نے کہا۔

"ہاں" اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم سمجھے آرملا نے جو جواہرات کرنل کو واپس کئے۔ دراصل وہ نہیں تھے جو کرنل نے آرملا کو دیئے تھے۔"

"لیکن کرنل انہیں پہچان نہ سکا۔"

[illegible]

"دنیا [illegible] ہر قسم کے کام [illegible]" ارشد نے پانوں کی سنہری ڈبیا نکالتے ہوئے کہا۔

"لیکن" میں نے اسکی ڈبیا میں سے پان کھاتے ہوئے پوچھا۔ "میں نہیں سمجھ سکا کہ اس طرح آرملا کو کیا فائدہ ہوا اسکو صرف جواہرات کا ایک ہار مل گیا۔ لیکن اگر وہ کرنل جیسے مالدار شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے تیار ہو جاتی تو اس کو ایک کیا ہزاروں ہار جواہرات کے مل جاتے۔ اس فریب کی کیا ضرورت تھی؟"

"بالکل غیر ممکن تھا" ارشد نے تمباکو کی چٹکی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ قطعی ناممکن تھا۔"

"اس نے شادی کی؟"

"نہیں نہیں —— کبھی نہیں۔ اسکی حیات شیریں میں کوئی شریک نہ ہو سکا۔"

"پھر کیا ہوا ارشد! تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ تم میری بات تو بتاؤ۔ آرملا جواہرات حاصل کرنے کے لئے کیوں مستعد تھی۔ اگر وہ شادی سے ایسی متنفر تھی۔ کیا تم اس کے متعلق کچھ اور جانتے ہو؟"

ارشد پان کا مزہ لیتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ لیکن برابر میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب دلکش تبسم رقص کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر پان کھایا اور ذرا مدھم لہجے میں کہنے لگا۔

"تم جانتے ہو کہ میں جوانی میں خوبصورت ہی نہیں تھا بلکہ اچھا ایکٹر بھی تھا۔ اور کالج کے ڈراموں میں میں نے ہمیشہ بہترین پارٹ ادا کیا ہے ——"

"لیکن میری بات کا تو جواب دو" میں نے ذرا جھنجھلا کر کہا "ایک نقطہ تو ختم کرو۔ اب آرملا کہاں ہے؟"

"میں کہہ تو رہا ہوں"۔ ارشد نے کہا "آرملا یہاں ہے تم سے گفتگو میں مشغول ہے —— نہیں سمجھے —— میں ہی آرملا تھا ——"

...... کے نام

از جناب الطاف مشہدی

میری حسین ...... وہ چاندنی راتیں
نظر میں کروٹیں لیتی تھیں جب اس ایام

وہ کہکشاں وہ بہکی ہوئی سرور فروش
فلک پہ چاند ستاروں کی شمعیں طرب بدوش

وہ مست مست نظارے وہ نیلگوں دریا
جوانیوں میں اشارے وہ نیلگوں دریا

ہزار حشر اٹھاتا ہوا شباب ترا
مچلتا، ناچتا، گاتا ہوا شباب ترا

مرے شباب سے کچھ اس طرح قریب ہوا
کہ جاگتے میں مجھے اونگھنا نصیب ہوا

کلی کلی نے تبسم کیا فضا جاگی
شگفتہ ساز سنبھالے ہوئے ہوا جاگی

تھکی لہروں نے بربط کے تار چھیڑ دیئے
زمیں پہ بوندوں نے میٹھے ملار چھیڑ دیئے

نشے میں چور ہواؤں نے گیت برسائے
نہائے پانی میں کرنوں کے سیمگوں سائے

لرزتے ہونٹوں سے میں نے تمہارا نام لیا
قدم بڑھا کے تمہیں بازوؤں میں تھام لیا

دھڑک رہی تھی جوانی مچل رہا تھا شباب
مثالِ چشمۂ صحرا ابل رہا تھا شباب

تمہارا سر مرے زانو کو گدگداتا تھا
تو آسماں مرے قدموں پہ سر جھکاتا تھا

وہ ہونٹوں ہونٹوں میں سرگوشیاں جو ہوتی تھیں
تصورات میں کچھ پھول سے پروتی تھیں

تمہارے گیسوؤں سے کھیلتا تھا ہاتھ مرا
شرابِ بار ہوا دے رہی تھی ساتھ مرا

مگر نظر جو ملی تو چھلک پڑے آنسو
یکایک آنکھوں سے اپنی ڈھلک پڑے آنسو

کسی خیال کی گہرائیوں میں ڈوب گئے
مآلِ عشق کی رسوائیوں میں ڈوب گئے

میں سوچتا تھا جدائی نہ تاکتی ہو ہمیں
خدا کے ساتھ خدائی نہ تاکتی ہو ہمیں

جوانیاں نہ کہیں سسکیوں میں بٹ جائیں
محبتوں کی حسیں ڈوریاں نہ کٹ جائیں

نہیں ملے ابھی جی بھر کے اور بچھڑ جائیں
کہیں سماج کے ہاتھوں نہ ہم اجڑ جائیں

مرے لئے کہیں تو بھی تباہ حال نہ ہو
ذرا سی عمر میں جینا تجھے وبال نہ ہو

وہ رات بیت گئی گذریں اور بھی راتیں
مگر وہ رات عطا کر گئی جو برساتیں

برستی رہتی ہیں آنکھیں مگر وہ رات کہاں
تمہارے چھونے سی جو بات تھی وہ بات کہاں

یہی خیال کہ بدنام تو نہ ہو جائے
مرے لئے کہیں بے آبرو نہ ہو جائے

مجھے وطن کی حسیں وادیوں سے لے آیا
شباب شہر کی آبادیوں سے لے آیا

لہو کے گھونٹ شب و روز پی رہا ہوں میں
یہاں اداس فضاؤں میں جی رہا ہوں میں

ہے دور دور فضاؤں میں غم کا راج یہاں
نظر اٹھا نہیں سکتی مگر سماج یہاں

خزاں نصیب گلستاں میں آ رہی ہے بہار
ہر ایک دل میں بغاوت کے اٹھ رہے ہیں شرار

شہنشہی کا گریباں ہے اور ہاتھ مرے
میں اب اکیلا نہیں اور بھی ہیں ساتھ مرے

مرے گروہ میں مزدور بھی کساں بھی ہیں
حوادثات سے کھیلے ہوئے جواں بھی ہیں

بھڑک رہی ہے مرے دل میں انتقام کی آگ
رگوں میں رینگتے پھرتے ہیں اضطراب کے ناگ

یہ کھانستی ہوئی رسمیں یہ ہانپتا قانون
یہ باغیوں کے ترانوں سے کانپتا قانون

یہ قید و بند یہ تقسیم کار، بوڑھا نظام
ہے جس کے ہاتھ میں مدقوق زندگی کی زمام

اک انقلاب سے دوچار ہونے والا ہے
قضا کی گود میں سر رکھ کے سونے والا ہے

گرے ہوؤں کو اٹھا کر فلک مقام کیا
ہمارے عشق نے وہ لاجواب کام کیا

دُنیا کے تماشے

(از واحدی)

۱۹۱۱ء میں شہنشاہ جارج پنجم نے دلی آکر دربار کیا۔ بے انتہا مخلوق اسے دیکھنے جمع ہوئی۔ ہزاروں قسم کے کھیل تماشے دکھائے گئے۔ حکومت کی طرف سے بھی اور رعایا کی طرف سے بھی۔ دلی کے ایک خاندانی رئیس نے جن کی ریاست کا چراغ اس وقت ٹمٹما رہا تھا اپنی آخری پونجی کا کچھ حصہ اس بازی پر لگا دیا کہ سارے ہندستان کی چیدہ گانے اور ناچنے والیاں بلائیں۔ اور اُن کا گانا اور ناچ بہت بڑا منڈوا بنوا کر کرایا اور ٹکٹ لگا کر روپیہ کمانے کی کوشش کی۔ دلی والے چیخ اُٹھے کہ ایسے رئیس کو کیا ہوگیا۔ اتنی گھٹیا بات کر بیٹھا۔ اس کا کیرکٹر کیسا گر گیا ہے۔ اُس وقت تک دلی کے امراء دو چار طوائفوں کو اپنے گھر یا اپنے باغ میں بُلا کر صرف اپنے یار دوستوں کو گانا سنوایا کرتے تھے۔ یہ بد اخلاقی نہ تھی۔ لیکن اپنے گھر اور باغ کی بجائے بہت بڑے منڈوے میں اور دو چار کی بجائے سو پچاس طوائفوں کا ناچ گانا کرانا اور اُسے یار دوستوں کو مُفت دکھانے کی بجائے ہمہ شما کو روپے لیکر دکھانا معیوب سمجھا گیا۔ اب تینتیس سال کے بعد یہ حال ہے کہ دلی کے کئی خاندانی نوجوان عورت مرد خود تھیٹروں اور سینماؤں میں گاتے اور ایکٹ کرتے ہیں۔ بمبئی، کلکتہ، پونا اور لاہور کے جو مالدار فلم بنانے کا کام کر رہے ہیں۔ اُن کی کامیابیوں سے پریشان ہوکر دلی کے مالداروں کا جی بے چین ہے کہ پُرانے کاروبار چھوڑ کر ایکٹر اور ایکٹریس ڈھونڈتے پھریں اور بمبئی اور کلکتہ کو مات دیدیں۔ لڑائی کے دوران میں ہی یا لڑائی کے فوراً بعد یہاں فلم سازی کا پیشہ ضرور شروع ہو جائیگا۔ فلم سازی کا پیشہ کرنے والوں کو اب بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ فلم سازوں کی وہ عزت ہوتی ہے جو راجہ نوابوں کی نہیں ہوتی۔ فلم ایکٹروں اور ایکٹریسوں کو سورج اور چاند سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ ان کا وجود دُنیا کے لئے سورج اور چاند کی طرح ضروری ہوگیا ہے۔

چھ سات روز سے دلی کے مشہور بازار چاندنی چوک میں کوئی بدنصیب دبلا پتلا بڈھا گھنٹے کے قریب بیٹھا رہتا تھا۔ اسکی ہڈیوں پر گوشت نہیں تھا۔ صرف کھال چڑھی ہوئی تھی۔ اسکے جسم پر کپڑا نہیں تھا۔ دو دھجیاں آگے

اور چاہتا تھا۔ آج [illegible] بھر سکتا تو [illegible] ہے [illegible] تھا۔ میں نے دیکھا [illegible] اس مضمون میں [illegible] ذکر کردیا۔ [illegible] بھی نہیں رہے تھے۔ مکانوں کے اندر [illegible] ہو رہی ہیں اور اُن میں بہت سے اسی حالت کو پہنچ کر مر رہے ہیں جس حالت کو پہنچ کر یہ شخص مرا۔ پھر مکانوں سے باہر بیچ سڑک میں اگر کوئی مر گیا تو کیا عجیب واقعہ ہے۔ ایک موت سے متاثر نہ ہونا کوئی بڑا عیب نہیں ہے۔ لیکن بنگال میں ایسے واقعات روز ہونے لگے اور پے درپے ہونے لگے اور بیشمار ہونے لگے تو ہنگامہ مچ گیا۔ مفلس سے مفلس اور امیر سے امیر انسان میں انسانیت کی آگ بھڑک اٹھی۔ آج کل حکومت اور محکوم سب کا جذبہ یہ ہے کہ بنگال کے بھوکے اُن کے ہم جنس ہیں۔ انہیں جانوروں کی سی موت سے بچانا چاہیئے۔ بنگال کے بھوکوں سے بے اعتنائی برتنا ان دلی والوں کے نزدیک بھی بداخلاقی ہے جو دلی کی سڑک پر مُردہ پڑا دیکھکر اعتنا نہیں کر رہے تھے۔ سارے ملک میں چندے ہو رہے ہیں۔ ملک کا ہر حصہ جو اناج دے سکتا ہے اناج دینے کو تیار ہے۔

ہندستان میں جب سے انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی ہے۔ سوائے اسکے کہ کبھی کبھی ہندو مُسلمان لڑ پڑتے ہیں۔ اور ان کے لڑنے کے زمانہ میں نہ لڑنے والے ہندو مُسلمان بھی اپنے تئیں محفوظ نہیں پاتے۔ اور کسی قسم کا کیلی کا کھٹکا نہیں ہے۔ چوریاں اور ڈاکے بہت کم ہوگئے ہیں۔ جنگل میں سونا اُچھالتے چلے جایئے کوئی نہیں لوٹتا۔ ریل کے ذریعہ کروروں روپے کا مال اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اطمینان سے آتا جاتا ہے۔ بینک میں جمع کرنے اور جائداد میں لگا دینے کے بعد بھی گھر میں دولت رکھی ہے تو آپ پرائیویٹ پہرہ دار مقرر کئے بغیر سو سکتے ہیں۔ اور بے فکر سو سکتے ہیں۔ جس کے پاس جو کچھ ہے وہ اُس کا ہے۔ اُس نے وہ کسی طرح حاصل کیا ہو۔ حاصل کرنے کے دوران میں اگر وہ پکڑے جانے کی حرکتیں کر رہا ہے تو پکڑا جاسکتا ہے۔ لیکن حاصل کرنے کے بعد جو کچھ جس کے پاس ہے وہ اس کا ہے۔ دوسرا اسکی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اُسے حق ہے کہ اچھے سے اچھے مکان میں رہے۔ اُسے حق ہے کہ اچھے سے اچھا پہنے۔ اُسے حق ہے کہ اچھے سے اچھا کھائے۔ اُسے حق ہے کہ اپنے اوپر اور اپنے بیوی بچوں پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کے بعد جتنا چاہے نقد بچا کر رکھے۔ جتنا چاہے اناج کی [illegible] رکھے۔ کوئی بھوکا بھی اُسکے لقمۂ تر کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ کسی کے اندوختہ کو ہاتھ

[illegible] چور کا۔ عذر نہیں سنتا تھا کہ میں نے بھوک سے مجبور ہو کر چوری [illegible] کی تھی۔ یہ عذر نہیں سنتے اور مظلوم بھی یہ عذر نہیں سنتے۔ آدھا پیٹ کھانے والے مظلوم بھی چور کو چور کہتے ہیں اور اسکی سزا سے خوش ہوتے ہیں۔ ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا کا یہ قانون ہے۔ میرا مال میرا ہے۔ میرے وارثوں کا ہے۔ آپ کا مال آپ کا ہے۔ آپ کے وارثوں کا ہے۔ میرے پاس زیادہ دولت ہے تو میں قابل تعریف ہوں۔ قابل عزت ہوں۔ شریف ہوں۔ بڑا آدمی ہوں۔ آپ کے پاس کم دولت ہے تو آپ قصوروار ہیں۔ آپ نے محنت نہ کی ہوگی۔ آپ نے وقت ضائع کیا ہوگا۔ آپ نے روپیہ فضول اڑایا ہوگا۔ اب اگر آپ بھوکے بھی ہیں تو میرا کیا دوش۔ آپ بھوک سے مر بھی جائیں تو مجھے کیا۔

لیکن بنگال کی دنیا آج کل بدل گئی ہے۔ بنگال سے ایسی خبریں تو آتی ہی رہتی تھیں کہ ایک مرا ہوا کوا دیکھ کر کئی آدمی اسے چکھنے کیلئے اٹھانے دوڑے۔ یا کسی جگہ کچھ سڑا ہوا کھانا پڑا تھا اس پر ایک لڑکے اور ایک کتے میں مقابلہ ہو گیا۔ اور کتے نے لڑکے کو زخمی کر دیا۔ لڑکا ہسپتال میں ہے۔ لیکن آج ایسی خبر بھی آگئی جس سے میں نے سمجھا کہ بنگال کی دنیا بدل گئی۔ ڈھاکہ کالج میں کوئی تقریر ہونے والی تھی۔ مقرر صاحب اور جلسہ کے صدر صاحب جلسہ سے پہلے یا بعد ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ایک بھوکا کمرے کے اندر دندناتا گھس گیا اور میز پر سے پیسٹری اور کیک کی پلیٹ لے چلتا بنا۔ یہ حرکت تعزیرات کی کئی دفعات کے ماتحت آسکتی ہے۔ مگر غالباً مجرم کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ شاید کسی نے اسے اس غلط کاری سے روکا بھی نہیں۔ شاید مقرر صاحب اور صدر صاحب جو دونوں یقیناً اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سوچنے اور غور کرنے والے ہونگے، اس چکر میں پڑ گئے کہ پیسٹری اور کیک کی پلیٹ لے بھاگنے کو گناہ قرار دیں یا بنگال کے موجودہ حالات کا خیال کرکے پیسٹری اور کیک کھانے کو۔ حکومت عرصہ سے سارے ہندوستان میں ریشننگ سسٹم جاری کرنے کا ارادہ کر رہی ہے۔ یعنی ہر شخص اپنی ضرورت کے لائق کھانے پینے کا سامان رکھے۔ امیر اور غریب کے معیار میں تو ضرور فرق ہوگا۔ امیر مکھن خریدیگا اور غریب بناسپتی۔ امیر بریانی اور قورمہ کھائیگا اور غریب چٹنی اور روٹی۔ لیکن یہ نہیں ہوگا کہ امیر کے گھر میں مہینے اور برسوں کا سامان بھرا ہے اور غریب جوتی لئے پھرے اور اسے آٹا نہ ملے۔ امیروں اور کھانے پینے کے ذخیروں کے مالکوں کے سامنے بھوکے بنگالیوں نے مرکزی حکومت کے ارادہ ریشننگ کی رفتار تیز کر دی ہے۔ کلکتہ میں سنا ہے گھر گھر یہ تلاش کیا جانے لگا ہے کہ کسی کے ہاں اسکی ضرورت سے زیادہ کھانے پینے کا سامان تو نہیں ہے۔ ضرورت سے زیادہ کھانے پینے کا جو سامان نکلے گا وہ غالباً بھوکوں کو دیدیا جائیگا۔ ممکن ہے آئندہ یہ بھی ہو کہ ضرورت سے زیادہ کسی کے ہاں کپڑا نکلے تو ننگوں کو دے دیا جائے۔ ضرورت سے زیادہ کسی کے ہاں روپیہ نکلے تو غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔ ضرورت سے زیادہ کھانے پینے کا سامان رکھنے والے بنگالی اس زمانہ میں شاید مجرم سمجھے جائیں کیا کبھی ضرورت سے زیادہ کپڑا اور ضرورت سے زیادہ روپیہ رکھنے والے بھی مجرم ہو سکتے ہیں؟ کچھ بعید نہیں، کبھی ایسا زمانہ آجائے۔

دنیا ایک تماشہ گاہ ہے۔ یہاں ایسے تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ سوسائٹی نے آج چوری کو جرم قرار دے رکھا ہے۔ سوسائٹی کل ان باتوں کو جرم قرار دے سکتی ہے۔ جن کی وجہ سے چور جنم لیتا ہے۔ سوسائٹی نے آج انفرادی دولتمندی کو جائز بنا رکھا ہے۔ سوسائٹی کل دولت کا حقدار پوری قوم یا پوری قوم کی حکومت کو بنا سکتی ہے۔ آج جس کام کو جرم کہا جاتا ہے کل اسی کام کا نام ساہوکاری ہو جانا ممکن ہے۔ اور آج جو ساہوکاری ہے وہ کل چوری کہلائی جا سکتی ہے۔

معمولی آدمی فاقہ کرے تو ممکن ہے اسے اقدام خودکشی کا مجرم قرار دے دیا جائے۔ ان لوگوں کو بھی جنہیں پھانسی ملنی ہوتی ہے۔ پھانسی کے وقت سے پہلے اگر وہ کھانا چھوڑ دیتے ہیں تو زبردستی کھانا کھلایا جاتا ہے۔ مگر مہاتما گاندھی جیسا بلکہ پروفیسر بھنسالی جیسا بڑا آدمی اکیس دن کا یا مرن برت رکھے تو وہ مجرم نہیں ہے۔ اور انہیں برت توڑنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر لاتعداد آدمی فاقے کرنے لگیں تو بنگال میں تو بے ارادہ فاقے ہو رہے ہیں۔ لاتعداد آدمیوں کے بالارادہ فاقوں کو بھی جرم نہیں کہا جائیگا۔ ایک فاقہ زدہ کو ہسپتال اپنی چاردیواری میں قدم نہیں رکھنے دیتا۔ لیکن ہزاروں فاقہ زدہ ہوتے ہیں تو کلکتہ کے سب ہسپتال ان کے لئے کھل جاتے ہیں۔ میدانوں میں گھاس لگا کر چلنے پھرنے کے لئے راستے مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ اور گھاس پر چلنے سے روکا جاتا ہے۔ مگر جب لوگ نہیں رکتے اور کسی سمت پگڈنڈی بن جاتی ہے تو پھر اس پگڈنڈی کو پختہ سڑک سے بدل دیا جاتا ہے۔

کیا کہوں اے ہم نشیں کیوں آج میں خاموش ہوں
یوں نہ تھا بکھرا ہوا شیرازۂ رنگِ حیات
یوں نہ تھا پیشِ نظر کالی بلاؤں کا ہجوم
یوں نہ تھا دوشِ صبا پر کاروانِ زندگی
یوں نہ تھی بربادیوں کی زد میں دل کی کائنات
یوں نہ تھیں مغموم خوابیدہ تمنائیں مری
یوں نہ تھی میری بہارِ نوجوانی بے قرار
یوں نہ تھے ہر سمت سائے موت کے چھائے ہوئے
یوں نہ تھے ڈوبے ہوئے سازوں کے نغمے سوز میں
یوں نہ تھے آنکھوں کی لرزش میں فسانے درد کے
نغمہ ہائے رُوح کی سرگوشیاں تھیں ــــ اور میں
ظلمت عشرت میں یوں نور سحر تھا ــــ اور میں
رات تھی، وہ سامنے تھے، خاموشی تھی ــــ اور میں
موت نے لیکن مرا دامن الم سے بھر دیا
اب دلِ صد چاک ہے مایوسیاں ہیں ــــ اور میں

کیا بتاؤں کس لئے بیتاب ہوں غم کوش ہوں
یوں نہ تھا سمٹا ہوا دامانِ بزمِ کائنات
یوں نہ تھا اُمید کے گلشن میں طوفانِ سموم
یوں نہ تھا بجلی کی زد میں آشیانِ زندگی
یوں نہ تھی بھٹکی ہوئی ہر سمت رفتارِ حیات
یوں نہ تھیں سہمی ہوئی آہیں دلِ بیتاب کی
یوں نہ تھیں گزری ہوئی راتیں سراپا سوگوار
یوں نہ تھے ظلمت کے بادل جھوم کر آئے ہوئے
یوں نہ تھے حسرت کے کانٹے قلبِ غم اندوز میں
یوں نہ تھے سانسوں کی جنبش میں ترانے درد کے
زندگی تھی زندگی کی مستیاں تھیں ــــ اور میں
جیسے کلیوں میں اک اندازِ دگر تھا ــــ اور میں
زیرِ لب بہکی ہوئی سی اک ہنسی تھی ــــ اور میں
اِس خزاں نے میرا گلشن نذرِ صرصر کر دیا
کیا بتاؤں کس قدر بربادیاں ہیں ــــ اور میں

میرے اِن خاموش ہونٹوں سے ہنسی ہے دُور دُور
زندگی کی ہر خوشی سے زندگی ہے دُور دُور

انتخاب السلف (مسلسل)

سلسلہ کیلئے "ادیب" ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء ملاحظہ فرمائیے

از

علامہ سیماب اکبرآبادی

میر تقی میر اکبرآبادی نور اللہ مرقدہ

(۵)

انتخابِ کلامِ میر

دیوانِ اوّل

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر — ورنہ میں وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں
دیکھا ہے مجھے جس نے وہ دیوانہ ہے میرا — میں باعثِ آشفتگیِ طبعِ جہاں ہوں
تکلیف نہ دے آہ مجھے جنبشِ لب کی — میں، صد سخن آغشتہ بخوں، زیرِ زباں ہوں
رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں — درپے نہ ہو۔ اسوقت خدا جانے کہاں ہوں
اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم — اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد — ہمیں آکے اس کے قدم دیکھتے ہیں
وفا پیشگی قیس تک تھی بھی کچھ کچھ — اب اس طور کے لوگ کم دیکھتے ہیں

اے عدم جانے والو! تم تو چلو — ہم بھی اب کوئی دم میں آتے ہیں

مُنہ میں گُل اور رنگِ گُل دونوں بھری گلشن میں اے نسیم — لیکن بقدرِ یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں

کم نہیں ہے دلِ پُر داغ بھی اے مرغِ اسیر — گُل میں کیا ہے، جو ہوا ہے تو گرفتارِ چمن

مجھکو دماغِ گریہ و گُل کا نہیں سوائے ناصح — وہی ہوں میں کہ جسکو عافیت بیزار کہتے ہیں

چھوٹنا ممکن نہیں اپنا قفس کی قید سے — مرغِ شیر آہنگ کو کوئی رہا کرتا نہیں

عاشق ہے یا مریض ہے پوچھو تو میرسے — پاتا ہوں زرد رو روز بروز اس جوان کو میں

منظور ہے کب سے سرِ شوریدہ کا دینا — چڑھ جائے نظر کوئی تو یہ بوجھ اتاریں

آہ اور اشک ہی سدا ہے یہاں — روز برسات کی ہوا ہے یہاں
جس جگہ ہو زمین تفتہ سمجھ — کہ کوئی دل جلا گڑا ہے یہاں

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں — یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

دن نہیں، رات نہیں، صبح نہیں، شام نہیں — وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں

کروں کیونکر انکارِ عشق، آہ میں — یہ رونا بھلا کیا ہے گر کچھ نہیں

ایک سب آگ، ایک سب پانی — دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں
آگے دریا تھے دیدۂ ترِ میر — اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

تجھے گر چشمِ عبرت ہے تو آندھی اور بگولے سے — تماشا کر غبار افشانیِ خاکِ عزیزاں کو
زبانِ نوحہ گر ہوں میں قضانے کیا ملایا تھا — مری طینت میں یارب ہوویں دلہائے نالاں کو

نامرادانہ زیست کرتا تھا — میر کا طور یاد ہے ہم کو

ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہی سے — اگر نصیب ترے کوچہ کی گدائی ہو

تا چند کوچہ گردی، جیسے صبا زمیں پر — اے آہِ صبح گاہی، آشوبِ آسماں ہو
از خویش رفتہ ہر دم رہتے ہیں ہم جو اس بن — کہتے ہیں لوگ اکثر، اسوقت تم کہاں ہو

ہر خراشِ جبیں جراحت ہے — ناخنِ شوق کا ہنر دیکھو

[illegible] نسیم [illegible]   نکلے تھا جہاں میں [illegible]
کس کس [illegible] خاک میں   جاتی ہے پھر نسیم اُسی رہگذار کو

گلچین عیش ہوتے ہم بھی چمن میں جا کر   آہ وفغاں سے اپنی لیکن فراغ کس کو

سجدے کا کیا مضائقہ محراب تیغ میں   پر یہ تو ہو کہ نقش یہ میری نماز ہو

ہائے اس زخمی شمشیر محبت کا جگر   درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو
گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میر   اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

دل صاف ہو تو جلوہ گہ یار کیوں نہ ہو   آئینہ ہو تو قابل دیدار کیوں نہ ہو

اب تو نقاب منہ پہ لے ظالم کہ شب ہوئی   شرمندہ سامنے دن تو کیا آفتاب کو
کہنے سے میر اور بھی ہوتا ہے مضطرب   سمجھاؤں کب تک اس دل خانہ خراب کو

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم   اب جو ہیں خاک، انتہا ہے یہ
شکر اُسکی جفا کا ہو نہ سکا   دل سے اپنے ہمیں گلا ہے یہ

اب حال اپنا، اُس کے ہے دلخواہ   کیا پوچھتے ہو، الحمدللہ
پیر مغاں سے بے اعتقادی   استغفراللہ، استغفراللہ

کس گنہ کا ہے تڑپیں مرگ یہ عذر جانسوز   پانوں پر شمع کے پاتے ہیں سر پروانہ

کاش اے جان المناک نکل جائے تو   اب تو دیکھا نہیں جاتا یہ ستم ہم سے بھی
آہ! ہر غیر سے تا چند کہوں جی کی بات   عشق کا راز تو کہتے نہیں محرم سے بھی

دل کس قدر شکستہ ہوا تھا کہ رات میر   آئی جو بات لب پہ وہ فریاد ہو گئی

اُس کے ایفائے عہد تک نہ جئے   عمر نے ہم سے بیوفائی کی
وصل کے دن کی آرزو ہی رہی   شب نہ آخر ہوئی جدائی کی

[illegible] جان سے [illegible]   [illegible]

واہ اے عشق [illegible]   [illegible]

جنگل بھرے تمہارے رونے سے نہیں بھرے   [illegible]

ہوئی سامنے یوں تو ایک ایک کے   ہمیں سے وہ [illegible]

کچھ موج ہوا پیچاں، اے میر نظر آئی   شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
دلی کے نہ تھے کوچے، اوراق مصور تھے   جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

یک بیاباں برنگ صوت جرس   مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی

تپ مردہ اس قدر ہیں کہ ہے شبہ ہمکو میر   تن میں ہمارے جان کبھی تھی بھی یا نہ تھی

کیا کروں شرح خستہ جانی کی   میں نے مر مر کے زندگانی کی
حال بد گفتنی نہیں میرا   تم نے پوچھا تو مہربانی کی

کتنے دل سوختہ ہم جمع ہیں اے غیرت شمع   کر قدم رنجہ، کہ مجلس ہے یہ پروانوں کی

رہی نہ گفتہ، مرے دل میں داستاں میری   نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
برنگ صوت جرس تجھ سے دور ہوں تنہا   خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری
اُسی سے دور رہا، اصل مدعا جو تھا   گئی یہ عمر عزیز آہ رائیگاں میری
ترے فراق میں، جیسے خیال مفلس کا   گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

اب کے بھی سیر باغ کی جی میں ہوس رہی   اپنی جگہ، بہار میں، کنج قفس رہی
جوں صبح اس چمن میں نہ ہم کھل کے ہنس سکے   فرصت رہی جو میر تو بس اک نفس رہی

آن میں کچھ ہیں، آن میں کچھ ہیں   تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
منع گریہ نہ کر تو اے ناصح   اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

[illegible] آوارہ چمن میں   گلی ہو کس کی جو ہو پامالِ تمنّا کی

گردشِ نگاہِ مست کی موقوف ساقیا   مسجد ہی شیخ جی کی خرابات ہو گئی

کوئی پھر ہم سے شوخی ترا تو میں پوچھوں   کہ بزمِ عیشِ جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

ہمیں تو باغ کی تکلیف سے معاف رکھو   کہ سیر و گشت نہیں رسمِ اہلِ ماتم کی
[illegible] صد و الم میں فراق کے ایسے   کہ صبحِ عید یہاں شام ہے محرّم کی

صد حسرت زیرِ خاک تہِ دل[1] لے چلے گئے   مہلت نہ دی اجل نے ہمیں ایک بات کی

کیونکر بجھاؤں آتشِ سوزانِ عشق کو   اب تو یہ آگ دل سے جگر کو بھی جا لگی

جائے گل اس چمن میں چھوڑ گیا نہ ہم سے   سر پہ ہمارے اب کے منّت ہے بے پری کی
یہ دور تو موافق ہوتا نہیں مگر اب   رکھیے بنائے تازہ اس چرخِ چنبری کی

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے   یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
خانۂ دل سے زینہار نہ جا   کوئی ایسے مکاں سے اٹھتا ہے
نالہ سر کھینچتا ہے جب میرا   شور اک آسماں سے اٹھتا ہے
بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو   جو ترے آستاں سے اٹھتا ہے
یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم   جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

شہادت گاہ ہے باغِ زمانہ   کہ ہر گل اس میں اک خونیں کفن ہے
کروں کیا حسرتِ گل کو وگرنہ   دلِ پُر داغ میں اپنا چمن ہے

فرصت میں یک نفس کی کیا دردِ دل سنو گے   آئے تو تم ولیکن وقتِ اخیر آئے

سوزش گئی نہ دل کی رونے سے روز و شب کے   جلتا ہوں اور دریا بہتے ہیں چشمِ نم سے

بات احتیاط سے کر، ضائع نہ کر نفس کو   بالیدگی دل ہے مانندِ شیشہ دم سے[2]
ہستی میں ہم نے آ کر آسودگی نہ دیکھی   کھلتیں نہ کاش آنکھیں خوابِ خوشِ عدم سے
پامال کر کے ہم کو پچھتاؤ گے بہت تم   کمیاب ہیں جہاں میں سر دینے والے ہم سے

نہیں اے ہمنفس اب جی میں طاقت شورِ بلبل کی
جگر ٹکڑے ہوا جاتا ہے آخر شب کے نالوں سے

نہیں خالی اثر سے تصفیہ دل کا محبت میں
کہ آئینہ کو ربطِ خاص ہے صاحب جمالوں سے

گئے جی سے چھوٹے بتوں کی جفا سے   یہی بات ہم چاہتے تھے خدا سے
وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں   مرے یا جیے کوئی اس کی بلا سے

طبیبِ سبک عقل ہرگز نہ سمجھا   ہوا دردِ عشق آہ دونا دوا سے
نہ شکوہ شکایت، نہ حرف و حکایت   کہو میر جی آج کیوں ہو خفا سے

مطلق اثر نہ اس کے دلِ نرم میں کیا   ہر چند نالہ ہائے حزیں عرش تک گئے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو   وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے
الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش   ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

تری آہ کس سے خبر پائیے   وہی بے خبر ہے جو آگاہ ہے

جہاں سے تو رختِ اقامت کو باندھو   یہ منزل نہیں بے خبر راہ ہے

قابلِ آغوشِ ستم دیدگاں   اشک سا پاکیزہ گہر چاہیے
حال یہ پہنچا ہے کہ اب ضعف سے   اٹھتے پلک ایک پہر چاہیے
کم ہیں شناسائے زرِ داغِ دل   اس کے پرکھنے کو نظر چاہیے
شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں   عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

---

[1] اکثر نسخوں میں بجائے "لب" کے "دل" ہے۔ مگر "تہِ دل" سے کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں [illegible] صاحب نے "لب" ہی لکھا ہوگا۔ کثرتِ نقل سے "دل" بن گیا۔ سیماب

[2] یعنی جس طرح [illegible] شیشہ [illegible] اسی طرح سانس سے دل بالیدہ ہوتا ہے۔ سیماب

[illegible] رہے۔ سیماب

ایک ہستی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز — اسی خانہ خراب کی سی ہے

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اب جو اک حسرتِ جوانی ہے — عمرِ رفتہ کی یہ نشانی ہے
خاک تھی موجزن جہاں میں، اور — ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے

نہ کھلے گل اے کاش یک چند — ابھی زخمِ جگر سارے ہیں آئے

دل کے معمورے کی مت کر فکر، فرصت چاہیے
ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہیے
عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو
قرب و بعد اس جا برابر ہے، محبت چاہیے

سینے یاں شہر دل کا ویران ہو رہا ہے — دکھلائی دے جہاں تک، میدان ہو رہا ہے

سر جائے گا ولیکن آنکھیں ادھر ہی ہوں گی
کیا تیری تیغ سے ہم قطع نظر کریں گے
اپنے ہی جی میں آخر انصاف کر کہ کب تک؟
تو یہ ستم کرے گا ہم درگذر کریں گے

وہ دن گئے کہ اٹھ کر جاتے تھے اس گلی میں
اب سعی چاہیے ہے بالیں سے سر اٹھاتے
شاید کہ خون دل کا پہنچا ہے وقت آخر
تھم جاتے ہیں کچھ آنسو راتوں کو آتے آتے

ترسے دل جلے کو رکھا جس گھڑی — دھواں سا اٹھا کچھ لب گور سے

[illegible] — [illegible]
کچھ نہیں ہے شیخ [illegible] سرکشی — سایۂ دیوار ہو جا [illegible]

دیکھی نہ ایک چشمک گل بھی چمن میں آہ
ہم آخرِ بہار قفس سے رہا ہوئے

رنج کھینچے تھے، داغ کھائے تھے — دل نے صدمے بڑے اٹھائے تھے
پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

وقتِ خوش دیکھا نہ اک دم سے زیادہ دہر میں
خندۂ صبحِ چمن پر مثلِ شبنم رو گئے

کس نے لی رخصتِ پرواز پس از مرگِ نسیم
مشت پر باغ میں آتے ہی پریشان ہوئے

عشق وہ ہے کہ جو تھے خلوتیِ منزلِ قدس — وہ بھی رسوائے سرِ کوچہ و بازار ہوئے
سیرِ گلزار مبارک ہو، صبا کو، ہم تو — ایک پرواز نہ کی تھی کہ گرفتار ہوئے
وعدۂ حشر تھا موہوم، نہ سمجھے ہم آہ — کس توقع پہ ترے طالبِ دیدار ہوئے

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے — اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

جبکہ پہلو سے یار اٹھتا ہے — درد بے اختیار اٹھتا ہے
اب تلک بھی مزارِ مجنوں سے — ناتواں اک غبار اٹھتا ہے

جب تک کڑی اٹھائی گئی ہم کڑے رہے — ایک ایک سخت بات پہ برسوں اڑے رہے
اب کیا کریں نہ صبر ہے دل کو، نہ جی میں تاب — کل اس گلی میں آٹھ پہر غش پڑے رہے

پابرہنہ، خاک سر میں، مو پریشاں، سینہ چاک — حال میرا دیکھنے کو تیرے ہی دلخواہ ہے

کہتے ہیں گور میں بھی ہیں تین روز بھاری — جانیں کہ میر [illegible]
کل ایک قطرہ چھوڑی، طوفانِ نوح آیا — [illegible] میر کے ہر پلک کے

ے میخانہ

[illegible]   ہمارے چہرے کے آگے ہی گیا رنگ تھا آگے

کہتے ہیں کہ وہ جیتے ہیں سال ہم تو میر   اس چار دن کی زیست میں بیزار ہو گئے

شور افشاں اگر ایسی ہی رہی آہ تو میر   گھر کو ہم اپنے کسی رات جلا بیٹھیں گے

بے ٹھکانے میں شہر میں سبحان اللہ   دشت میں قیس ہے، کوہ میں فرہاد ہے

اے ہم صفیر کس کو بے گل دماغ نالہ   مدت ہوئی ہماری منقار زیر پر ہے
شمع اخیر شب ہوں سن سرگذشت میری   پھر صبح ہوتے تک تو قصہ ہی مختصر ہے
بردہ دم کو اپنے رکھو احتیاط سے یاں   یہ کارگاہ ساری، دکان شیشہ گر ہے
تیری گلی سے بجکر کیوں مہر و مہ نہ نکلیں   ہر کوئی جانتا ہے اس راہ میں خطر ہے

اب جان جسم خاک سے تنگ آگئی بہت   کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئے

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے   زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج   گرا گر یہ شیشہ، تو پھر چور ہے
کہیں جو تسلی ہوا ہو یہ دل   وہی بے قراری بدستور ہے
بہت سعی کیجے تو مر رہئے میر   بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

جنوں ان شور شوں پر، ہاتھ کی چالاکیاں ایسی   میں ضامن ہوں اگر ثابت بدن سے پیرہن نکلے

میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے   جان ہے تو جہان ہے پیارے

شوق تھا جو یار کے کوچہ ہمیں لایا تھا میر   پانوں میں طاقت کہاں اتنی کہ اب گھر جائیے

غالب کہ یہ دل خستہ شب ہجر میں مر جائے   یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گذر جائے
رت بیٹھے بہت عشق کے آزردہ دلوں میں   نالہ کسی مظلوم کا تاثیر نہ کر جائے

اے شب ہجر راست کہہ تجھ کو   بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے ؟

(باقی باقی)

چھیڑ چھاڑ

جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی۔ ہوم منسٹر کشمیر

شاید ہو یاد تم کو، اک دن تھے ہم سفر ہم
ہر چند باخبر تھے، لیکن تھے بے خبر ہم
صحرا میں شب نے اپنا جس وقت خیمہ تانا
کیا رات تھی سہانی، کیسا سماں سہانا
میں نے کہا یہ تم سے، اب تو کرم ہے لازم
اک خستہ و حزیں پر رحم، آہ رحم، ظالم
رابطہ اٹھ چکا ہے کب کا آرام اور خوشی سے
اچھی ہے موت ایسی ناکام زندگی سے
مغموم و دل شکستہ، بیکس، اسیر حرماں
منہ جس طرف بھی پھیروں، ہوتا ہے "تیر باراں"....
دنداں نما ہنسی سے، یا برق کی چمک سے
عارض کی یا چمک سے، مژگاں کی یا جھپک سے
پردا اٹھا چاک شب کا، چھٹکے ہوئے تھے تارے
(قطرے عرق کے رخ پر، بڑھ چڑھ کے ان سے پیارے)

شاید ہو یاد تم کو......؟
اور کس نے یہ کہا تھا ؟
"رہتی ہو دل میں میرے ہر لحظہ ہر گھڑی تم
میں جس طرف بھی دیکھوں، ہو سامنے کھڑی تم"
کافی اسی کو سمجھو! دیکھو! زباں نہ بدلو
توبہ ہے، بِچلے بیٹھو، آنچل تو میرا چھوڑ دو
ہلے پاس سے تو سرکو....
اپنی ڈھٹائی دیکھو!
منشا نہ تھا یہ اصلا ؟ مجھ کو ہوا بھلاوا
یہ دھاندلی صریحاً تم کو نہیں ہے زیبا
میں کہہ رہی ہوں جو کچھ تم نے ہی تو کہا تھا
اور اب مکر رہے ہو !....
ان سے کبھی جو بولوں
یا جھوٹوں بات پوچھوں
جو چور کی سزا ہے
میری وہی سزا ہے
اے واہ اچھے آئے، یہ کون ہے قرینا
جب دیکھو چھیڑ دینا، اور اُدبدا کے کہنا
"شاید ہو یاد تم کو...."

نقد و نظر

از فصیح الدین احمد ایم اے

نئی کتابیں

غمزۂ شوق جی سے حسن عشق کی بیخودی نہ دیکھ

عشق ہے بے نیاز ہوش اس کی یہ بے بسی نہ دیکھ

ذوقِ الم کا واسطہ لطفِ ستم اُٹھائے جا

اپنے جہانِ عشق میں پیار کی چاندنی نہ دیکھ

منزلِ عشق ہی بقا منزلِ عقل ہے فنا

منزلِ عشق سے گذر عقل کی رہ کبھی نہ دیکھ

عشق بلند بام کا شیوۂ طور دیکھکر

حسنِ کرشمہ ساز کا شیوۂ سامری نہ دیکھ

لذتِ درد کی قسم عشق اسی کا نام ہے

حسن سے دل لگا کے پھر اسکی طرف کبھی نہ دیکھ

سازِ خراب ہو تو ہو اس کی نوا پہ کان دھر

دل کی صدا پہ سر کو دھن دل کی شکستگی نہ دیکھ

(۲) کفر و ایمان

از بہزاد لکھنوی

شائع کردہ اُردو اکیڈمی لاہور۔

یہ مجموعہ نعتوں، غزلوں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔ جو ایک ایسے شاعر کا نتیجہ فکر ہے۔ جس نے اس باب میں مخصوص شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی ہے۔

بہزاد صاحب کی شہرت اور مقبولیت میں ریڈیو، مشاعروں اور گانے والوں کا بھی کافی دخل ہے۔ ان کی نعتوں میں خلوص ہے۔ غزلیں بہزاد صاحب کا خاص کارنامہ ہیں۔ ان میں زبان بھی سادہ ہے اور مضامین بھی سادہ۔ گیتوں میں ترنم و آہنگ موجود ہے۔

ان کی بعض نعتیں اور غزلیں ہندستان بھر میں مشہور ہو چکی ہیں۔ دہلی کے رہائش کے زمانے میں یہاں بہت مقبول تھے۔ کوئی مشاعرہ ان کے بغیر مکمل تصور نہ ہوتا تھا۔ بہزاد صاحب کے کلام میں ایک خاص پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ جو ان کی خصوصیت بن گئی ہے۔

---

(۳) زنجیریں

از محمد امین شرقپوری

شائع کردہ شمع بک ڈپو۔ دہلی قیمت دو روپے

ہمارے ادب میں کچھ عرصے سے افسانوں کا وہ طوفان اُمنڈ پڑا ہے کہ اچھے اور بُرے افسانوں، اچھے اور بُرے افسانہ نگاروں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ امین شرقپوری صاحب ایک نوجوان ادیب ہیں۔ اور انہوں نے بھی اپنے لئے اسی صنف کو منتخب کیا ہے۔ ان کے افسانے ملک کے متعدد رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ اس سے قبل وہ ایک مجموعہ "پتنگے" کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ جو کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ زیر نظر مجموعہ "زنجیریں" سترہ افسانوں پر مشتمل ہے

حسن و عشق

جناب معین الدین تمنا گردیزی

نذرِ شوق ہی سے حسنِ عشق کی بیخودی نہ دیکھ
عشق ہے بے نیاز ہوش اسکی یہ بے بسی نہ دیکھ

ذوقِ الم کا واسطہ لطفِ ستم اٹھائے جا
اپنے جہانِ عشق میں پیار کی چاندنی نہ دیکھ

منزلِ عشق ہے بقا منزلِ عقل ہے فنا
منزلِ عشق سے گذر عقل کی رہ کبھی نہ دیکھ

عشق بلند بام کا شیوۂ طور دیکھکر
حسن کرشمہ ساز کا شیوۂ ساحری نہ دیکھ

لذتِ درد کی قسم عشق اسی کا نام ہے
حسن سے دل لگا کے پھر اسکی طرف کبھی نہ دیکھ

سازِ خراب ہو تو ہو اس کی نوا پہ کان دھر
دل کی صدا پہ سر کو دھن دل کی شکستگی نہ دیکھ

حسن ہزار دلکشی عشق ہزار سادگی
عشق کی سادگی پہ مر حسن کی دلکشی نہ دیکھ

وجدان بہار

جناب معین الدین تمنا گردیزی

اُف یہ فطرت کی چمن آرائیاں میرے لئے
گھری گھری شرمگیں پرچھائیاں میرے لئے

یہ ہواؤں کا ترنم اور یہ پرندوں کا سرود
بج رہی ہیں ہر طرف شہنائیاں میرے لئے

اک فضائے مست نے کھولے ہیں رنگینی کے راز
ہو رہی ہیں سب کرمفرمائیاں میرے لئے

چھڑ رہی ہے لے بہاروں کی ہوا کے ساز پر
چل رہی ہیں جھومتی پروائیاں میرے لئے

ذرہ ذرہ دے رہا ہے درسِ کیفِ زندگی
راس آئیں گی مری تنہائیاں میرے لئے

کانپتی ہیں سبز ڈالیں اور بیلیں ، یا کہیں
لے رہی ہے فصلِ گل انگڑائیاں میرے لئے

بھیگی بھیگی سی فضاؤں کا تبسم الاماں !
وقف ہیں ساون کی یہ رعنائیاں میرے لئے

ایک احساسِ مسرت سے ہے میری زندگی
میں بہاروں میں ہوں گم اللہ ری یہ بے خودی

ابھی جینے دو کچھ دن اور مجھ کو

(از تحریر نجمہ انوار ... بی اے)

یہ دلکش وادیاں یہ جوئباریں
یہ سبزہ اور بارش کی پھواریں
یہ شمشاد و صنوبر کی قطاریں
یہ خود رو پھول، یہ بن کی بہاریں
گلِ لالہ کی یہ رنگیں ادائیں
یہ کالی کالی ساون کی گھٹائیں

میں سب کچھ چھوڑ دوں کیسے یہ سوچو
ابھی جینے دو کچھ دن اور مجھ کو

گلستاں میں یہ پھولوں کی ادائیں
یہ مدہوشی یہ کیف آور فضائیں
یہ نرگس کی پُر افسوں چشمِ حیراں
چمن میں زلفِ سنبل کی پریشاں
کلی کی نرم و نازک مسکراہٹ
شگوفوں کی یہ ہر سو کھلکھلاہٹ

میں سب کچھ چھوڑ دوں کیسے یہ سوچو
ابھی جینے دو کچھ دن اور مجھ کو

سحر کے وقت یہ شبنم کے موتی
یہ نکہت آفریں لہریں ہوا کی
یہ رنگیں اور حسیں سورج کی کرنیں
جو کرتی ہیں ضیا پاشی چمن میں
فضاؤں پہ نکھار آیا ہوا ہے
نشہ سا ہر طرف چھایا ہوا ہے

میں سب کچھ چھوڑ دوں کیسے یہ سوچو
ابھی جینے دو کچھ دن اور مجھ کو

یہ تاروں سے سجی شب کی جوانی
سناتی ہے جو گیت اور کہانی

ایک عجیب جوڑا

(از محترمہ صالحہ ماہ جبین۔ ادیب فاضل)

میری دوست ساوتری کے شوہر ڈاکٹر کیلاش شہر سے سات آٹھ میل کے فاصلہ پر جو ٹی بی ہسپتال تھا اسکے انچارج ہو کر چند مہینے ہوئے آئے تھے بہت دن سے ساوتری سے ملنے جانے کا ارادہ کر رہی تھی۔ جو خدا خدا کر کے آج پورا ہوا۔ خوب کھلی ہوئی ہوادار جگہ میں ایک طرف ٹیلے سے احاطہ کے اندر سرخ رنگ کی اسپتال کی عمارت تھی اور آس پاس چند بنگلے۔ سب سے بڑے بنگلے کے سامنے جا کر میرا تانگہ رکا۔ اطلاع ملتے ہی ساوتری میری پیشوائی کو باہر نکل آئی اور دوڑ کر میرے گلے سے لپٹ گئی۔ وہ اب بھی اسکول کی وہی الھڑ اور شریر لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

میں اندر داخل ہوئی تو دیکھا کہ کمرے میں تین عورتیں اور بیٹھی ہیں۔ ایک سفید کپڑوں میں ہے جسکی عمر ۳۵، ۴۰ کے درمیان ہوگی۔ وضع سے بیوہ معلوم ہوتی ہے۔ دوسری رنگین کپڑے اور چوڑیاں پہنے ہے کوئی ۲۵ کے قریب عمر ہوگی۔ اور تیسری ایک نوجوان لڑکی بمشکل سے سترہ اٹھارہ کا سن ہوگا۔ سانولا رنگ جس میں ہلکی ہلکی سرخی کی جھلک، بڑی بڑی خواب آلود آنکھیں اور لمبی لمبی سیاہ پلکیں۔ چہرہ سادہ مگر اور بھرا بھرا ڈیل۔ ہاتھوں میں لال سبز چوڑیاں اور مہندی، کانوں میں بالیاں۔ ناک میں کیل اور انگلیوں میں چاندی کے گھونگھرو دار چھلے۔ بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی۔ گود میں ایک چھوٹا سا کمزور بچہ پڑا سو رہا تھا۔ تینوں عورتیں سخت پریشان اور بدحواس معلوم ہوتی تھیں۔ بیوہ عورت ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ دوسری بھی غمگین تھی اور نوجوان دلہن بت کی طرح ساکت اور خاموش بیٹھی تھی۔ لیکن اسکی آنکھوں سے اس وحشی ہرنی کی سی وحشت ٹپک رہی تھی جو کہیں جائے پناہ ڈھونڈھتی ہو۔ میں کمرے کا یہ سین دیکھکر گھبرا گئی۔ اللہ یہ کون ہیں ان پر کیا بپتا پڑی ہے۔ خیر ہم دونوں بھی وہیں بیٹھ گئے۔ ساوتری ان عورتوں کو تسلی دینے کی کوشش کرنے لگی۔ "ایشور پر بھروسہ رکھئے۔ وہ اچھا کرنے والا [illegible] محسن صاحب اچھے ہو جائیں گے"۔ بیوہ عورت (جو بعد میں معلوم ہوا محسن کی [illegible] نے ہچکیاں لیکر روتے ہوئے کہا۔ "بہن [illegible]

[illegible] تو وہ بولی بھی نہیں سکتی [illegible] اسے [illegible] پوری طرح [illegible] دلہن اور بچے کو دیکھ کر بے اختیار اسکی آنکھوں سے [illegible]

دلہن کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ پر دلہن اب تک حیرانی اور وحشت سے سب کا منہ تک رہی تھی اور بار بار اسکی نظریں اپنے ننھے سے بچے پر جم جاتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ان لوگوں کا تانگہ آگیا۔ عورتوں کا جانے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر اسپتال کے قانون سے مجبور تھیں کہ رات کو وہاں رہنے کی اجازت نہیں لہذا۔ بچاری بادل پر دھکا پیتی لرزتی اور روتی ہوئی تانگے پر سوار ہو کر شہر چلی گئیں۔

میں اس قدر متاثر تھی کہ کچھ دیر تک تو بات ہی نہیں کر سکی۔ آخر ساوتری سے پوچھا۔ "ساوتری ان بچاریوں کا کون عزیز بیمار ہے؟"

ساوتری نے کہا۔ "کیا کہوں نسیم ان کا حال بڑا پُر درد ہے۔ ایک شخص محسن تین مہینے سے یہاں اسپتال میں ہے۔ مرض آخری درجے پر پہنچ کر لاعلاج ہو چکا ہے۔ یہ تینوں ان کی بہن۔ بھاوج اور بیوی تھیں۔ بچارے کی حالت کئی روز سے زیادہ خراب ہے۔ یہ اکثر مریض کو دیکھنے آتی ہیں۔ تانگہ وغیرہ ملنے میں دقت ہو تو یہاں آجاتی ہیں"۔

اتنے میں ساوتری کا چار سالہ بچہ کرشن آگیا۔ میں نے اُسے گود میں لیکر پیار کیا۔ اور اس سے باتیں کرنے لگی وہ مینا کی طرح چہکتا تھا۔ میں اور ساوتری اسکی بھولی بھولی پیاری پیاری باتوں میں محسن کا قصہ بھول گئے۔ کھانا کھانے کے بعد پھر باتیں چھڑ گئیں۔ میں نے کہا۔ "ساوتری تیرا ہی دل ہے کہ اس وحشتناک اُجاڑ جگہ میں اکیلی رہتی ہے۔ میں تو ہفتے بھر میں پاگل ہو جاؤں"!

ساوتری مسکرائی۔ "نسیم! تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے۔ تم سمجھتی ہو زندگی بس وہی ہے جو شہر کے شور و شغب، دلچسپیوں، سیر و تفریح اور دوستوں سے ملنے ملانے میں بسر ہو۔ پر میرا خیال یہ نہیں۔ میں سمجھتی ہوں انسان دل لگانا چاہے تو جنگل بیابان میں بھی اکیلا خوشی اور اطمینان سے رہ سکتا ہے۔ اور پھر جب اپنا پتی اور بچہ ساتھ ہو تو واقعی جنگل میں منگل ہو سکتا ہے۔ اکیلی کیسے ہوئی جب میری زندگی کے دو انمول رتن میرے ساتھ ہیں"!

میں ہنسنے لگی۔ "وہی پرانی منطق۔ چلو خیر تمہیں اپنی خواہش کے مطابق رہنے کو جنگل مل گیا۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر تم سارے دن کرتی کیا ہو۔؟"

بولی۔ "میں نے بھی اپنا ایک شغل نکال لیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ مجھے ہمیشہ سے مریضوں سے دلچسپی ہے (مسکرا کر) تبھی تو میں نے ایک ڈاکٹر سے بیاہ

[illegible] ہم ہیں لیتے ہی ۔"

ساوتری نے جواب دیا: "بے شک غریب طبقے کی عورتیں تو اپنے مردوں کے برابر بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی کام کرتی ہیں۔ لیکن سب سے ابتر حالت تو اس متوسط طبقے کی ہے۔ گھر میں سے دو ایک عورتیں ضرور کام کرتی اور مرتی کھپتی رہتی ہیں۔ لیکن باقی سب ہاتھ پاؤں چلانے، ایک دوسرے کی برائی غیبت کرنے اور لڑنے جھگڑنے کے اور کیا کرتی ہیں۔ بجائے اسکے اگر وہ اپنا وقت کسی مفید شغل میں صرف کریں تو نہ صرف ان کی صحت کیلئے ہی اچھا ہے اور آمدنی میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا: "ساوتری! یہ تو تم سچ کہتی ہو۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ایک تو گھر بیٹھنے والی عورتوں کیلئے بہت کم کام ایسے ہیں جن سے واقعی کچھ آمدنی ہو سکتی ہو۔ سلائی کڑھائی دستکاری کرنا اور بات ہے۔ اور ضرورتاً اور جب آدمی ایک کام محنت اور شوق سے کرے اور وہ فروخت نہ ہو سکے اس سے کچھ ملے نہیں تو دل ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر برادری والوں کے طعن و اعتراض۔ بولیاں ٹھولیاں۔ دل میں زخم ڈال دیتی ہیں۔ دوسری طرف مردوں کی غیرت کو فوراً ٹھیس لگ جاتی ہے کہ عورت کی کمائی کھائیں۔ ناک نہ کٹ جائیگی ——— ؟"

ساوتری بولی: "جی ہاں ناک نہ کٹے۔ چاہے جان جاتی رہے۔ یہ خود ساختہ جھوٹی شرافت اور احمقانہ غیرت اور زیادہ عورتوں کو پست ہمت کر دیتی ہے۔ کسی میں احساس اور شوق ہو بھی تو مرد اس شوق کو پنپنے نہیں دیتے۔ آخر کار ان کو یہ احساس کیوں نہیں ہوتا کہ ہم نے اپنی آبادی کے آدھے حصے کو عضو معطل بنا کر رکھ دیا ہے۔ خود مصیبتیں بھرتے ہیں۔ مرتے کھپتے ہیں لیکن عورتوں کو صنعتی تعلیم نہیں دیتے۔ اور یہ عورتیں اور مرد مختلف وجوہ سے بے کاری اور بے روزگاری ——— لڑائی اور نا اتفاقی ——— حد سے زیادہ کام اور خاندان بھر کی ذمہ داریں ——— غرض اسی قسم کی الجھنوں کی وجہ سے مختلف قسم کی بیماریوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں جن میں سے اکثر دق کا شکار ہوتے ہیں۔"

میں نے پوچھا: "یہاں کتنے مریض تندرست ہو جاتے ہونگے ؟"

ساوتری غصہ سے بولی: "خاک بھی نہیں ہوتے۔ اول تو ایسے مریضوں کی دیکھ بھال جس دلسوزی اور لگن سے ہونی چاہیئے ویسی نہیں ہوتی۔ دوسرے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ دق کے مریض کیلئے فکر اور پریشانی زہر سے زیادہ مہلک ہے۔ بھلا جس مریض کو یہ فکر ہو کہ میں یہاں اسپتال میں ہوں اور گھر والے فاقے کر رہے ہیں یا قرض کے بوجھ میں ڈوبے جا رہے ہیں۔ یا جس عورت کو میاں کے [illegible] ——— جیسے ساس نند [illegible] کہ ہم کے اس بیماری میں بھی چین لینے دیتے ہیں وہ بھلا کیسے [illegible] ہوں ؟"

بڑی دیر تک ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم رہے۔ یکایک ساوتری بولی: "میں تمہیں مثال کے طور پر محسن صاحب کا قصہ سناتی ہوں۔ وہ جو تین عورتیں صبح تم نے میرے ہاں دیکھی تھیں۔ انکے عزیز کا ———"

میں نے اشتیاق سے کہا: "ہاں ہاں ضرور سناؤ ان کا قصہ۔"

ساوتری بولی: "بہن قصہ کیا مصیبت بھری کہانی ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسی پر ایسی بپتا پڑے"۔ تھوڑی دیر چپ رہی پھر بولی: "میرے اصرار پر محسن کی بہن نے سب حالات مجھے بتلائے تھے۔ بلکہ محسن کے دو تین خط بھی مجھے دیئے تھے جن سے مجھے اُن کی حالت کا پورا اندازہ ہوا ——— محسن کی دو بہنیں ہیں۔ اور ایک بڑا بھائی۔ ماں باپ بہت کم عمری میں چل بسے تھے۔ شاید ماں کو بھی یہی موذی مرض تھا۔ بڑی بہن نے اس چھوٹے بھائی کو بڑے پیار سے پالا پوسا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ اسکے اپنے کوئی اولاد نہ تھی۔ مگر بدنصیب جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی۔ بڑا بھائی محسن سے کئی سال بڑا ہے اسکی شادی چھوٹی سی عمر میں ہوگئی تھی اور اب کئی بچے ہیں۔ چھوٹی بہن کی شادی تین چار سال ہوئے کی گئی۔ مگر اُسے ساس نندوں کے طعن تشنے اور میاں کی بے رُخی نے سال بھر کے اندر ہی اندر ختم کر دیا۔ بہانہ ہوا بچہ کی پیدائش کا ——— ماں باپ کا اور خود اپنا جو کچھ اثاثہ تھا وہ بہن نے بڑے بھائی اور چھوٹی بہن کی شادی اور محسن کی تعلیم میں سب لگا دیا تھا۔ محسن نے دسویں پاس کی تو بہن بالکل خالی ہاتھ ہو چکی تھی اور اعلیٰ تعلیم پانے کی حسرت یوں اسکے دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ بڑا بھائی لا ابالی اور بے فکر واقع ہوا ہے۔ اچھی نوکری ملتی نہیں۔ پندرہ بیس کی نوکری کرنا اُسے اچھا نہیں لگتا۔ بس سارے دن بیوی بچوں میں بیٹھا گپیں ہانکنا اسے پسند ہے۔ محسن کو دسویں کا امتحان دیتے ہی نوکری کی تلاش ہوئی۔ بڑی کوشش سے پچیس روپے کی ایک دکان پر محرری کی نوکری ملی۔ دو ایک جگہ ٹیوشن بھی کر لیا۔ اور کوئی چالیس روپے کی آمدنی ہوگئی۔ لیکن بھائی بھاوج۔ ان کے دو تین بچے بہن اور خود۔ سات آٹھ آدمیوں کا خرچ کسی طرح پوری ہی نہیں پڑتی تھی اور بدقسمتی سے محسن اپنے بھائی کے برعکس بچپن سے نہایت فرض شناس، ہمدرد اور حساس تھا۔ وہ بچپن سے کمزور تھا اور کافی غذا نہ ملنے اور پے در پے صدموں کی وجہ سے وہ کبھی عام لڑکوں کی طرح چونچال اور تندرست اور بے فکر نہیں ہوا۔ اسکو صرف ایک شوق تھا۔ اور وہ تھا اعلیٰ تعلیم کا۔ مگر بیچارے کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔ نہ وہ کھیل کود میں شریک ہوتا، نہ سیر و تفریح کرتا، نہ دوستوں میں

سلام

از
محترمہ ساجدہ
بنت
[illegible] شاہجہانپوری
منشی فاضل

(۱)

سلام
ایسی تہذیب کو
اے خواہرِ من میرا سلام

علم کے بوجھ سے چہرے تو ہیں کمھلائے ہوئے
گرگر پاؤڈر ہے لگا ہونٹوں پہ سرخی بھی لگی
ایسی تعلیم کا مقصد کوئی بتلائے مجھے!
قلبِ رنگین گناہوں کے تصور میں ہے

تربتِ صدق و صفا
مرقدِ نورِ وفا
مسکنِ حرص و ہوا
پیکرِ ہوشش رُبا

یہ ترقی کے زمانے کا تراشا ہوا دل
جس سے تہذیبِ مسلماں ہے جہاں میں بدنام
ایسی تہذیب کو اے خواہرِ من میرا سلام

(۲)

اک دریچے میں حسینہ ہے کھڑی
بیباک!
نظریں گستاخ!!
مات کھا جائے اگر دیکھے اُسے
راجہ اِندر کے اکھاڑے کی پری
راہ پر اُس کی نگاہیں ہیں لگی
بے تاب
پُر آب
اک زبوں حال جواں آکے وہیں ٹھہر گیا
جون و جولائی کی گرمی پہ تبسم کرتا
منتشر بال تخیل میں مست
نظریں دو چار ہوئیں
ہوا آہوں کا دھواں
دونوں جانب سے بیک وقت رواں
وہ بھی بے ہوش ہوا

یہ بھی بے ہوش ہوئی
یہ نمونہ ہے محل
اس سے بڑھکر ہے محبت بدنام
حُسن اور عشق ہیں بے باک اتنے
جتنی رَاشد کی ہیں نظمیں آزاد
بے حیائی نے بچھایا ہے یہ تہذیب کا دام
ایسی تہذیب کو اے خواہرِ من میرا سلام

(۳)

ایک بیگم کے یہاں
جو ہیں نجیب الطرفین
علم و تہذیبِ زمانہ سے خود ہم آغوش
فکرِ فردا نہ جہاں اور نہ ذکرِ غمِ دوش
ایک دن میں جو گئی
دیکھتی کیا ہوں
محفلِ رقص و طرب ہے برپا
اور ہے مست مئے نغمہ ہر اک ستیز بہ ادا

تا شام
خوب ہنگامہ رہا
قلب احساس سے بیگانہ رہا
تربیت خانہ سہی پاس مگر
واں تو ناپید تھا لطفِ مادر
لطف وہ جس پہ ہمیشہ رہا نازاں مشرق
بچے آغوشِ محبت کو ترستے ہیں مدام
بوسہ ہائے لبِ مادر ہیں مثالِ دشنام
الغرض وہ تو سنیما کے لئے ہوگئیں سوار
عبرتِ دل نے کہا مجھ سے کہ تو گھر کو سدھار
گر یہی ختم یہی مینا ہے یہی ساقی و جام
ایسی تہذیب کو اے خواہرِ من میرا سلام

سلام
ایسی تہذیب کو
اے خواہرِ من میرا سلام

دیووں کے ملک میں

از جناب اشرف صبوحی دہلوی

(۵) پانچویں قسط

اب اور سنو ۔ زمیندار کے پاس ٹیپس میں گلیور کا چرچا شروع ہوگیا۔ اور لوگ آپس میں کہنے لگے کہ "زمیندار نے اپنے کھیتوں میں سے کوئی چھوٹا سا جانور پکڑا ہے ۔ جو مرگ چوہے سے بڑا نہیں لیکن صورت شکل میں بڑا انوکھا ہے ۔ اسکی حرکتیں بھی تماشہ ہیں۔ کہاں سے آیا اور خدا جانے کیا ہے۔"

ایک زمیندار جو برابر میں رہتا تھا اور گلیور کے آقا سے جسکی بڑی دوستی تھی۔ ایک دن اپنے دوست سے ملنے آیا۔ کہ چلکر معلوم تو کرے کہ لوگوں کا کہنا سچ ہے یا جھوٹ۔ چنانچہ اس کے سامنے اس ننھے آدمی کی نمائش کی گئی۔ اسکو میز پر کھڑا کیا گیا۔ جہاں وہ چلا پھرا۔ اپنی تلوار نکالی۔ اس کے ہاتھ دکھائے۔ پھر اسے میان میں رکھ لیا۔ مہمان کو جھک کر سلام کیا۔ اس کا مزاج پوچھا۔ خوش آمدید کہا۔ اور وہ سارے کام کئے جو اسکی آقازادی دیونی لڑکی کہتی گئی۔

زمیندار کا آنے والا دوست بہت بوڑھا اور بڑھاپے کے سبب کم سوجھتا تھا۔ اپنی عینک لگاکر بڑے غور سے گلیور کو دیکھنے لگا۔ اسکے اس طرح آنکھیں سکوڑ کر دیکھنے پر ننھا آدمی بڑے زور سے کھلکھلا کر ہنسا۔ اُسے بوڑھے زمیندار کے دیدے ایسے معلوم ہوئے جیسے دو چودھویں رات کے چاند کھڑکیوں میں سے جھانک رہے ہوں۔ گلیور کو بے تحاشا ہنستے ہوئے دیکھکر اور یہ معلوم کرکے کہ کس بات نے اُسے ہنسایا ہے دوسرے بھی ہنسنے لگے ۔

بوڑھے زمیندار نے جو اپنے اوپر لوگوں کو ہنستے دیکھا تو بہت خفا ہوا۔ کہنے لگا "تم نے مجھے مسخرا بنایا ہے ۔ مجھ میں کیا نظر آیا کہ اس طرح ہنسنے لگے" بڑی مشکل سے اُسکو ٹھنڈا کیا ۔

بوڑھے زمیندار کو روپیہ کی بڑی آپڑی تھی ۔ دولت کمانے میں وہ ہر برائی بھلائی کو نظر انداز کردیا کرتا تھا ۔ دوسروں کو بھی یہی صلاحیں دیا کرتا کہ جس صورت سے ممکن ہو پیسہ پیدا کرنا چاہیئے ۔ چنانچہ اس نے گلیور کے آقا اپنے دوست کو مشورہ دیا کہ "اگر تم برابر والے قصبے میں جہاں جمعہ کا بازار لگا کرتا ہے اسکو لے جاؤ اور ٹکٹ لگاکر لوگوں کو اس کا تماشہ دکھاؤ تو خاصا کمالوگے۔ ایسے موقعہ کو

[illegible]

ے گنن لیا تھا کہ [illegible] اسے [illegible] لے جائیں گے۔ [illegible] اسکی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے ۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی گنوار کا لٹھ اس ننھے گڈے کو دیکھتے دیکھتے پکڑ کر مار نہ ڈالے کیونکہ ایسے بازاروں میں عام طور پر جاہل سے جاہل گنوار زیادہ آیا کرتے ہیں۔

لڑکی جب تک یہ کہتی رہی برابر اسکی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ گلیور نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی اور کہا تم غم کیوں کرتی ہو۔ میری حفاظت کیلئے تمہاری محبت کافی ہے۔ تم میرے ساتھ ہو اور میری رکھوالی کا جذبہ تمہارے دل میں ہے تو مجھے کسی بات کا ڈر نہیں۔ جہاں چاہیں مجھے لے جائیں۔ اور جو چاہیں میرے ساتھ کریں۔ تم سلامت رہو مجھ کو کیا اندیشہ۔" یہ سنکر لڑکی نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ مطمئن ہوگئی۔

جو کچھ ہونا تھا وہ پیش آیا۔ آتے بازار کے دن گلیور کا آقا زمیندار اُسے ایک بکس میں بند کرکے قریب کے قصبہ میں لے گیا۔ لڑکی بھی اپنے وعدے کے مطابق ساتھ چلی۔ باپ کی پیٹھ کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ گئی۔ بکس میں گلیور کے آنے جانے کے لئے چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اور ہوا کی آمدورفت کیلئے کئی سوراخ۔ اس کے اندر لڑکی نے اپنی گڑیا کے پلنگ کی توشک بچھا دی تھی تاکہ گلیور کو جھٹکے سے چوٹ نہ لگے۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود بھی ننھا آدمی بیسیوں جگہ سے زخمی ہوگیا۔ جا بجا تیں چوٹ لگے جھٹکے کھاتے کھاتے بُری نوبت آگئی۔ گھوڑا جو نیہ چلتا تو اسے یہ معلوم ہوتا کہ جہاز کسی بڑے طوفان میں ہچکولے کھا رہا ہے ۔

خدا خدا کرکے سفر طے ہوا ۔ اور وہ ایک سرائے میں جاکر اُترے۔ زمیندار پہلے تو تھوڑی دیر سرائے والے سے باتیں کرتا رہا پھر اس نے ایک آدمی آبادی میں [illegible] گلی گلی کوچہ کوچہ بازار بازار جاکر پکار آئے اعلان کردے کہ "جیل کی سرائے میں ایک نیا تماشہ آیا ہوا ہے دیکھنے کے قابل ہے جسے دیکھنے کا شوق ہو وہ جیب میں ٹکے لیکر آئے جنت کا تماشہ نہیں ۔ خدا کی ایک نرالی مخلوق ہے۔ ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک کان سارے اعضا آدمیوں کے سے ہیں۔ بولی بھی آدمیوں کی سی بولتا ہے ۔ اور بیسیوں عجیب عجیب دلچسپ تماشے دکھاتا ہے ۔ مگر آدمی نہیں۔ ہے کہیں کا کوئی جانور ۔ آؤ دیکھو ورنہ پچھتاؤگے۔"

(باقی آئندہ)

فلم میں موسیقی

از رام چندر پال صاحب

"عظیم الشان گاتا ہوا فلم" "ایک درجن سے بے نظیر گانے"۔ "اس فلم میں گانے اپنا جواب نہیں رکھتے"۔ اسی قسم کے لاتعداد پُر جوش اور مبالغہ آمیز اشتہار آپ کو آئے دن نظر آتے ہیں۔ آپ حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ تماشے میں آخر کیا ہے۔ یہ کوئی کانسرٹ ہے۔ آپیرا ہے۔ یا آرکیسٹرا؟ مگر بعد کو پتہ چلتا ہے کہ معمولی فلم ہے۔ اس میں حسب معمول کچھ گانوں کا اہتمام کیا گیا ہے اور وہی افسانہ کا پس منظر۔ جتنا زیادہ اشتہارات میں گانوں پر زور دیا جاتا ہے اسی قدر فلم کی خوبی مشتبہ ہوتی ہے۔ آپ کی توجہ کہانی یا فلم کی دوسری خصوصیتوں کی بجائے گانوں کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ ایسے گانے جو اکثر قطعی طور پر ٹھونسے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کی عدم موجودگی سے فلم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

میرا اپنا تجربہ بتاتا ہے کہ فلموں میں گانوں کی تعداد اور ان کی قدر و قیمت توازن کی حدود سے بڑھ گئی ہے۔ اور خواہ مخواہ ان گانوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جانے لگی ہے۔ ہر چند کہ میں خود میوزک ڈائرکٹر ہوں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ فلموں میں گانوں کی اہمیت اور قدر خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ جو یقیناً نامناسب ہے۔

سب سے پہلے سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلم میں گانے قطعی طور پر ضروری ہیں۔ ہم ایسے بے شمار امریکن فلم دیکھتے ہیں جن میں گانے نہیں ہوتے اور پھر بھی ہم ایسی فلم سے مطمئن ہوتے ہیں۔ یقیناً ہندوستانی فلم بھی بغیر گانوں کے اچھے خاصے ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان کا اچھے اور کامیاب فلموں میں شمار ہو سکتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ کسی فلم کمپنی کو اس "تجربہ" کی ہمت نہیں ہوئی۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر ایک فلم اپنی دوسری خصوصیتوں کی بنا پر مکمل ہو تو محض گانوں کی عدم موجودگی سے ناکامیاب ثابت ہو۔ بات یہ ہے کہ روایت کے طور پر موسیقی ہندوستانی فلم کا ایک اہم جزو ہو کر رہ گئی ہے۔ ہندوستان میں تفریح کے لئے موسیقی کی جستجو ہوتی ہے۔ اور یقیناً یہ فن ایک ہمہ گیر اثر رکھتا ہے۔ اس ملک میں جہاں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد کم ہے۔ جہاں ذہنی تربیت کی کمی ہے کوئی بلند پایہ علمی چیز مقبول عام نہیں ہوتی۔ یہاں ذہن اور دماغ کو متاثر کرنا زیادہ مد نظر نہیں ہوتا۔ یہاں تو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کوئی چیز کس حد تک جذباتی تسکین کا سامان رکھتی ہے۔ اور اس باب میں موسیقی جادو کا اثر رکھتی ہے۔ لہذا ہندوستان میں فلموں میں گانے اس وقت تک ضروری رہیں گے جب تک یہاں کی عام ذہنی سطح دوسری تعلیم یافتہ قوموں کے برابر نہیں آجاتی۔ لیکن در اصل ہونا یہ چاہئیے کہ جو گانے ہم فلم میں شامل کریں وہ موزوں جگہ پر ہوں اور صحیح تناسب سے ہوں۔ یہاں کوئی فلم جو قطعی طور پر گانے سے بے نیاز ہو۔ شاید کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ خواہ وہ جملہ حیثیتوں سے کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو۔ دیکھنے والے ایک کمی سی محسوس کرینگے۔ ایک ایسے فلم میں جس میں دلیرانہ کارنامہ، لڑائی وغیرہ دکھائی گئی ہو یا کسی ایسے فلم میں جس میں کہانی کسی سائنٹفک موضوع سے متعلق ہو۔ موسیقی کی نہ تو بظاہر کوئی ضرورت ہے اور نہ اسکے لئے کوئی جگہ۔ پھر بھی فلم میں ایک تھکا دینے والی یکرنگی اور یکسانیت پیدا ہو جائیگی۔ جسکے دور کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ کچھ نہ کچھ ساز موسیقی کا اہتمام رہے۔ ایسے فلموں میں دلچسپی صرف اسی صورت سے برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ ایسی صورت میں موسیقی کہانی کے بے کیف و بے رنگ مقامات پر ایک دلکشی اور جاذبیت پیدا کر دیتی اور انکی اہمیت بھی بڑھا دیتی ہے

بہرحال جہاں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ بے محل اور برے گانوں کو داخل کیا جائے۔ یا پھر فلم میں گانوں کا دخل ہی نہ ہو تو میں یہ کہیں بہتر سمجھتا ہوں کہ فلم بغیر گانوں کے ہوں۔

کسی فلمی کہانی کے سلسلہ میں گانوں پر بحث کرتے وقت ہمکو یہ دیکھنا چاہئیے کہ خود ایک فلم کی تیاری میں کیا کیا چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ ایک کہانی سنیما کے پردوں پر چند اداکاروں کے ذریعہ دکھائی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ایک ڈائرکٹر کی باقاعدہ نگرانی میں ہوتا ہے۔ جسے ایک کیمرہ مین پردہ فلم پر لے آتا ہے۔ گانے صرف کیفیتیں بدلنے۔ کہانی میں خلا پُر کرنے۔ بعض حالات کے اظہار، کہانی کو آگے بڑھانے اور ساری کہانی میں مجموعی حیثیت سے جان پیدا کرنے کیلئے فلم میں داخل کئے جاتے ہیں۔ ایک فلم میں گویا بہت سے فنون کا مناسب امتزاج اور اداکاروں اور آرٹسٹوں کا اتحاد شامل کار ہوتا ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ صرف کہانی یا ڈائرکٹر کی ہوشیاری یا اداکاروں کی اداکاری یا صرف گانوں ہی سے ایک فلم چمک اٹھتا ہے۔ ان تمام عناصر کے باقاعدہ اور مناسب استعمال۔ اور ان سب کے صحیح اتحاد سے ایک کامیاب فلم تیار ہوتا ہے۔

لہذا معلوم ہوا کہ موسیقی کسی فلم کا صرف ایک جزو ہوتی ہے۔ اب

[illegible]

(Phantasia) [illegible] کہانی [illegible] ہو جائیگا۔ اور چونکہ خود "فنٹیسیا" اپنی نوعیت کا ایک ہی فلم ہے۔ اور اس تجربہ کو دہرانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ لہذا یہ خیال تو قطعاً ترک کر دینا ہوگا کہ صرف گانوں ہی پر کسی فلم کی بنیاد ہو۔ اور یہ کہ گانے کبھی بھی کہانی پر سبقت لے جا سکتے ہیں۔

۶) گو گانے فلم کا بہت ہی ضروری جزو سہی۔ یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان کی کیا جگہ ہے۔ [illegible] گیت تیار کرا لینا اور پھر انہیں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد فلم میں ٹھونستے رہنا ان دنوں بہت عام ہے۔ یہ دراصل ایک مشین کا سا کام ہے۔ اس میں تخیل اور جدت کو دخل نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں موسیقی ایک تجارتی شے ہو جاتی ہے جسکی مقدار کو اسی پیمانہ میں ناپا جاتا ہے۔ فلم بنانے والا کچھ کامیاب گانے بطور نمونہ کے پیش کر دیتا ہے اور میوزک ڈائرکٹر سے توقع کرتا ہے کہ انکی نقلیں یا اس سے ملتے جلتے گانے تیار کر دے۔ اس قسم کی تقلید عموماً ناکامیاب ثابت ہوتی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ گانوں کی جو دھنیں رکھی جائیں وہ کہانی کی اصل روح سے مناسبت اور ہم آہنگی رکھتی ہوں۔ اگر گانوں کو کسی فلم کا ایک اہم جزو بنانا ہے تو کہانی کو پہلے مد نظر رکھنا ہوگا اور گانوں کی دھنیں کہانی کے تقاضوں کا خیال کر کے اختیار کرنا ہونگی۔ کہانی اور گانوں کے درمیان ایک سمجھوتہ اور ایک قسم کی مفاہمت ضروری ہے۔ گانوں کو کہانی کے ارتقا میں مدد دینی چاہیئے۔ اور کہانی کے واقعات و حوادث میں ان کے ساتھ ان کا مضبوط رشتہ ہونا چاہیئے۔ اسکی آزمائش یوں کر سکتے ہیں کہ دیکھا جائے کہ اگر گانے فلم سے اڑا دیئے جائیں تو کہانی بے جان تو نہیں ہو جاتی۔ اگر گانے اڑا دینے سے کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تو گویا وہ غیر ضروری ہیں اور اگر وہ ایسا اہم جزو ہیں کہ نہیں نظر انداز کئے جا سکتے تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ ان کا فلم سے گہرا اور مضبوط تعلق ہے۔

گانوں کا فلم میں کیا مقصد ہے؟ یہ کہانی کی کڑیوں کو جوڑتے ہیں ان میں ایک ربط و آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ کہانی کے آنے والے حصوں سے آپ کو روشناس کراتے ہیں۔ ان مقامات پر جہاں آپ کے دل کو دھچکا لگتا ہے وہ تسکین دیتے ہیں۔ کہانی کے سست مقامات میں ایک رنگ بھرتے ہیں اور فلم کی بعض خامیوں کو چھپا لیتے ہیں۔ (کہانی خود ایک آہنگ رکھتی ہے اور موسیقی کو اس کا ساتھ دینا چاہیئے) وہی گانے کامیاب کہلائے جا سکتے ہیں جو آپ کو اس

[illegible] کامیاب گانے [illegible] ہیں۔ کہانی کے [illegible] کا اظہار کرتے ہیں۔ [illegible] سے ہم آہنگ ہیں۔

اگر گانے کہانی کے تقاضوں سے اختلاف رکھتے ہیں تو وہ گانے کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں نہایت ناکامیاب ثابت ہونگے۔ خواہ وہ موسیقی کے اعلیٰ معیار پر پورے اترتے ہوں۔ ہم "گاتا ہوا فلم" [illegible] ہیں تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس فلم میں ایک مقررہ حد تک گانے بھی شامل ہیں۔ ان کو سراسر "گاتا ہوا" کہنا غلط ہوگا۔ ایک "گاتے ہوئے فلم" کے لئے ضروری ہے کہ اس کا موضوع بھی نغمہ ہو ---- اور اس میں [illegible] گانے کے ساتھ ساتھ ہوتا ہو۔ پیش آنے والے واقعات میں گانوں کو دخل ہو۔ اور تمام دوسرے عناصر گانوں کے ضمن میں ہوں۔ ایسی کہانی گانوں کو مد نظر رکھکر لکھی جائیگی اور اس میں اداکاروں کا انتخاب میوزک ڈائرکٹر کریگا۔ ایسی صورت میں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس قسم کا فلم ہر کس و ناکس کیلئے اتنی دلچسپی نہیں رکھتا جتنی گانوں کے شائقین کے لئے۔ اب یہ خود موسیقی کا اعجاز ہے کہ جو فلم صرف گانوں کے شائقین کو محظوظ کر سکتا ہے وہ دوسروں کی بھی تفریح کا باعث ہو سکتا ہے۔

بعض وقت لوگ کہتے ہیں کہ فلاں فلم محض گانوں کی وجہ سے ایک کامیاب اور مکمل فلم ہے۔ اور یہ کہ اسکی کامیابی گانوں کا معجزہ ہے۔ ایسی "کامیابی" گانوں کی کامیابی نہیں ہے بلکہ سب سے پہلے فلم کی کامیابی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اگر گانے کہانی سے مطابقت اور آہنگ رکھتے ہیں تو دونوں چیزیں کامیاب ہیں۔ ہم کو ایسی مثال نہیں ملیگی کہ ایک فلم میں گانے کامیاب ہوں اور فلم ناکامیاب رہا۔ کہانی اور گانے دونوں کا انجام ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ ناکامیاب ہونگے تو دونوں ہونگے۔ گانوں کی کامیابی فلم کے دوسرے عناصر کی کامیابی کے ساتھ ساتھ ہوگی اور اسی طرح کسی مخصوص میوزک ڈائرکٹر کے سر کامیابی کا سہرا نہیں باندھا جا سکتا۔ وہ دراصل الگ اور انفرادی طور پر کامیاب نہیں کہا جا سکتا ---- اسکی کامیابی تو سارے فلم کی کامیابی کے ساتھ وابستہ ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائیگی۔

کنگن ۔ بندھن ۔ [illegible] اور نیا سنسار میں سے پہلے [illegible]

[illegible]
[illegible] ان سے بڑے نہیں ہے۔ لیکن انہیں
[illegible] نہیں چھوڑا۔ پنچ تک نے ڈائرکٹر ہیں جو گانے کے
بہت کامیاب رہے۔ لیکن سینا گھر میں کسی نے اہمیت نہیں دی۔ غلام حیدر
نے "خزانچی" اور "خاندان" کو جو گانے دیئے ان کی بنا پر پنجاب کے اخباروں
میں دھومیں مچ گئیں کہ غلام حیدر کے سامنے تمام میوزک ڈائرکٹر پھیکے پڑ گئے۔
لیکن "زمیندار" کے گانوں نے انہیں پھر گوشہ گمنامی میں ڈال دیا۔

انیل بسواس نے اپنے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ "عورت"
میں [illegible] دھومیں دھ رہیں۔ "روٹی" میں وہ پیچھے رہ گئے "قسمت" [illegible]
[illegible] دی گئی۔ "اپنا پرایا" میں لوگوں نے نظر انداز کیا۔ تازہ مثال

[illegible]
لہٰذا یہ اصل میں گانے [illegible] کامیابی نہیں ہوتی
خود فلم مجموعہ [illegible]

جو لوگ فلموں میں گانوں کو الگ کر کے دیکھتے ہیں [illegible]
میں کیوں کہ گانوں کو فلم کے سارے ڈھانچے سے الگ کر کے نہیں پرکھا
جاسکتا۔ گانے "عظیم الشان" اسی وقت ہوتے ہیں جب کہانی
"عظیم الشان" ہو۔ جو فلم بنانے والے کامیاب گانوں کے چکر میں
رہتے ہیں ان کو چاہیے کہ ان کی بنیاد پر نظر رکھیں۔ فلم کی کامیابی کا
انحصار اچھی کہانی پر ہوگا۔ چاہے آپ اسے گانوں کی کامیابی کہیں
یا کچھ اور۔

غزل

مری بیچارگی پر اسکو رحم آیا نہ پیار آیا — جو آیا تو جھکی پلکوں سے تکنا بار بار آیا

دلِ آشفتہ سر کی جان پر دہرے ستم ٹوٹے — ہنوز اک بیقراری تھی کہ وقتِ انتظار آیا

مرے بے چین کر دینے کو یہ پیغام کافی ہے — کلی چٹکی، شگوفہ کھل گیا، دورِ بہار آیا

ارے، اک عارضِ شب تاب پر بکھرے ہوئے گیسو — یہ گلشن پر کہاں سے جھوم کر ابرِ بہار آیا

مرے دل کی اذیت کر گئی کیا کارسفا کی؟ — یہ کیسا اشک اس رخسار پہ بے اختیار آیا

تحیر زا ہے اک بیگانۂ الفت کا جل مرنا — بڑی مشکل سے دل آیا مگر پروانہ وار آیا

حیا سے انکی اطہر، شوخیاں کس طرح دب سکتیں — انہیں بیشک حجاب آیا مگر مستانہ وار آیا

فقط اس انجمن کی اس قدر روداد ہے حرماںؔ
گیا تھا ایک دن دیوانہ وش بیگانہ وار آیا

جناب حرماںؔ خیرآبادی

A. I. R

جینت دیسائی کی عظیم تصویر

بھگت راج

جینت دیسائی شاید ہندوستان میں پہلے ڈائرکٹر ہیں جنکی ہر ایک تصویر باکس آفس کی کامیاب تصویر ہے۔ [illegible] سنت تلسی داس،
"شادی" "[illegible]" "تا[illegible]" [illegible] تاریخ کی یادگاریں ہیں۔

اب جینت دیسائی نے اپنی فلم کمپنی قائم کرلی ہے جس کا نام جینت دیسائی پروڈکشنز ہے۔ اور ان کی پہلی تصویر جو اسکرین کیلئے تیار ہے بھگت راج ہے۔ یہ تصویر موتی ٹاکیز میں بہت جلد پیش کی جائے گی۔

"بھگت راج" ایودھیا کے بھگت مہاراجہ امبریش کی زندگی کی تصویر ہے۔ اور ہندوستان کی پرانی تاریخ کا ایک سنہری ورق ہے۔ ایودھیا کے دارالسلطنت میں جہاں بھگوان رام۔ ہریش چندر اور مہاراجہ دسرتھ جیسے پرتاپی راجہ پیدا ہوئے ہیں، امبریش جیسے بھگت بھی پیدا ہوئے تھے۔ ان کی زندگی سے ہمارے لئے بھگتی۔ پوتر زندگی اور [illegible] کے سبق ملتے ہیں۔

وشنو پنت پاگنیس۔ واسنتی۔ کوشلیا۔ مبارک اور دیکشت

اس عالیشان بھگتی رس سے بھرپور تصویر کے

اداکاران ہیں

جاری کردہ: واڈیا ہیرا ماؤنٹ پکچرز۔ دہلی

نئی زندگی

جس میں

کی شخصیت آپ

اشارہ

ایک انوکھی کہانی

پرتھوی راج۔ جگدیش۔ سورن لتا۔

وکیل صاحب

کی بہترین پرمذاق سنسنی خیز

کامیڈی

مس مادھوری۔ ترلوک کپور۔ شہزادی

غلام رسول وغیرہ

نیشنل وار فرنٹ

یعنی

قومی محاذ جنگ کیا چیز ہے؟

نیشنل وار فرنٹ یعنی قومی محاذ جنگ کا مقصد پبلک کی اندرونی اصلاح اور امن عامہ کو بحال رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد تمام عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے ہیں۔

اس کے مقاصد یہ ہیں۔

(۱) امن عامہ کو قائم رکھنے کے لیے عوام الناس کا تعاون حاصل کرنا اور بد امنی پھیلانے کے ذریعوں کو دور کرنا ہے۔

(۲) ہندوستان کی جملہ اقوام میں اتحاد باہمی قائم کرنا اور اس کے لئے کوشش کرنا۔

(۳) بدمعاشوں اور غنڈوں کی دیکھ بھال اور ان کا انسداد کرنے کے لیے حکام کی امداد کرنا۔

(۴) غلط خبروں اور جھوٹی افواہوں کی تردید کرنا اور ان کو پھیلنے سے روکنا۔

(۵) پانچویں کالم یعنی دشمنوں کے جاسوس اور دشمنوں سے ہمدردی رکھنے والوں کا پتہ لگانا اور ان کی نگرانی کرنا تاکہ وہ اپنی کارروائیوں کو عمل میں نہ لا سکیں۔

(۶) کھانے پینے کی اور ضرورت زندگی کی چیزوں کی مقررہ قیمت پر فروخت کرانے کا انتظام کرنا اور ناجائز منافع بازی کو روکنا۔

(۷) زائد غلہ پیدا کرنے کی ہدایت کرنا اور اس کے متعلق پروپیگنڈا کرنا۔

(۸) شہری بچاؤ اور ہوائی حملے سے بچنے کی تعلیم حاصل کرنے کی جانب عوام الناس کی توجہ دلانا اور اس کے فوائد عوام کے ذہن نشین کرانا۔

(۹) شکست خوردہ ذہنیت کی ہر ممکن طریقے سے اصلاح کرنا۔

نیشنل وار فرنٹ کے اغراض و مقاصد اور اس کا طریق کار کسی سیاسی جماعت کے خلاف نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ عوام الناس کو نیشنل وار فرنٹ کی خدمات سے فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔ اور تعاون کر کے عوام الناس کی فلاح و بہبود میں حصہ لینا چاہیے۔

پراونشل نیشنل وار فرنٹ ۲۵ الجور روڈ دہلی

اور اشوک کمار فلم ''نجمہ'' میں

Printed at Dayals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi

M. A. and M. L. Wahidi & Published from the office of

Chandni Mahal Delhi.